مضامین محمد علیؒ

مضامین محمد علیؒ

حصہ دوم

مرتبہ

محمد سرور، استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

مکتبہ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور - لکھنؤ - بمبئی

طبع اول ۲۰۰۰ قیمت [illegible]

سنہ ۱۹۴۰ء

جیّد برقی پریس، دہلی

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

صفحہ	مضمون
	(۱۱) زعمائے مصر کا تعارف
۴۷۹	۱- تعارف

دیباچہ

۱۸۵۷ء کے خونیں حادثے کے بعد جب سرسید کے ہاتھوں ہماری قومی زندگی کا شیرازہ نئے سرے سے مرتب ہوا تو مصلحت وقت یہ تھی کہ مسلمانوں کی تھکی ہاری قوم سیاست کے ہنگاموں سے کلی طور پر اجتناب کرے اور اپنی ساری توجہ صرف تعلیم کے لئے وقف کر دے۔ اس دور میں مسلمان کسی قسم کی سیاسی سرگرمی کو جائز نہ سمجھتے تھے اور اسی بنا پر وہ نہ صرف کانگریس سے الگ رہے بلکہ نہایت شد و مد سے اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ سنہ ۱۹۰۶ء تک مسلمان اسی ڈھرے پر چلتے رہے۔ آخر زمانے کا رنگ بدلا اور مسلمانوں نے اپنی سیاسی تنظیم کی ضرورت کو محسوس کیا چنانچہ مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔

ہماری قومی زندگی کا دوسرا دور مسلم لیگ کے قیام سے شروع ہوا۔ لیگ کے بانی بیشتر پرانے مسلک کے بزرگ تھے۔ وہ نئے حالات سے مجبور ہو کر سیاست کے میدان میں اتر تو آئے تھے لیکن حکومتِ وقت کے خلاف جانا ان کے لئے مشکل تھا۔ لیکن انگریزی پڑھی ہوئی نئی پود جو اب پرانے بوڑھوں کے دوش بدوش چلنے لگی تھی وہ اس مسلک سے برملا بیزاری کا اظہار کرتی تھی۔ بوڑھے سیاست داں نوجوانوں کی اس انتہا پسندی کو مضر سمجھتے اور اس کی روک تھام میں بڑے مستعد تھے۔ سنہ ۱۹۱۱ء تک مسلم لیگ ان دو رجحانات کی کشمکش کی رزم گاہ بنی رہی۔ آخر حکومت وقت کے ساتھ

خوش اعتقادی کا طلسم ٹوٹا اور تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کے فیصلے نے مسلمانوں کی اعتدال پسند سیاست کو قطعی طور پر غلط ثابت کر دیا۔ اب سیاسی قیادت کی علم برداری نوجوانوں کے ہاتھ میں آئی۔

تقسیم بنگالہ کے خلاف ہندوؤں نے جو قدم اٹھایا تھا وہ اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ انگریزوں کو مجبوراً ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ اس کامیابی سے ہندوؤں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے اور کانگریس تحریک کو بھی بڑی تقویت ملی۔ ادھر مسلمانوں کو حکومت سے ان کی وفاداری کا صلہ خوب مل چکا تھا اور پھر طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے ان کو انگریزوں سے اور بھی بدظن کر دیا تھا۔ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں کے اعتدال پسند رہنما جمہور کی نظروں سے بالکل گر گئے اور لیگ بتدریج مسلک وفاداری سے ہٹنے لگی، ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا خیال عام ہونے لگا اور کانگریس سے مسلمانوں کو پہلے کی طرح بغض نہ رہا۔ اس طرح آہستہ آہستہ مسلمانوں کی سیاست انگریز کی پرستاری کے حلقے سے نکل کر ہندوؤں کے ساتھ تعاونِ عمل کرنے کے راستے پر گامزن ہوئی۔ یہ ہماری قومی زندگی کا تیسرا دور ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء تک گو مسلمان بحیثیت قوم کے کانگریس میں شریک نہیں ہوئے لیکن مسلم لیگ اور کانگریس میں بہت حد تک ملاپ ہو چکا تھا اور اکثر دونوں کے سالانہ اجتماع بھی ایک ہی مقام پر ہوا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں "لکھنؤ پیکٹ" کے نام سے ہندو مسلمانوں میں سمجھوتہ بھی ہو گیا اور اب مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی نزاعی مسئلہ باقی نہ رہا۔

سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک جنگ عظیم کا سلسلہ جاری رہا۔ جنگ ختم ہوئی تو ہندوستان میں ایک نئے انقلاب کا آغاز ہوا۔ جنگ کے دوران میں ہندوستان نے برطانیہ کی ہر طرح سے مدد کی تھی اور گو مسلمان اس وجہ سے کہ برطانیہ ترکوں

کے خلاف ترکی بھی خفا ضرور تھے لیکن وہ بھی جنگ کے زمانے میں خاموش ہی رہے لیکن فتح و کامرانی کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں کی اعانت کا بدلہ یوں دیا کہ ترکوں کی سلطنت کے حصے بخرے کرکے اپنے اور اپنے حلیفوں کے درمیان بانٹ لئے اور ہندوستان میں رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا۔ اس پر احتجاج ہوا تو پنجاب میں انسانیت سوز مظالم کئے گئے۔ ان واقعات کے بعد یہ فطری تقاضہ تھا کہ ہندو مسلمان دونوں یک دل اور یک جان ہو کر حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں لیگ اور کانگریس دونوں کے سالانہ اجتماع ہوئے۔ اس کے فوراً بعد خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں شروع ہوئیں اس ہنگامے میں دو تین برس تک وہ جوش و خروش رہا کہ ہندو مسلمان کی تمیز اٹھ گئی مسلمان ہزاروں کی تعداد میں کانگریس میں شریک ہوئے اور ہندوؤں نے خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ کانگریس ہندو مسلمان دونوں ملت کا سیاسی سنگم قرار پایا اور مسلمانوں کی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم کی اہمیت برائے نام رہ گئی۔ ہندو مسلمانوں کے سیاسی مفاد مختلف نہ رہے تھے، سب وطن کی آزادی اور انگریز کی مخالفت میں متفق تھے۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ انقلاب کا رد عمل شروع ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں شدھی سنگھٹن کے چرچے ہونے لگے اور پھر ہندو مسلمان آپس میں کٹنے مرنے لگے۔ صلح و آشتی کی کوششیں بہت ہوئیں لیکن سب رائگاں گئیں۔ آپس کی اس لڑائی سے انگریز کی بن آئی اور اس کو اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل ہو گیا اور ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر پہلے کی طرح اس کی خوشامدیں کرنے لگے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کی جنگ آزادی کا یہ انجام بے حد ہمت شکن اور افسوس ناک تھا اور بڑے بڑے

رہنما اپنی قیادت کے بچاؤ کے لیے یا تو خاموش ہو گئے یا عوام کے ساتھ مل کر
ان کی سی کہنے لگے۔ بہرحال ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۹ء تک تو یہ امید بندھی رہی کہ
شاید ہندو مسلمانوں کا کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور پھر یہ دونوں قومیں ایک ہو کر
وطن کو آزاد کرانے میں ایک دوسرے کے دست و بازو بن سکیں لیکن پہلے
کی طرح یہ مساعی بھی بارآور نہ ہوئیں اور اب دس برس ہونے کو آئے ہیں مگر
ان دونوں کے اختلافات بڑھتے ہی جا رہے ہیں اور بظاہر اتحاد و اتفاق کی
کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مسلمان ہندو کو دشمن سمجھتا ہے اور ہندو مسلمان
سے بدظن ہے۔

ہماری قومی زندگی کا یہ چوتھا دور ہے۔ اس کے آثار تو ۱۹۲۳ء سے
نظر آنے لگے تھے لیکن اس کے اقبال کا آفتاب ۱۹۳۰ء میں طلوع ہوا اور اب
یہ ترقی کرتے کرتے عین نصف النہار پر ہے اور معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوتا
ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی جو بری حالت ہے شاید اس سے پہلے کبھی
بھی نہ ہوئی ہو۔ پہلے ہماری قوم میں اتنا افتراق نہ تھا اور نہ دماغوں میں اتنا
انتشار تھا۔ خواہ کچھ بھی ہو اس وقت ہم گر کر سنبھلنے کی کوشش میں تھے لیکن
اب تو آگے بڑھ کر سراسیمگی میں پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ بیس برس تک جس
مقصد کے لیے لڑتے رہے آج اسی مقصد کے خلاف مصروف جہاد ہیں
یہ رد عمل سخت خطرناک ہے اور مسلمان کے قدم کہیں جمتے نظر نہیں آتے
کوئی کسی کی نہیں سنتا اور ہر شخص اپنی کہے جاتا ہے۔ نئی انجمنیں بن رہی
ہیں اور بھانت بھانت کے لیڈر جمہور کو راہ نجات دکھانے کی فکر میں ہیں
کسی کو یہ احساس نہیں کہ معاملہ ایک دو شخصیتوں کا نہیں پوری قوم کا ہے
ضرورت ہے کہ ہم موجودہ کشمکش کے اسباب اور اس کے حالات کو سمجھیں

اپنی پچھلی فروگزاشتوں کا جائزہ لیں اور پھر سوچ سمجھ کر آئندہ کی راہ کو متعین کرنے کا حوصلہ کریں، ورنہ اس خلفشار میں کسی صحیح حل پر پہنچنا کسی طرح ممکن نہیں۔

یہ مضامین مسلمان کی اس تمام سیاسی کشمکش کی ایک اجمالی لیکن نہایت صحیح تاریخ ہے جس کا لکھنے والا صرف تاریخ نگار نہیں بلکہ اس عہد کا "تاریخ ساز" بھی تھا۔ وہ دور اول کے رہنماؤں کی سرپرستی میں پلا اور انہیں کے فیض صحبت سے پروان چڑھا، جوان ہوا تو اتفاق سے اپنے آپ کو ان بزرگوں کے خلاف صف آرا پایا۔ ۱۹۰۶ء میں لیگ کے بنانے میں بوڑھوں کے ساتھ یہ نوجوان بھی شریک تھا، پھر لیگ کو انگریز پرستی سے نکالنے اور کانگریس سے قریب لانے میں بہت حد تک اس کی کوششوں کو دخل تھا اور آخر میں جب مسلمان صرف اپنی ہی سیاست میں نہیں بلکہ تمام ہندوستان کی سیاست میں ہندوؤں کے ساتھ برابر کا شریک ہو کر آزادیٔ وطن کے لئے لڑا ہے تو مسلم قوم کی قیادت اسی کے ہاتھ میں آئی۔ پھر جب آزادی کی اس جنگ نے آپس کی خانہ جنگی کی شکل اختیار کی تو یہ اوروں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا بلکہ اپنی ملت سے اس کی بے راہ روی پر بھی الجھتا رہا اور ہندوؤں کی غلط کاری پر ان کی بھی سرزنش کرتا رہا۔ آخر میں ہندو مسلم سمجھوتے کی خاطر اس نے اپنی گرتی ہوئی صحت کو بھی تباہ کر لیا اور اس طرح اپنی قوم کی بے بصری اور ہندوؤں کی تنگ دلی اور کج بینی کے طفیل قبل از وقت اس دنیا سے سدھارا۔

محمد علی کی اس تاریخ نگاری پر اس کے مخالفوں کو اعتراض ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ بہت حد تک یہ اعتراضات حق بجانب بھی ہوں، کیونکہ

وہ خود شریک رزم تھا اس لئے دوسروں کے نقطۂ نظر کے سمجھنے میں اس
سے غلطی کا ہونا طبعی امر تھا لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ اس نے جو کچھ
لکھا ہے بے لاگ لکھا ہے، کوئی بات جو اسے معلوم تھی اس نے ڈھکی چھپی
نہیں رکھی۔ ان مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے اور اسی لئے ان کا
مطالعہ ان حالات میں بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

مرتب کو ان مضامین کی ترتیب میں کافی زحمت اٹھانی پڑی ہے۔
مولنا محمد علی بے تکان لکھنے والے تھے اور اکثر اصل مطلب کے ساتھ ساتھ
اور بھی بہت کچھ لکھتے چلے جاتے تھے اور اس طرح مضمون کی طوالت اتنی
بڑھ جاتی تھی کہ پڑھنے والا محض مضمون کی طوالت سے گھبرا جاتا ہے۔ مولنا
موصوف ان مضامین میں اپنی آپ بیتی لکھتے تھے اس لئے جن سے ان
کو ذرا بھی تکلیف پہنچتی، ان کا ذکر کرتے ہوئے نہایت صاف گوئی سے
کام لیا کرتے۔ مرتب نے ان مضامین کی ترتیب میں اکثر کانٹ چھانٹ
کی ہے کیونکہ اس کا مقصد محض نزاعی مسائل کو پیش کرنا ہے اور شخصیات
کی بحثیں اتنی تلخ ہیں کہ ان میں پڑ کر اصل مقصود گم ہو جاتا ہے اور لوگ
رد و قدح میں لگ جاتے ہیں۔ تمام مضامین مولنا کے اپنے قلم کے لکھے
ہوئے ہیں البتہ ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جو اصل میں تو انگریزی میں
تھا لیکن اس کا ترجمہ ہمدرد میں شائع ہوا۔ اس تمام مجموعے میں "ہمدرد"
کے اول دور کا کوئی مضمون شامل نہیں ہے۔ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء کے
"ہمدرد" کے فائل تو مل گئے تھے لیکن ان کی تمام ورق گردانی کے باوجود
کوئی ایسا مضمون نہ ملا جو مولنا محمد علی کے اپنے نام سے شائع ہوا ہو۔
کتاب میں بیشتر مضامین ہندو مسلم مسئلے پر ہیں۔ مسئلۂ حجاز اور مسئلۂ افغانستان

والے مضامین اس لئے درج کئے گئے ہیں کہ دوسرے اسلامی ممالک کے متعلق مولانا کے جو خیالات تھے قارئین کرام کو ان کا بھی اندازہ ہو جائے۔ علامہ اقبال سے مولانا کو بے حد عقیدت تھی اور اکثر یہ عقیدت وارفتگی کی حد تک پہنچ جاتی تھی لیکن اس کے باوجود ایک دفعہ موصوف کو علامہ اقبال کے ایک سیاسی خیال سے اختلاف ہوا اور موصوف نے تمام عقیدت کے ہوتے ہوئے جو بات وہ اپنے نزدیک ایسی سمجھتے تھے بے تامل کہنے میں باک نہیں فرمایا۔

مسلمان بحیثیت ایک قوم کے پہلی بار مولانا کی قیادت میں کانگریس میں شریک ہوئے تھے اور پھر مولانا ہی تھے جنھوں نے کانگریس کے ہندو رہنماؤں کے تعصب اور تنگ دلی سے تنگ آکر آخر میں اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کانگریس سے تعاون کا ہاتھ کھینچ لے اور اپنی علیحدہ تنظیم کرکے ہندو اکثریت کو مجبور کر دے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے پر مائل ہو۔ مولانا جن مقاصد کو لے کر کانگریس میں گئے تھے آخر عمر تک وہ بدستور ان مقاصد کی تائید کرتے رہے۔ انھیں شکایت یہ تھی کہ کانگریس کے ہندو لیڈر مہاسبھا کے اثر میں آکر ان مقاصد سے ہٹ گئے ہیں اور اس لئے اب کانگریس کی حکمت عملی قومی نہیں بلکہ فرقہ پرستی پر مبنی ہے۔ صرف یہ خیال تھا جس کی وجہ سے آپ کانگریس سے کنارہ کش ہو گئے۔

ان دس سالوں میں ہندوستان کی سیاست کا رنگ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ کانگریس کی مخالفت میں آج وہ جماعتیں بھی پیش پیش ہیں جو اس وقت کانگریس کی حامی تھیں اور مولانا محمد علی کو کانگریس کی مخالفت پر طعنے دیتی تھیں۔ اس وقت معاملہ صرف تصفیہ حقوق کا تھا مگر اب لڑائی کا محاذ ہی بالکل بدل گیا ہے۔ جن مطالبات کو منوانے میں مولانا مصر تھے اور اس وقت کانگریسی ہندو مہاسبھائیوں کے خوف سے ان مطالبات کو ماننے سے لرزتے تھے وہ آج کسی نہ کسی طرح سے ہندوستان

کے دستور اساسی میں شامل ہو چکے ہیں، صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ ہو گئیں، سندھ بھی علیحدہ صوبہ بن گیا، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو برائے نام ہی سہی لیکن وہی اقلیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ ڈر یہ ہے کہ اب اپنی شخصی اور خصوص جماعتی اغراض کی خاطر کانگریس کی مخالفت کرنے والی جماعتیں کہیں مولنا کے طرز عمل کو اپنے لئے اسوہ حسنہ نہ بنالیں۔ اس لئے ان حالات میں مولنا کے اصل مقاصد کی اشاعت اور کانگریس سے بیزاری کے اسباب کا بیان وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔

آج کل مسلمانوں کی سیاست کا محور بحث سمٹ کر یہ چند مسائل رہ گئے ہیں، اول ہندو اکثریت میں ہے اور مسلم اقلیت میں، اقلیت کی حفاظت کی کوئی تدبیر بھی ممکن نہیں، دوسرے ہندوستانی متحدہ قومیت کا نہ کوئی وجود ہے اور نہ اس کا کوئی امکان ہے۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلم قوم "ہندوستانی قوم" نہ ہے نہ ہوگی۔ تیسرے ہندوستان ایک سیاسی وحدت نہیں یہ محض انگریزی سیادت کا اثر ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ملک کو اسلامستان اور ہندوستان دو سیاسی وحدتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان مضامین کے پڑھنے والے کو امید ہے کہ، ان مسائل کا حل ان اوراق میں مل جائے گا۔

خدا کرے جس طرح ان مضامین کا پہلا مجموعہ قارئین نے پسند فرمایا ہے اس مجموعے کو بھی قبول عام حاصل ہو اور مولنا محمد علی کی ذات گرامی سے بے شک جمہور مسلمانوں کو بڑی شیفتگی ہے، کاش وہ اس ذات کے اصل جوہر کو بھی پہچانیں۔ شاید اس سے ہمیں اپنی موجودہ بے راہ روی میں کچھ مدد مل سکے اور ہم اپنی گم شدہ راہ کو ڈھونڈ کر پھر اس پر چلنے کی ہمت کرلیں۔

۸ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

محمد سرور،
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

ہندو مسلم مناقشات

۱۔ مصالحت کی کوششوں کی کہانی

ہمدرد یکم جولائی ۱۹۲۶ء

مجھے سخت افسوس ہے کہ جو کوششیں چند مسلمانوں نے مسلمانانِ دہلی کو اس بات پر راضی کرنے کی کیں کہ پہاڑی دھیرج کے راستے سے قربانی کی گائیں نہ نکالی جائیں، اس وقت تک ناکام رہیں۔ ان کوششوں میں کس نے کتنا حصہ لیا اس کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، مگر پہاڑی دھیرج، صدر بازار اور باڑہ ہندوراؤ کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ کوششیں اس وقت تک بھی منقطع نہیں ہوئی ہیں اور برابر جاری ہیں۔ ان کوششوں کے سلسلے میں ہم لوگوں کو جو تجربہ ہوا وہ نہایت تلخ ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں ہنود کے لئے ذرا سی بھی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ ان کا اس راستے کے متعلق جو حق اربابِ حکومت کی طرف سے تسلیم کر لیا گیا ہے اس کو استعمال نہ کرنے کے لئے وہ عموماً ہرگز آمادہ نہیں ہیں۔ جو عذرات ان کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہنود ہم کو بہ جبر روکنا چاہتے ہیں، ہمارے حق کو تسلیم نہیں کرتے اور آج پرانے دستور کے سراسر خلاف ایک بات ہم سے بہ جبر منوا لیں گے تو کل دوسری بات اسی طرح منوانے پر اصرار ہوگا، اور اس ملک میں ہمارا رہنا اور اپنے مذہبی فرائض کی ادائگی اور حقوق کا استعمال صرف ہنود کی مرضی پر منحصر ہو جائے گا۔ جس چیز کو وہ پسند کریں گے وہ تو ہم کر سکیں گے اور جس چیز کو وہ ناپسند کریں گے اس کو ہم ہرگز نہ کر سکیں گے۔ ان کو اپنی تعداد، اپنی تعلیم اور اپنی دولت کا گھمنڈ ہے۔ اور اگر پہلے وہ خوف کے باعث ہم پر اس طرح جبر کرنے سے جھجکتے تھے تو اب شُدھی و سنگٹھن

کے مؤیدین کی یہ کوشش ہے کہ انھیں مسلمانوں سے بار بار الجھایا جائے اور اس طرح ان کا ڈر نکالا جائے۔ جو بات ہو بیکری کی ہو اور کوئی فعل، کوئی تقریر یا تحریر، کوئی اشارہ یا کنایہ ایسا نہ ہو جس سے پایا جائے کہ وہ مقابلے سے جی چراتے ہیں بلکہ ہر عمل اور ہر تحریر اور ہر گفتگو ایسی ہو جس سے مسلمان مرعوب ہو جائیں۔

اس کے جواب میں جب ان سے کہا گیا کہ اگر بعض ہنود کا یا اکثر کا بھی یہ خیال ہو تب بھی واقعۃً آپ ان سے مرعوب نہیں ہوئے ہیں۔ ہمت اور جوانمردی کا اظہار تواضع کے ساتھ بھی ممکن ہے۔ جو شخص یا جماعت آپ سے کوئی کام بہ جبر کرانا چاہے تو آپ کے لئے لاکھوں طریقے ممکن ہیں جن سے آپ ہنود کے دلوں میں یہ بات بٹھا سکتے ہیں کہ آپ دب کر کچھ بھی نہ دیں گے مگر آپ لطف کے بندے ہیں جو آپ کی طرف ذرا جھکے گا آپ اس کی طرف کہیں زیادہ جھک جائیں گے۔ اس وقت آپ کی جوانمردی کا امتحان بھی صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔ حکومت کی طرف سے سال گذشتہ کے خلاف اس بار پورا انتظام کیا گیا ہے کہ جو فساد کی دھمکی دے گا اس سے مرعوب ہو کر حکومت آخری وقت کوئی احکام نہ دے گی۔ جوانمردی کا امتحان تو اس وقت ہوتا جب حکومت کا انتظام خاص درمیان میں نہ ہوتا بقول غالب ؂

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

اصول کو چھوڑ کر ذوقی بحثیں چھڑ جاتی تھیں اور کوئی متنفس بھی ایسا نہ تھا جو نہ کہتا ہو کہ "صاحب، کتنوں کے تو لوٹن سنگھ سے ہاتھ مل گئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھوں تو کس طرح گائے کٹتی ہے۔ دور دور کے گانووں سے اس نے جاٹوں کو بلا بھیجا ہے۔ کسی عزیزہ کی بہی ہے، اس تقریب کے نام سے برادری

والوں کو اکٹھا کر رہا ہے منوں چاول اور گھی اس کے ہاں پہنچا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر اس سال گائے نکل گئی تو جاٹن کا دودھ نہ پیا ہوگا کسی کہ حیا کا دودھ پیا ہوگا۔ اگر اس سال گائے نہ نکلی تو ہمیشہ وہ طعنے دے گا اور ہم کو گردن نیچی کرنا پڑے گی وغیرہ وغیرہ۔ اس کی صحت کے متعلق اس لئے اور بھی تامل ہوتا ہے کہ بعض نے مجھ سے کہا کہ "لوٹن سنگھ تو ہم سے بالکل نہیں اینٹھتا، بلکہ کہتا ہے کہ بھئی تمہارا کیا نقصان ہے۔ میں تم سے کب لڑتا ہوں؟ اس میں میرا نفع ہے میری قوم میری مدد کرتی ہے تمہارا کیا بگڑتا ہے اور تم کیوں بگڑتے ہو۔" اس پر بعض نے یہ بھی کہا کہ "مجھے اپنی قوم سے ملتا ہے تو تمھیں بھی تو پنجابی خوب دیتے ہیں۔" لوٹن سنگھ اس وقت ماخوذ ہے اور یہ سراسر ناانصافی ہوگی اور شرافت کے خلاف ہوگا اگر اس کو ان بیانات کی تردید کا موقع دیے بغیر ایک حرف بھی باور کیا جائے۔ لیکن میں نے ان لوگوں سے جنھوں نے یہ کچھ کہا صاف کہہ دیا کہ اگر حقیقتہً چودھری لوٹن سنگھ کا یہی بیان ہے تب بھی جس کسی کو طعن و تشنیع سے تکلف ہو وہ قربانی کے ایام کے بعد بھی اس کی تشفی کر کری کر سکتا ہے۔ ایک شخص کے جھگڑے کرنے سے دو قومیں کیوں اپنے تعلقات کو خراب کریں، اور آپس میں ایک دوسرے پر فضل کرنے کو کیوں بھلا بیٹھیں۔ اور اتوار کے دن لوٹن سنگھ کی گرفتاری عمل میں آنے کے بعد تو اس کا کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے کہ گائے نہ نکالنے پر کوئی ہندو مسلمان کو چڑا سکے اور کہہ سکے کہ مسلمانوں نے جو کچھ کیا خوف سے کیا۔

اس کے جواب میں جو کچھ مجھ سے کہا گیا وہ یہ تھا کہ "جو آپ کہتے ہیں وہ تو سچ ہے مگر فقط لوٹن سنگھ کا معاملہ نہیں ہے۔ پہاڑی دھیرج میں اور بھی متمول ہنود رہتے ہیں اور اگر وہ اس پر راضی ہو جائیں کہ وہ اور ہم مل کر بیٹھیں، اور وہ کہیں

کہ جو کچھ تم لوٹن سنگھ کے متعلق کہتے ہو کہ وہ کہتا ہے ہم اس سے بری ہیں وہ ہرگز
ہمارے خیالات نہیں ہیں۔ تم اگر گائے اس راستے سے نہ نکالو گے تو تمہاری
عنایت ہوگی۔ ہم یہ کام دھینگی اور زور سے نہیں نکالنا چاہتے نہ اور نئے شاخسانے
نکالیں گے کہ ہمارے دلوں کو تمہارے اس کام سے تکلیف پہنچتی ہے۔ دل را
بدل رہیست ۔ آج تم ہماری بات مانو اور ہماری درخواست کا لحاظ کرو کل
ہم تمہاری مانیں گے اور تمہاری کوئی درخواست ہوگی اس کا لحاظ کریں گے۔ اگر وہ
یہ کریں تو ہم اس سال گائے نہ نکالیں گے اور دیکھیں گے کہ ان کا طرز عمل برادرانہ
اور پڑوسیوں کا سا رہتا ہے یا یہ فقط کام نکالنے کی چالیں تھیں وغیرہ وغیرہ۔ اتنا
اور بھی کہہ دوں کہ بہت سے لوگوں نے تو یہ بھی کہا کہ اگر پہاڑی دھیرج کے ہنود
ہمارے حق کا اور گذشتہ سال امسال اور اب تک کی غلطی کا اعتراف کریں تب بھی
ہم لوگ اس سال گائے نہ نکالنے پر رضامند ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں نے انھیں سمجھایا
کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جو تمھیں اس وقت حکومت کی مدد سے مل رہا ہے
اس سے زیادہ کا تم ان سے مطالبہ کر رہے ہو۔ اس وقت تو گویا عدالت نے
تمھیں ڈگری دی ہے مگر اب تم چاہتے ہو کہ فریق ثانی خود تمہارا حق تسلیم کرے
اور تم پر دعویٰ کرنے کی معافی بھی مانگے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ تمہاری ڈگری
ہو جانے کے بعد تم سے درخواست کرے کہ تم اجرائے ڈگری نہ کراؤ۔ اب تک
اس نے عدالت میں اپنے صحیح یا غلط دعوے کی پیروی کی۔ مگر اب جبکہ ڈگری تمہاری
ہوگئی وہ تم سے درخواست کرکے اپنی لاچاری کا اظہار کرتا ہے۔ تمہارا حق بھی اگر
تسلیم کرے تو کیا کہنا ہے۔ لیکن کیا محض اظہار لاچاری تمہارے غصے کی آگ کو
فرو کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟

اکثر ان لوگوں نے تسلیم کیا کہ یہ بھی کافی ہوگا۔ بعض کا خیال تھا کہ

چودھری لوٹن سنگھ سے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کو کہا جائے مگر میں نے ان کو جتایا کہ اس وقت کسی کا چودھری لوٹن سنگھ سے ملنا آسان نہیں۔ دوسرے میں تو اس کا روادار نہیں کہ جب ایک شخص دوسروں کی قید میں ہو اس وقت کوئی ایسی کارروائی کی جائے جس میں دباؤ یا مول تول کرنے کا ذرا سا بھی شائبہ ہو۔ چودھری لوٹن سنگھ سے میری ذاتی واقفیت نہیں ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا رویہ کیسا رہا ہے۔ مگر میں نے کانگریس کے ان کام کرنے والوں سے جنھوں نے اس سال ہی مسلمانوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے سنا ہے کہ اس نے مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے ساتھ گذشتہ سال وہ برتاؤ ہرگز نہیں کیا جو حکیم صاحب جیسے محترم بزرگ اور محسن کی ذرا بھی شایان شان ہو۔ یہ اطلاعیں مجھے نہایت موثق ذرائع سے پہنچی ہیں اور ان کی تردید مجھ سے اب تک کسی نے نہیں کی۔ اس لیے میں لوٹن سنگھ سے حسن ظن نہیں رکھتا مگر میں نہیں چاہتا کہ میں اس بارے میں ذرا سی بھی ناانصافی کا مرتکب ہوں اور گرفتاری کے بعد لوٹن سنگھ پر میں کسی دباؤ کے ڈالنے کا روادار نہیں ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود قیام امن اور دونوں قوموں کے تعلقات بہتر بنانے کے خیال سے از خود کوئی ایسی کارروائی کرے جس سے سارا جھگڑا چک جائے۔ نہ میں خود اپنے ضمیر کے خلاف کوئی اعتراف و اقبال کرنے کو تیار ہوں نہ کسی اور سے اس کی سفارش کر سکتا ہوں۔ البتہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ اگر واقعی میرا دل گواہی دے کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے، تو پھر اس خیال سے کہ لوگ میرے اس اقبال و اعتراف کو موجودہ حالت میں میری کمزوری پر محمول کریں گے اقبال و اعتراف نہ کرنا خود ایک بڑی کمزوری اور پاپ ہے۔

(۲) صوبہ سرحد کی بے آئینی اور "قوم پرور" ہندوؤں کا تعصب

ہمدرد ۲۲ فروری ۱۹۲۶ء

دو تقسیمیں

ع ۔ بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

میں جب سے کانگریس سے واپس آیا ہوں سوائے چند دنوں کے آج تک بیمار ہوں اور میری اس پیہم بیماری کا ثبوت اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ ۱۰ دسمبر سے لے کر اس وقت تک "کامریڈ" کا صرف ایک پرچہ ۲۲ جنوری کو نکال سکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک ایک عرصے تک سارے کام چھوڑ کر صرف اپنی صحت کی طرف متوجہ نہ ہوں اور پورا آرام نہ لوں اس وقت تک ڈاکٹر اور حکیم اور اچھی سے اچھی دوا اور سخت سے سخت پرہیز بھی جو سب کچھ میرے امکان میں ہے مجھے شفا نہیں دے سکتے۔ لیکن جہاں ہندی اور مسلمان دونوں ہونے کی حیثیت سے کاموں کی اتنی کثرت ہو وہاں سب کو چھوڑ کر صرف اپنی صحت کی طرف متوجہ ہو جانا میرے لئے کب ممکن ہے۔ اور پھر اگر میں نے سب کام چھوڑ بھی دیئے تب بھی سکون قلب جس کے بغیر صحت یابی ناممکن ہے کس طرح میسر ہو سکتا ہے جبکہ عالم اسلام اور خود ہندوستان کی گوناگوں مصیبتیں دل پر بار بار چوٹ لگاتی ہیں۔

میرے مرض کو کیفیات دماغ و قلب سے گہرا اور براہ راست تعلق ہے

اور گو میرے اعضاء و جوارح آرام پاتے ہیں اور میں کسی دماغی کام میں مشغول بھی نہ ہوں
تب بھی فکر کی کرید اور بہبود اسلام و ہندوستان کی طلب سے کہاں مفر ہے۔ دس
دن سے میں صاحب فراش ہوں یا کم از کم مجھے اس تمام عرصے میں صاحب فراش
رہنا چاہیے تھا مگر جس طرح اخبار "زمیندار" کے حق و صداقت سے سوا اور اس کے
مالک کے عہد و پیمان کی پابندی سے بے نیاز مجاز میں قیام ملوکیت کے پروپیگنڈا
نے مجھے مجبور کر دیا کہ گذشتہ جمعہ معرضہ ۸ شعبان کو رینگتا ہوا مسجد جامع میں پہنچوں
اور اقان وغیرہ اس کمبر پر چڑھ کر مسلسل تین گھنٹے تک چند غیر مقلد مقلدین ابن سعود
کی لغویتوں کا جواب دیتا رہوں۔ اسی طرح اس تاریخ سے تین دن قبل باوجود
حرارت اور درد کے اور ڈاکٹر سے استصواب کرنے پر ان کے امتناعی حکم کے
۱۶ فروری کو میں بغیر کسی کو اطلاع کئے ہوئے اور جہاں تک ہو سکا اپنے تیمارداروں
سے چھپ کر بستر علالت کو چھوڑ کر زنانہ مکان کے دروازہ کی راہ سے نکل کر میں
موٹر میں سوار ہو گیا اور اسمبلی کا تماشہ دیکھنے چلا گیا اور مسلسل چھ گھنٹے وہاں بیٹھ کر
دیکھتا رہا کہ اور تو اور ہمارے "قوم پرور" ہندو بھائی صوبہ سرحدی کی سرزمین
بے آئین کے ساتھ کیونکر انصاف کرتے ہیں۔ یہ ہرگز صحت پانے کے لچھن نہیں
ہیں لیکن میں افتاد طبیعت سے مجبور ہوں اور میرے معالج جانتے ہیں کہ اگر میں
گذشتہ جمعہ کو مسجد جامع جا کر "زمیندار" اور چند غیر مقلد مقلدین ابن سعود کی قلعی
نہ کھولتا یا اس سے بھی تین دن پیشتر خود اسمبلی جا کر اپنے کانوں سے برادران ہنود
کے تعصب کے ترانے نہ سنتا بلکہ بہ سکون تمام بستر مرض پر لیٹا رہتا تب بھی مجھ کو
سکون حاصل نہ ہوتا اور صحت درست نہ ہوتی بلکہ غالباً اپنے کو مقید پا کر میں اور
پریشان ہوتا اور سوہان روح جسم پر بھی اپنا ردعمل کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے
معالج جو میری افتاد طبیعت سے واقف ہیں وہ مجھے زیادہ مجبور نہیں کرتے اور

بقول ہمدرد کے ایک مضمون نگار کے ایک حد تک اسے گوارا کرتے ہیں کہ حکومت جنوبی افریقہ کی طرح جو ہندوستانیوں پر اپنے مظالم کو حکومت ہند اور حکومت برطانیہ دونوں کی دست اندازی سے بالاتر سمجھتی ہیں میں بھی اپنے مرض کو "گھریلو" تصور کر لوں۔

مولانا ظفر علی خاں کو سخت حیرت ہوئی کہ سلطان ابن سعود کے اعلان ملوکیت کی خبر کو میں نے سیاہ جدول کے اندر "ہمدرد" میں کیوں شائع کیا۔ مجھے ان کے تعجب پر ہرگز تعجب نہیں۔ اسی طرح ہمارے "قوم پرور" ہندو برادران وطن بھی غالباً متعجب ہوں کہ میں نے کیوں اتنی زحمت گوارا کی کہ بستر علالت پر سے تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسمبلی میں ہندو مہاسبھا اور سنگھٹن کی کرشمہ سازیوں کو دیکھنے کے لیے جا پہنچا اور مرض کے بڑھنے کی مطلق پرواہ نہ کی اور آج بھی متعجب ہوں گے کہ بجائے کچھ دن اور آرام کرنے کے میں نے خود صوبہ سرحد کے متعلق اسمبلی کی بحث پر خامہ فرسائی کی تکلیف گوارا کی۔ جن کے دماغ ملی وملکی کرید سے محفوظ اور جن کے قلب ان کے درد کی تڑپ سے ناآشنا ہیں ان کے لئے اس قسم کی مذبوحی کیفیت ضرور تعجب خیز ہوگی۔ میں نے اتنی لمبی تمہید کرنے کی زحمت اس لئے گوارا نہیں کی ہے کہ برادران وطن یا برادران ملت سے اپنے قلب کی ملکی وملی درد کی داد تحسین حاصل کروں۔ میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ برادران وطن محسوس کر سکیں کہ ان کے تعصب نے ان کے دشمنوں کو نہیں بلکہ مجھ جیسے ان کے دوستوں کو اس وقت آنا صدمہ پہنچایا ہے۔ ابھی صوبہ سرحدی کی مصائب پر اسمبلی کی بحث ختم نہیں ہوئی ہے اور سوراج پارٹی کے ممبر پنڈت موتی لال نہرو کی وزنی تقریر ابھی ہونا باقی ہے۔ میں اسمبلی میں ہندو ارکان کے دونوں اور سوراج پارٹی کے لیڈر کے اظہار خیالات کا منتظر ہوں اور ان کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ یہ کوئی معمولی بحث نہیں ہے۔

میں اسمبلی کے مباحثوں کو ایک فضول شے سمجھتا ہوں۔ مجھے اس سے قطعاً بھی توقع نہیں کہ یہ ہندوستان کو کچھ فائدہ پہنچا سکیں لیکن جو حضرات اسمبلی کے مباحثوں کے ساتھ خوش عقیدگی رکھتے ہیں اور جو ان سے کسی منفعت کے متوقع ہیں ان کو جاننا چاہیے کہ یہ فضول مباحثے بھی ملک کو کافی نقصان پہنچا سکتے ہیں اس لئے کہ ان حضرات کی تقریروں کا اور کچھ نتیجہ نکلے یا نہ نکلے لیکن ان سے پتہ چل سکتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر ہے اور صوبہ سرحد کے متعلق اسمبلی میں جو بحث ہو رہی ہے اس سے یہ بخوبی ظاہر ہو جائے گا کہ سوراج پارٹی ہندو سبھا سے مرعوب ہے یا نہیں اور لالہ لاجپت رائے کی اعانت حاصل کرنے کے لئے وہ مسلمانوں کے واجبی حقوق کو قربان کرنے پر راضی ہے یا نہیں۔ سوراج پارٹی کے قیام میں اس کے مسلمان ارکان نے اپنی تعداد کی نسبت سے کہیں زیادہ اسے مدد دی ہے اور مولانا شوکت علی اور میری طرح جو مسلمان "نو چینجرز" ہیں انھوں نے بھی سوراج پارٹی کو کچھ کم مدد نہیں پہنچائی ہے لیکن اگر پنڈت موتی لال نہرو یا سوراج پارٹی کے اور ارکان اس سے یہ تصور کرنے لگیں کہ یہ مدد ہر حال میں جاری رہے گی خواہ مسلمانوں کے ساتھ کتنی ہی نا انصافی کیوں نہ برتی جائے، تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی امداد کے متعلق ان کا اندازہ اور تخمینہ غلط ہے۔

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے تقسیم بنگالہ کا فیصلہ صادر کیا۔ صوبہ بنگال کے رقبے میں اس وقت صوبجات بہار و اڑیسہ بھی شامل تھے۔ سب کے لئے ایک ہی حکومت، ایک ہی کونسل، ایک ہی یونیورسٹی اور ایک ہی ہائی کورٹ تھا اور گو وہ لوگ جنھیں بنگال کے باہر ہم "بنگالی" کہتے ہیں یعنی ہنود بنگالہ وہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے رقبوں کی کل آبادی میں سے جو تقریباً ۹ کروڑ تھی صرف ۲ کروڑ

تھے۔ تاہم حکومت کے دفاتر، کونسل، یونیورسٹی، ہائی کورٹ سب پر مسلط تھے اور نہ صرف مسلمانانِ مشرقی بنگال بلکہ ہنود بہار و اڑیسہ بھی بنگالی بابوؤں کی اس اجارہ داری سے تنگ آگئے تھے اور نالاں تھے لیکن باوجود اس کے کہ مغربی و مشرقی بنگال و بہار و اڑیسہ اور آسام سارے رقبے کے لیے ایک ہی یونیورسٹی اور ایک ہی ہائی کورٹ رہا اور صرف حکومتیں اور کونسلیں دو کر دی گئیں اور یہی نہیں کہ قانون تعزیرات یا ضابطہ فوجداری میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا بلکہ بندوبست استمراری جو لارڈ کارنوالس کے زمانے میں اس بنگال و بہار میں کیا گیا تھا وہ بھی جوں کا توں قائم رکھا گیا۔ ہنود بنگالہ نے ایک عالم کو سر پر اٹھا لیا اور وہ شور بپا کیا کہ لارڈ کرزن کی تقسیم بنگالہ جس کو لارڈ مارلے نے امر فیصل شدہ ظاہر کیا تھا چھ برس کے اندر اندر منسوخ کر دی گئی اور ایک نئی تقسیم عمل میں لائی گئی۔

انھی لارڈ کرزن نے جو اس تقسیم بنگالہ کے بانی تھے اس سے چار برس پیشتر ایک اور تقسیم بھی کی تھی یعنی اس امید پر کہ ایک دن سرحد پار کے پٹھانوں پر بھی برطانوی حکومت قائم ہو جائے گی اور خط ڈیورینڈ تک پاغستانی علاقے پر برطانوی جھنڈا اڑنے لگے گا۔ سرحد کے پانچ اضلاع کو جن میں سے اکثر دریائے اٹک کے اس پار تھے صوبہ پنجاب سے نکال کر قبائل کے "غیر منظم" علاقے کے ساتھ ملحق کر کے انھیں مختصر سا صوبہ سرحدی بنا دیا تھا لیکن یہی نہیں کہ برخلاف صوبہ بنگالہ کی تقسیم کے اس صوبے میں ایک نئی کونسل قائم نہیں کی گئی، بلکہ اس صوبے کا تعلق پنجاب کے چیف کورٹ سے بھی نہیں رکھا گیا اور اس کے علاوہ اس صوبے پر اور ظلم یہ ڈھایا گیا کہ یہاں کا قانون تعزیرات اور ضابطہ فوجداری بھی بدل دیا گیا اور اگر دو لفظوں میں اس مصیبت کی داستان کو ادا کیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اس صوبے کو لارڈ کرزن آنجہانی نے سرزمین بے آئین بنا دیا۔ انگلستان

کا دعویٰ ہے کہ اس کا یورپ میں بھی طغرائے امتیاز یہ ہے کہ وہاں فقط آئین کی حکمرانی
ہے اور شہریوں کو کسی حاکم کی مرضی پر نہیں چھوڑا جاتا۔ انگلستان کے دستور کے ماہر
قانون پروفیسر ڈائسی کا قول ہے کہ برطانیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہاں "رول آف لاء"
یعنی قانون کی حکمرانی اور قانون ہی کا دور دورہ ہے لیکن برخلاف اس کے ہندوستان
میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکتا ہے شہریوں کے ہر حق کو حاکم کی مرضی اور
اختیار تمیزی پر چھوڑا جاتا ہے اور گو قانون بھی موجود ہے مگر اس کا نفاذ جن ہاتھوں
میں ہے وہ اپنے وسیع اختیارات تمیزی کو کچھ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ حق
حق نہیں رہتا اور قانون قانون نہیں ہوتا بلکہ حکام کی مرضی اور رائے پر ہر شے کا
دارو مدار رہتا ہے۔

دو مسلمان دو مختلف گاؤں میں اپنے ایک مذہبی تیوہار کے موقع پر اپنی
گایوں کی قربانی کر کے اپنا ایک مذہبی فریضہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک کو اس بنا پر
اجازت نہیں دی جاتی کہ اس گاؤں میں اس فریضے کی اس طرح ادائگی کا دستور
ثابت نہیں ہے اور دوسرے کو اگر ایک سال اجازت دی جاتی ہے کہ یہاں دستور
ثابت ہے تو دوسرے سال اس بنا پر اجازت نہیں ملتی کہ اس کے حق استعمال پر
اور اقوام کی جانب سے فساد کا اندیشہ ہے۔ دو شہروں میں متعدد شہری اپنے ایک
مذہبی تیوہار کے موقع پر اپنا ایک مذہبی جلوس باجے کے ساتھ نکالنا چاہتے ہیں لیکن ایک
شہر میں ایک خاص راستہ اس جلوس کے لئے اس بنا پر ممنوع قرار دیا جاتا ہے کہ
فلاں مساجد کے پچاس قدم اس طرف پچاس قدم اس طرف باجہ بند کرنے کا دستور
ہے اور اگر مسلسل باجہ بجتا ہو تو جلوس اس راستے سے نہ نکالا جائے حالانکہ ان مسجدوں
کے دروازے سے نمازی اس قدر دور ہوتے ہیں کہ معمولی باجے کی آواز ان کے ذکار و
اشغال میں حارج نہیں ہو سکتی اور عبادت کے وقت ان کی توجہ کو بالکل نہیں بٹا سکتی

اور دوسرے شہروں اور خود اس شہر کے دوسرے مواقع پر مساجد کے پاس سے باجے کے ساتھ جلوس کے گذرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہوتی حالانکہ بہت سی چھوٹی چھوٹی مساجد سڑک کے کنارے اس طرح واقع ہیں کہ باجے سے نمازیوں کی توجہ ضرور بٹتی ہے اور اذکار و اشغال اور عبادات میں ضرور ہرج واقع ہوتا ہے بالخصوص جبکہ کوئی امتناعی حکم اس قسم کا بھی جاری نہیں کیا جاتا کہ کم سے کم نماز با جماعت کے وقت مسجد کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو کر جلوس نکالنے والے گھنٹہ آدھ گھنٹہ مسلسل زور سے تاشے تڑتڑیں اور سنکھ اور قرنا سے زور و شور کے ساتھ آوازیں نہ نکالیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جس طرح دستور کے ثبوت کے بعد بھی دوسری اقوام کی جانب سے فساد کے اندیشے کے بہانے سے ایک گاؤں میں گائے کی قربانی حکام کبھی کبھی بند کر دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی جانب سے فساد ہونے کے اندیشے کے بہانے سے باجے کے ساتھ جلوس نکالنا بھی بعض مرتبہ ان شہروں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جہاں کسی مسجد کے سامنے بھی باجہ بند کرنے کے دستور کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہی مختلف دستور اور اختیارات تمیزی سب سے زیادہ فساد کا باعث ہوتے ہیں لیکن حکومت ایک عام قانون کا اعلان اور اس کی پابندی پر راضی نہیں ہے اس لئے ہندوستان میں وہ قانون اور آئین کی حکمرانی نہیں چاہتی بلکہ حکام وقت کی مرضی اور ان کے اختیارات تمیزی کی بدتمیزی کا دور دورہ دیکھنا چاہتی ہے۔ یہ حال تمام ہندوستان کا ہے، جہاں قانون اور ضابطے جاری ہیں اور عدالتیں انصاف کے لئے کھلی ہوئی ہیں ان عدالتوں میں حکومت اور گورے چمڑے والوں اور دیگر حکام کے چہیتوں کے مقابلے میں جیسا کچھ انصاف ملتا ہے اس سے ہم بخوبی واقف ہیں لیکن ع

حور دنہ خیاں پرس کہ اعراف بہشت است

خوبیب صوبہ سرحد والے اس سرزمین بے آئین میں اس اعراف سے بھی

محروم ہیں اور وہاں دنیا سے انوکھا اور نرالا قانون اور ضابطہ سنہ ۱۹۰۱ء کی تقسیم کے بعد سے "ضوابط جرائم سرحد" کے نام سے جاری ہے جس میں ہر چیز حکام کے ہاتھ میں چھوڑ دی گئی ہے اور جرگے کے جمہوری نظام کو بھی اس طرح حکام کا آلۂ کار بنا دیا گیا ہے کہ حکام کے مظالم اور استبداد کی بندوق جرگے کے کاندھے پر رکھ کر چھوڑ دی جاتی ہے۔ اگر یہ قانون بنگال کی تقسیم کے بعد بنگال میں جاری کیا گیا ہوتا تو نہ معلوم ہنود بنگال نے کیا قیامت برپا نہ کی ہوتی صرف حکومتوں اور کونسلوں کی تقسیم ہی پر جس سے ۹ کروڑ آبادی میں سے فقط دو کروڑ بنگالی ہنود کے اجارہ کو صدمہ پہنچتا تھا۔ سارے ہندوستان کے ہنود نے اس کو سارے ملک کا مسئلہ بنا کر کانگریس اور اس کے ماتحت انجمنوں کے ہر پلیٹ فارم سے اس زور و شور کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کیں کہ جب تک یہ تقسیم منسوخ نہ کر دی گئی ہندوستان میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور سبب علاوہ ہندو بنگالیوں کے اجارہ کی شکست کے صرف یہ تھا کہ مشرقی اور مغربی بنگال دونوں میں ہندو بنگالی اقلیت میں ہو گئے تھے۔ آج جبکہ ہنود پنجاب کو بھی یہ گوارا نہیں کہ پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۵۵ فی صدی ہے، ان کی نیابت حسب مطالبہ مسلم لیگ ۵۰ سے فقط ۵۱ ہو جائے۔ ہنود پنجاب کو بھلا یہ کیوں کر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں ایک صوبہ بھی ایسا ہو خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو جہاں ہنود کی اقلیت ، فی صدی ہو گو ہندوستان میں مدراس، بہار و اڑیسہ، صوبجات متوسط و برار کے صوبہ سرحدی سے کہیں بڑے بڑے صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ۱۰ و ۱۱ فی صدی سے لے کر ۴ فی صدی تک ہے۔ صوبہ سرحدی کی تقسیم سے اسے علاوہ کونسل میں حکام کے افعال و اعمال پر تنقید و تبصرہ کے تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری کی پناہ سے بھی محروم کر دیا۔ پھر اس کی کس طرح توقع ہو سکتی تھی کہ "مارلے منٹو ریفارم اسکیم" یا "مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم اسکیم" سے اس کو کچھ بہرہ اندوزی حاصل ہو سکے گی۔

ہم کو اس سحاب باراں کی اصل و حقیقت سے پوری واقفیت ہے جو لارڈ منٹو اور لارڈ چیمسفورڈ کی حکومتوں کے طفیل کشت زار ہندوستان پر برس گئے۔ ان دونوں سے وہ ایک ہی ابر نیساں نہ تھا جو صدف کی تشنہ لبی کو دور کرسکتا اور ہندوستان کی سیپی میں موتی کی پرورش کا سامان کر دیتا لیکن اس سے بھی نہ سوراجی انکار کرسکتے ہیں نہ "نو چینجرز" کہ گو ہماری ضروریات اور توقعات کے لحاظ سے یہ اصلاحات کتنی ہی ناکافی اور غیر تسلی بخش کیوں نہ ہوں اور ان کے ذریعے سے اہل ملک کو کتنا ہی دھوکا کیوں نہ دیا جاتا ہو پھر بھی اصلاحات کا لقب ان کے لئے بالکل بے معنی نہ تھا۔ اگر کوئی "نو چینجر" انکار کرے تو کرے لیکن کوئی سوراجی جو داخلہ کونسل کا حامی ہے اور انھیں اصلاحات کی بدولت آج کونسل میں گھس کر دوعملی کی تخریب کا ادعا کرتا ہے انکار نہیں کرسکتا کہ اگر یہ اصلاحات ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جاری نہ ہوتیں تو ان کا موجودہ مشغلہ اسے میسر نہ آتا یقیناً کوئی سوراجی دوعملی کا مطالبہ نہیں کرسکتا لیکن یہ سوراج پارٹی کے اصول داخلہ کونسل کے خلاف ہے کہ کسی صوبے میں سرے سے کونسل ہی نہ رہے اور اس لئے صوبہ سرحد کے لئے وزرا اور منتقل شدہ محکمہ جات کا مطالبہ ناجائز ہو تو ہو مگر کونسل اور انتخابات کا مطالبہ ہرگز ناجائز نہیں۔ بے چارہ صوبہ سرحدی وزرا سے بے نیاز ہو سکتا ہے اور مجھ جیسے "نو چینجر" کے نزدیک کونسلوں سے بھی بے نیاز ہو سکتا ہے لیکن جب صوبہ بنگالہ تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری سے بے نیاز ہو کر "نو چینجر" کے نزدیک بھی بنگال آرڈیننس کی مارشل لا کو قبول نہیں کرسکتا تو صوبہ سرحدی ان سے بے نیاز ہو کر ضوابط جرائم سرحد کو کس طرح قبول کرسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ قوم پرور برادران ہنود نے بھی باوجود تقسیم بنگالہ کی منسوخی کے اس سے چار برس پیشتر کی سرحدی تقسیم کو منسوخ نہ کرایا نہ آج تک اس کی بے انصافی کے خلاف ایک موثر صدائے احتجاج بلند کی اور آج بھی جبکہ صوبہ سرحد کے لئے اصلاحات

کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو لالہ لاجپت رائے اور ان کے تبعین کی خوشنودی کے حصول کی خاطر سوراج پارٹی کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ دو عملی کا مطالبہ ہم کس طرح کر سکتے ہیں۔ اور جب ایک ترمیم کے ذریعے سے دو عملی کی جگہ ایک عملی اور صوبے کے لیے کامل سوراج کا مطالبہ کیا جاتا ہے تب صوبہ سرحدی کو سوراج کی خوش آیند توقعات میں شمولیت کا شرف بخشا جاتا ہے لیکن اس شرط پر کہ وہ پنجاب کے ساتھ الحاق پر راضی ہو جائے۔

میں لارڈ کرزن کی اس سب سے پہلی تقسیم کے بھی خلاف تھا اور ان کی نیت کو برابر فاسد سمجھتا رہا ہوں لیکن صوبہ سرحد کا علیحدہ وجود قائم رکھنا یا اس کا پنجاب میں پھر ملحق کر دیا جانا ایک دوسرا مسئلہ ہے اور اس کے باشندوں کو بے آئینی کی مصیبت سے نکالنا ایک دوسرا مسئلہ ہے اور پھر صوبہ سرحدی کی مصائب کو پھر اسی شرط پر دور کرنے کا وعدہ کرنا کہ وہ پنجاب سے الحاق قبول کر لے بلیک میل یعنی استحصال ناجائز سے زیادہ نہیں۔ سوراج پارٹی کے حیلہ ہائے شرعی ہماری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے اور ہم کو صاف نظر آ رہا ہے کہ سوراج پارٹی کی ان فقیہانہ ہیچیدگیوں کے پیچھے ہنود کا کونسا جذبہ کام کر رہا ہے۔ اس وقت بھی اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور انشاء اللہ جلد اسی موضوع پر دو چار مضامین سپرد قلم کروں گا جس میں بتاؤں گا کہ ۱۹۲۱ء میں وہ کیا چیز تھی جس نے حکومت کو مجبور کیا تھا کہ صوبہ سرحدی کے مطالبات پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کرے اور جس نے خود اس کمیٹی کو مجبور کیا تھا کہ صوبہ سرحدی میں اصلاحات کو جاری کرنے کی سفارش کرے۔ اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ اس کے بعد کس چیز نے حکومت کو ترغیب دلائی کہ وہ کمیٹی کی رپورٹ کو دبا رکھے اور مدت کے بعد شائع بھی کرے تو کمیٹی کی سفارشات پر مطلق توجہ نہ دے اور سب سے آخر میں یہ ثابت کروں گا کہ اگر حکومت کی نظر صوبہ سرحدی کے باشندوں

سے پڑی ہوئی ہے تو وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہندوستان کو غلامی میں رکھنا اس کا
اولین مقصد ہے اور اسی بنا پر ہندوستان آنے کے لیے تری و خشکی دونوں راستوں
پر جو جو اقوام بستی ہیں ان کو غلام بنانا اور غلام ہو گئی ہوں تو ان کی غلامی کی زنجیروں
کو اور بوجھل کرنا گورنمنٹ کا ضمنی مقصد ہے اور سب کے بعد انشاءاللہ میں ثابت
کروں گا کہ اگر قوم پرور برادران وطن بھی صوبہ سرحدی سے آنکھ چراتے ہیں تو صرف
اس بنا پر کہ اس صوبے میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابل ۹۳ فی صدی کی
ہے اور جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ہنود باوجود اپنے ادعائے وطن پرستی کے ہرگز نہیں
چاہتے کہ ایک صوبے میں بھی مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہو اور وہ خود اقلیت میں رہیں
اور بالخصوص اس چھوٹی اقلیت میں جیسے کہ صوبہ سرحدی میں ان کو اس وقت میسر ہے
حالانکہ وہ گلے پھاڑ پھاڑ کر مسلمانوں کو اقلیت پر قناعت کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔
اور چاہتے ہیں کہ مسلمان ان کی اکثریت کے خائف نہ ہوں۔ افغانی ہوا اگر اس کی کوئی
نفسیاتی حیثیت بھی ہے تب بھی برادران وطن کے جبن کا انعکاس اور بس۔

لیکن مجھے تعجب ہوتا ہے کہ جو قوم مہاراجہ نیپال کو ہندو مہا سبھا کی صدارت
کے لیے دہلی بلائے وہ کس منہ سے افغانی ہوے سے ڈرنے کا بہانہ کر سکتی ہے لیکن
حقیقت یہ ہے جہاں جہاں ہنود تکلیف میں ہیں یا کسی نئے انتظام کے بعد اقلیت
میں ہو جائیں گے وہاں خود انھوں نے ہراس خوف کے وجود کا ثبوت دے دیا ہے
جو بعض کمزور قلب کے مسلمانوں کو ان کی اکثریت سے لرزہ براندام رکھتا ہے۔ میں
مسلمانوں کی ایک سربرآوردہ جماعت کی سیاسی لغویات کا اقبال کرتا ہوں لیکن
تعجب تو یہ ہے کہ برادران ہنود کی اس سے کہیں زیادہ سربرآوردہ جماعت اعلیٰ
تمام لغویات کی مرتکب ہوتی رہتی ہے اور پھر اس پر اتحاد و اتفاق کا راگ بھی
گاتی رہتی ہے اور مسلمانوں کی ہر اس پناہ جوئی کی مخالفت بھی کرتی رہتی ہے جس

خود اس کا دامن داغ دار ہے۔ مجھ پر یہ حقیقتیں ایک عرصے سے آشکارا تھیں مگر میں امید کرتا تھا کہ مہاتما گاندھی کی قیادت برادرانِ ہنود کو حرص و آز اور جبن و بزدلی سے آزاد کرا دے گی۔ افسوس کہ یہ امید بر نہ آئی اور یہی نہیں کوئی اصلاحِ حالات نہیں ہوئی بلکہ صوبہ سرحدی کے لئے اصلاحات کے مطالبے نے اب ان حقیقتوں کو اب اتنا آشکارا کر دیا کہ وہ غبی سے غبی انسان کو بھی روزِ روشن کی طرح صاف نظر آتی ہیں۔

(۳) ملت پروری اور وطن دوستی

شکوہ اور جوابِ شکوہ

ہمدرد ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۶ء

مجھے حسب ذیل شکوہ موصول ہوا ہے جو بجنسہٖ درج کیا جاتا ہے:۔
میرا شکوہ آپ سے ہے۔ آپ کے اخبار میں نیشنل یونین کے متعلق اور اس کے بعد دوسرے روز کا آپ کا افتتاحیہ میں نے پڑھا تھا اور مجھے ان دونوں مضامین میں بعض ایسی صداقتوں کا بیان ملا تھا کہ جن کو میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں خصوصاً وطن اور ملت کے پیار، عالم گیر پریم کی زنجیر کی بعض کڑیاں گو بہت ضروری کڑیاں جانتے اور ظاہر کرنے کو میں نے خاص قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا کیونکہ دراصل اس صداقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے ہی ہم ملک و ملت کے پیار کو وہ جگہ دے سکتے ہیں کہ جس سے وہ ہمارے کل کائنات اور کل نوع انسان کے ساتھ پریم کے جذبے کے متضاد نہیں بلکہ معاون بن سکیں۔
مجھ کو یہ کہنے سے معاف فرمائیے گا کہ آپ نے باوجود اس صداقت کے بیان کے حُبِّ وطن کو حبِ دین کے مقابل پر جس قدر ہیچ ظاہر کیا تھا مجھے اس سے یہ اندیشہ ہوا تھا کہ ہمارے ہم وطنوں میں سے اس طبقے پر اس کا بہت خراب اثر پڑے گا

کہ جو حب وطن کے جذبے کے لئے ابھی تک کبھی نمایاں جوش کا ثبوت نہیں دے سکا اور جن کا جذبہ عشق حب دین سے شروع اور حب دین پر ختم ہو جاتا ہے اور جن کے لئے کاشی اور گنگا کوئی نسبتی کشش بھی نہیں رکھتے اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے جریدہ میں شائع شدہ "فریاد وجرم" لطافت سخن کی خوبی کے باوجود میرے اس اندیشے کے بابنیاد ہونے کا پہلا ثبوت ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ اگر آپ نے اس لہر کو روکنے یا مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے کوشش نہ کی یا اور اگر آپ سے ایسی کوشش کی امید نہ کی جائے تو مسلمان بھائیوں میں سے اور کس سے امید کی جائے۔

مجھ کو خطرہ ہے کہ حبِّ وطن کا جو جذبہ ہمارے ہم وطنوں میں پہلے ہی بہت کمزور اور کثیر التعداد میں بالکل مفقود ہے وہ ان بادخزاں کے جھونکوں سے اور بھی زیادہ مرجھا یا سوکھ نہ جائے۔ بے شک حب وطن دنیا کی محبت میں نہ آخری منزل ہے کہ جس کے بنا دائرۂ عشق نہایت نامکمل اور ناقص ہی نہیں رہتا بلکہ جس کی عدم موجودگی اس وقت ہمارے اور جذبات پاکیزہ کی تکمیل کے راستے میں بھی از حد سدراہ بنی رہی ہے۔ اس لئے آپ کی خدمت میں فقط یہ ہی عرض ہے کہ دیکھنا آپ کی جنبش قلم وزبان سے اس نازک پودے کو ایسی ٹھیس نہ لگنے پائے جس سے اس ننھے سے پودے کی ناتواں ہستی بھی خطرے میں پڑ جائے۔"

دہلی: نیا بازار ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء

راقم وید رتن شرما

دیو رتن شرما کا شکوہ میرے سر آنکھوں پر جو وطن پرور بھائی وطن کی محبت کو
کسی فیشن کے اتباع کے طور پر اپنا مسلک نہیں قرار دیتے بلکہ خود اپنی عقل پر زور
ڈال کر اس کی ضرورت کے قائل ہوئے ہیں۔ ان کی خدمت میں میں بھی جواب شکوہ
پیش کر سکتا ہوں کہ گزشتہ ۱۹۱۷ء میں میرا انتخاب بحیثیت صدر مسلم لیگ ہوا تھا لیکن
نہ معلوم کس وجہ سے خدا کو منظور نہ ہوا کہ میں فرائض صدارت انجام دوں اس لئے
حکومت نے مجھے رہا نہ کیا اور کرسی صدارت پر فقط میری تصویر جلوہ افروز تھی اور
سب سے پہلا عہدہ جو ساری عمر میں مجھے پیش ہوا اور جس کا فیصلہ میرے قید و بند
کے زمانے ہی میں بلا میری اجازت بلکہ میری بلا اطلاع کے ہو گیا وہ انڈین نیشنل کانگریس
کی صدارت تھی۔ اس پر بھی میں انکار کر سکتا تھا لیکن میرے نہ انکار کرنے کے خواہ کوئی
بھی وجوہ ہوئے ہوں میں نے انکار نہ کیا۔ اس کے بعد میرے لئے اور بھی ناممکن ہو گیا
ہے کہ وطن پروری کے جذبے کے خلاف میرا کوئی قول یا فعل ہو سکے۔ افسوس کہ یہ
جذبہ نہایت کمزور ہے اور ہم کو پوری احتیاط برتنی چاہیے کہ کہیں ہمارے کسی قول
یا فعل سے یہ جذبہ اور بھی کمزور نہ ہو جائے مگر میں شرما صاحب سے اس میں متفق نہیں
کہ ہمارا جذبۂ دینی کچھ زیادہ مضبوط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو جذبہ کہ آج سب سے زیادہ مضبوط نظر آتا ہے وہ نفس پروری
اور نفس پرستی کا جذبہ ہے اور ہم اسی کی تحریک پر لوگوں کو بے وقوف بنا کر ملتوں کے
رہنما اور لیڈر بننا چاہتے ہیں۔ میں نے جو مضمون انڈین نیشنل یونین پر لکھا تھا وہ ایک
پورے سلسلے کا ابتدائی مضمون تھا۔ شرما صاحب اگر میرے مضامین کو جو "ہمدرد"
میں اب مسلسل نکل رہے ہیں ایک مہینہ بھر بھی اگر پڑھنے کی محنت گوارا فرمائیں گے
تو انھیں خود واضح ہو جائے گا کہ میں ہندوستان والوں اور مسلمانوں کو کہاں سے
کہاں لے جانا چاہتا ہوں۔ میں جس طرح جس وقت سے یورپ کے لباس کے

فیشن سے اب مستغنی ہوگیا ہوں اسی طرح یورپ کے سیاسی فیشن سے بھی مستغنی ہوں اور دوسروں کو بھی اس سے مستغنی کرنا چاہتا ہوں۔ میری جدوجہد کا بڑا حصہ انشاء اللہ اس پر صرف ہوگا کہ لوگوں کو نفس پروری و نفس پرستی سے خواہ یہ بت کسی شکل، کسی لباس اور کسی پردے میں کیوں نہ ہو بچایا جائے اور انھیں غلامی کی زنجیروں سے خواہ وہ اپنے نفس کی غلامی ہو یا بادشاہوں کی غلامی یا لیڈروں کی یا پیر، پوپ، پنڈت، پادری اور مولوی کی غلامی ہو نجات دلائی جائے۔ میری التجا بالخصوص ہندو بھائیوں سے ہے کہ وہ قرآن کریم اور بائبل کے اقتباسات سے نہ گھبرائیں اور یہ نہ سمجھیں کہ وہ مضامین جن کی سرخی قرآن کریم یا بائبل سے لی گئی ہے یا جن میں ان کتابوں کے قصے دہرائے گئے ہیں وہ مسلمان یا عیسائیوں کے لیے مخصوص ہیں وہ سب ہندوستانیوں اور سب انسانوں کے لیے ہیں اور مجھے امید ہے کہ کوئی بھائی بھی ان کو پڑھ کر رنجیدہ نہ ہوگا بلکہ کچھ نہ کچھ فائدہ اور لطف ہی اٹھائے گا۔

میری ایک اور التجا ہے اور وہ یہ کہ جن بھائیوں کی کاشی، گیا اور متھرا اسی دیس میں ہیں اور ان کی گنگا اور جمنا اور نربدا یہیں بہتی ہیں وہ ان بھائیوں کو جذبۂ حب وطن سے جو ایک حد تک فطرتی اور طبعی ہے اس بنا پر بالکل خالی نہ سمجھیں کہ وہ ان دوسرے دیسوں سے بھی محبت رکھتے ہیں جہاں ان کی کاشی اور متھرا وغیرہ ہیں۔ آج ہندوؤں اور مسلمانوں کی حب وطن کا موازنہ کرنا آسان نہیں اگر کعبہ اور روضۂ رسول اکرم کی طرح ہندوؤں کے تیرتھ بھی ہندوستان سے باہر ہوتے تب ان کی حب وطن کا صحیح اندازہ ہو سکتا۔ غالب نے خوب کہا ہے کہ

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

لیکن موازنہ اور مقابلہ اس قدر ضروری نہیں جس قدر کہ سب ہندی لتوں

کے دلوں میں غلامی سے نفرت اور صحیح جذبہ آزادی پیدا کرنا بغیر تمام ملتوں کے اتفاق و اتحاد کے ہندوستان کی آزادی بظاہر ناممکن معلوم ہوتی ہے اس لئے میں کہ ہر وقت اس کا خواب دیکھا کرتا ہوں اور اس کے لئے دست بدعا ہوں جذبۂ حب وطن کو کیوں کر کمزور کرنا چاہوں گا۔

---

(۴) مشترکہ قومیت کی شکست

دہلی کے مخلوط انتخاب کا حشر

جمعہ ۴ نومبر ۱۹۳۶ء

لیجے، قتل کی رات بھی گذر گئی، عاشورہ کا دن بھی بیت گیا، اب تعزیے ٹھنڈے ہو گئے۔ دہلی کی زمین میدان حشر بنی ہوئی تھی اور الیکشن کے نفخ صور سے اس مردہ بستی کی آبادی "یویلنا من بعثنا من مرقدنا" کہتی ہوئی "فاذاھم من الاجداث الی ربھم ینسلون" کی مصداق اپنی قبروں سے یکایک نکل پڑی تھی مگر اب پھر سب مردے اپنی اپنی قبروں میں جا سوئے اور یہ ظاہر ہے کچھ ایسے سوئے ہیں جیسے مانے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے۔

یکم نومبر کی سہ پہر کو انتخاب کا قضیہ نمٹا دیا گیا۔ لالہ رنگ بہاری لال کو ۱۶۸۰ ووٹ ملے، مسٹر آصف علی کو ۱۴۴۶ اور لالہ شو نراین کو ۴۷۴۔ بہشت کے اعراف اور دوزخ تقسیم ہو چکے۔ اگر "خالدین فیھا ابداً" نہیں تو کم از کم تین سال کے لئے تو طوبیٰ اور زقوم امیدواروں کے حصے میں لکھ دیئے گئے۔ یہ تو امیدواروں کا حشر ہوا۔

مگر جنھوں نے ان کے لئے دوڑ دھوپ کی اور ساری رائیں حاصل کیں اور دیں ان کا وہی حال ہے۔ وہی انگریزی حکومت کا سایۂ عاطفت سب کے سروں پر ہے، وہی کالے گورے کی تمیز ہے، وہی ٹیکسوں کی مصیبت ہے، وہی فوجی اخراجات کی کثرت۔ تعلیم گئی ہے بھی تو وہی کلرکوں اور غلاموں

کی تربیت کے لیے حفظان صحت کا حال دہلی کے شفاخانوں اور مطبوں میں جاکر دیکھ آئیے یا پھر قبرستانوں یا مرگھٹوں میں اور دہلی کی دولت کا حال جامع مسجد کی سیڑھیوں اور جمنا کے گھاٹ پر یا ہر گلی کوچے میں جہاں کنگالوں اور بھیک منگوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ الیکشن کی عید ختم ہو گئی مگر دہلی میں جو "عید پیچھے تڑ" ہوتی ہے وہ اس عید کے بعد غائب ہے۔ آئیے ہم اس "تڑ" کو جسے اہل دہلی جلا بیٹھے آج منائیں یا اس عشرۂ محرم کے بعد سویم اور چہلم کی فاتحہ خوانی کریں اور مجلس عزا منعقد کریں۔

پہلے ایک نظر الیکشن کے اعداد پر ڈالیے۔ "ہندوستان ٹائمز" نے کل ووٹ دینے کے استحقاق رکھنے والوں کی تعداد ساڑھے چھ ہزار بتائی ہے اور عام طور پر دہلی میں مشہور تھا کہ ۱۸۰۰ مسلمان اور ۴۵۰۰ غیر مسلم یعنی کل ۶۳۰۰ اہالی دہلی ووٹ دینے کا حق رکھتے ہیں مگر ڈپٹی کمشنر کے دفتر اور نیز ایک امیدوار سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ استحقاق ۵۵۵۱ اشخاص کو حاصل تھا جو ووٹ تینوں امیدواروں کو ملے ان کی تعداد ۳۶۰۰ ہے۔ ۱۹ اشخاص کے ووٹ اس بنا پر شمار نہیں کیے گئے کہ یا تو ووٹ دینے والے نے اپنی پرچی پر اپنا نام بھی ٹانک دیا تھا، حالانکہ "بیلٹ کی رازداری" مشہور ہے اور اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ راز کسی پر کھلنے نہ پائے کہ کس ووٹر نے کس امیدوار کے لیے رائے دی اور اس پر کسی طرح کا ناجائز دباؤ نہ ڈالا جا سکے، یا بجائے ایک امیدوار کے دو یا تین ناموں کے سامنے نشان کر دیا تھا یا اسی قسم کی کوئی اور غلطی کی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی سنا گیا ہے کہ ۴۴ دیگر اشخاص ووٹ دینے گئے تھے مگر کسی نہ کسی بنا پر ان کا ووٹ داخل "بیلٹ" نہیں کیا گیا گو ان سے "پرچی" پر نشان لگوا کر احتیاطاً رکھ لیا گیا تھا۔ یہ اس قسم کے اشخاص ہوا کرتے ہیں کہ ان

کے نام سے کوئی پہلے ووٹ دے جاتا ہے اور پھر یہ آتے ہیں تو امیدواروں کی درخواست آنے پر تحقیقات کی جاتی ہے کہ جس شخص نے پہلے ووٹ دے دیا تھا وہ اصلی صاحب استحقاق تھا یا بعد کا ووٹ دینے والا۔ اگر کوئی غلطی یا فریب ثابت ہو جاتا ہے تو پہلا ووٹ خارج کر دیا جاتا ہے اور بعد کے آنے والے کا ووٹ، اگر وہی اصلی ووٹر ہے، شمار کر لیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی کچھ ووٹ ایسے ہوتے ہیں جو شمار تو کئے جاتے ہیں مگر جن پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ ان کی بھی امیدواروں کی درخواست پر تحقیقات ہوتی ہے۔ اس بار اس قسم کے غالباً ۱۲ ووٹ تھے۔ چونکہ جیتنے والے اور اس سے کم ووٹ پانے والے دوسرے امیدوار کے درمیان ۲۳۴ ووٹ کا فرق ہے، اس لئے غالباً کوئی درخواست ان ۲۳۴ ووٹوں کے متعلق پیش نہ کی جائے گی جو پیش کئے جانے پر بھی شمار نہیں کئے گئے تھے اور نہ ان بارہ ووٹوں کے متعلق جو شمار کر لئے گئے تھے مگر جن پر کسی نہ کسی کا اعتراض تھا۔ بہرکیف ۱۵۵۰ اشخاص میں سے کل ۳۶۱۹ کے ووٹ شمار کئے گئے اور ان میں سے ۳۶۰۰ صحیح تسلیم کئے گئے یعنی ووٹ دینے کے مستحق داروں میں سے ۶۵ نے اپنے اس حق کا استعمال کیا۔

جہاں تک مجھے علم ہے کہ جب ۱۹۲۰ء میں پہلی بار اسمبلی کا انتخاب ہوا تھا اور کانگریس و خلافت کا حکم تھا کہ "پرچی" نہ دو اور "حلوائے سوہن" کو سیاست پر نمایاں فتح حاصل ہوئی تھی، دہلی کے اتنے رائے دہندوں نے انتخاب اسمبلی کے لئے رائے دی تھی نہ اس کے تین سال بعد جب سوراج پارٹی کے کہنے پر پیارے لعل صاحب وکیل کا انتخاب ہوا تھا باوجودیکہ میں اور میرے ہم نوا کانگریسی اور خلافت والے کونسلوں کے داخلے کو فضول اور فضول ہی نہیں بلکہ مضر بھی سمجھتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ووٹ دینے کے ۱۰۰ حق داروں میں سے ۶۰ کا ووٹ دینا اہل دہلی کی بیداری کا ثبوت ہے بالخصوص جب کہ ہم یاد رکھیں کہ ان ۱۰۰ میں سے بھی کتنے ووٹ دینے کے وقت اس دنیائے فانی سے ایک ایسے عالم کو سدھار چکے تھے جہاں نہ کونسل ہے، نہ انتخاب، نہ کانگریس ہے، نہ خلافت، نہ ہندو سبھا اور نہ سوراج پارٹی ہے نہ "انڈیپنڈنٹ (یعنی اینٹی کانگریس) پارٹی" نہ حفاظت دین و ملت کا شور ہے نہ دھرم کی رکشا کی پکار۔ پھر بعض ایسے بھی ہونگے جو دہلی میں اس وقت موجود نہ تھے یا موجود تھے مگر علالت یا کسی اور وجہ سے انتخاب گاہوں میں حاضری اور ووٹ دینے سے معذور تھے۔

جہاں تک دریافت کیا جا سکا معلوم ہوا ہے کہ ۱۰۵۵۵ کل مستحقین رائے دہی میں سے تقریباً ۴۲۰۰ مسلمان تھے اور تقریباً ۶۰۰۰ یا ۶۳۰۰ غیر مسلم تھے یعنی فی صدی کل ۴۰ مسلمان تھے۔ مختلف امیدواروں کو جتنے ووٹ ملے ہیں صرف انھیں کے اعداد حکومت کی طرف سے شائع کیے جاتے ہیں اور ڈسٹرکٹ مشن جج کے دفتر سے جو "ریٹرننگ افسر" ہیں اور ڈپٹی کمشنر صاحب کے دفتر سے جہاں تمام ریکارڈ بھیجا جا چکا ہے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کتنے مسلمانوں نے اپنے حق رائے دہی کا استعمال کیا اور کتنے ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں وغیرہ نے۔ اس کا سرکاری دفاتر میں کوئی حساب نہیں رکھا جاتا اور "ہندوستان ٹائمز" کے اڈیٹر کا بیان کہ رائے دہندگی کے "ریکارڈ" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰۰ ہنود سے زیادہ نے مسلمان امیدوار کے لئے رائے دی مگر ایک مسلمان نے بھی کسی ہندو امیدوار کے لئے رائے نہ دی، محض ان کا قیاس و تخمین ہے یا ان کے واہمہ کی خلاقی اور ایک من گھڑت "ریکارڈ" جس کو حکومت کے "ریکارڈ" سے کوئی تعلق نہیں۔

البتہ مسلمان امیدوار کے ایجنٹوں نے مختلف انتخاب گاہوں میں رائے

دینے کے لیے آنے والے مسلمانوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس کی رو سے
۲۳۰۰۰ مسلمانوں نے اپنے حق رائے دہی کا استعمال کیا۔ ان کی تعداد کی نسبت
کل رائے دینے والے اہالی دہلی کے مقابلے میں جن کی تعداد ۳۶۱۵۰ تھی،
فی صدی ۳۰ ہے یعنی گو رائے دینے کے استحقاق رکھنے والوں میں مسلمانوں کی
نسبت فی صدی فقط ۲۰ تھی مگر جن لوگوں نے اپنے اس حق کو استعمال کیا ان میں
مسلمانوں کی نسبت بڑھ گئی اور فی صدی ۳۰ رہی۔ اگر ان اعداد کو صحیح مان لیا
جائے یعنی ۱۶۷۰۰ یا ۱۶۸۰۰ مسلمانوں کو رائے دہی کا حق تھا اور ۱۳۰۰۰ نے
انتخاب گاہوں میں جا کر رائے دی تو فی صدی ۸۰ مسلمانوں نے حق رائے دہی
کا استعمال کیا اور جس حد تک بھی رائے دہندگی کو بیداری تسلیم کیا جائے مسلمانوں
نے اپنی بیداری کا ضرور اور بے شک وشبہ ثبوت دیا۔

سنا گیا ہے کہ نابینا اور مفلوج مسلمان جو اس سے پیشتر کبھی گھر سے نہ
نکلتے تھے انھوں نے بھی انتخاب گاہوں تک جانے اور رائے دینے کی زحمت
گوارا کی۔ ان اعداد کے مقابلے میں ۳۰۰۰۰ یا ۳۰۸۰۰ غیر مسلم ووٹروں میں سے
فقط ۱۴۴۰۰ یا فی صدی ۵۰ کا رائے دینے کی تکلیف گوارا کرنا یقیناً اس قدر
بیداری کا ثبوت نہیں ہے اور ۲۵ فی صدی کے فرق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں ووٹروں میں مسلمانوں کی نسبت فی صدی فقط تیس ہو وہاں سے
ایک مسلمان کا انتخاب اسی وقت ہو سکتا ہے کہ امیدواروں کے سیاسی اصولوں
کی بنا پر رائے دی جائے نہ کہ ان کے مذہبی عقائد کی بنا پر۔ اگر یہ نہیں تو ایک مسلمان
کے انتخاب کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر مسلمانوں کی نسبت ۴۰ فی صدی بھی ہو
تب بھی کچھ امید کی جا سکتی ہے کہ دو غیر مسلم امیدواروں کی جنگ میں ایک مسلمان شاید
بازی جیت لے جائے۔ مگر ۳۴ فی صدی سے کم نسبت ہو تو ایک مسلمان کی کامیابی

کی توقع شکل ہی سے کی جا سکتی ہے کیونکہ ۶۰ فی صدی ووٹ سے زیادہ غیر مسلموں کو حاصل ہوں گے اور بالکل برابر تقسیم بھی ہو جائیں تب بھی ۳۳ فی صدی یا اس سے کم ووٹ رکھنے والے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا لیکن بہت ہی کم ایسے صوبے ہندوستان میں ہیں جہاں مسلمانوں کی نسبت دہلی کی طرح ۳۰ فی صدی بھی ہو اور اگر غیر مخلوط اور خاص حلقہ ہائے انتخابی آج بالکل نہ رکھے جائیں اور مسلمانوں کے لئے نشستیں بھی مقرر نہ ہوں بلکہ انتخاب مخلوط اور مقامی ہی ہوں جیسے کہ برطانیہ اور دوسرے ملکوں میں ہوتے ہیں اور مذہبی اور ملی تعصبات کا وہ رنگ ہو جو آج دہلی اور دہلی ہی کیا تقریباً ہر حصۂ ملک میں نمایاں ہے تو مسلمان سوائے ان صوبوں کے جہاں ان کی نسبت ۵۰ فی صدی یا اس سے زیادہ ہے انتخاب کی کوئی توقع نہیں رکھ سکتے۔

لارڈ اولیور اس مزدور فرقے کے سابق وزیر ہند جس سے اکثر ہندوستانی بیاین ہندوستان کے لئے کچھ بھلائی کی توقع رکھتے ہیں حکومت ہند پر مسلمانوں کی ناواجب طرفداری کا الزام لگاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ یہ حکومت ہند ہی کسی انگریز سے کچھ لے کر کسی ہندوستانی کو اس کا حق دلانے والی ہے نہ برطانیہ کا کوئی سیاسی فرقہ چاہے وہ "مزدور" ہی کیوں نہ کہلائے۔ "ہندر بانٹ" البتہ ہو سکتی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہتی ہے کبھی ہندو کے حق میں سے مسلمان کو کچھ دے دیا جاتا ہے اور کبھی مسلمان کے حق میں سے ہندو کو اور اسی طرح سکھ وغیرہ کی بھی حالت ہے اور جس طرح کبھی ضلع کا کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر ایک ملت کا بظاہر طرف دار ہوتا ہے اور پولیس سپرنٹنڈنٹ دوسری ملت کا اور اسی طرح گورنر وکمشنر بالکل اسی طرح برطانیہ کی کنسرویٹو اور لبرل پارٹیاں بھی بظاہر ہندوستان کی ایک نہ ایک ملت کی طرف دار ہوتی آئی ہیں۔



[illegible] ور انحطاط ہے اور اس کی جگہ لیبر پارٹی نے لے لی ہے
ہندوستان کو اس [illegible] کچھ فیض پہنچنے والا نہیں اور ہندوستان کی ملتوں میں آج
بھی [illegible] اسی طرح جاری ہے جس طرح پہلے جاری تھی۔ البتہ مسلمانوں کو
یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک وہ مسلمان ہیں اور ان کی حد نظر ہمالیہ کی چوٹیوں اور بحر ہند تک
نہیں بلکہ انھیں ہندوستان کے باہر بھی کلمہ گویان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ساتھ
برادرانہ تعلق ہے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونا ان کے لئے مذہباً لازمی اور
عقل و تجربے کی بنا پر بقائے دین و ملت کے لئے ضروری ہے، تب تک نہ برطانیہ
نہ کوئی اور استعماری حکومت ان سے راضی ہو سکتی ہے۔ اور ”ولن ترضی عنک
الیہود و النصاری حتی تتبع ملتہم“ نے جو قطعی حکم لگا دیا ہے وہ تا قیامت غلط ثابت
نہیں ہوگا۔ اگر ہم ان ملتوں کا اتباع کرنے لگیں گو وہ دنیوی ہی ہو دینی نہ بھی ہو
تو یہ ہم سے راضی ہو سکتے ہیں لیکن اگر ہم اسلامی طریقے پر چلیں اور ان کی غلامی کی
زنجیروں سے آزاد رہنا چاہیں تو ہمیں ان کی مخالفت سے ہر قدم پر سابقہ پڑے گا۔
نام کے لئے ”برطانیہ“ کا مزدور فرقہ استعماری پالیسی کا بھی دشمن ہے اور سرمایہ داری
کا بھی لیکن مصر میں جو کچھ ہوا اسے سر آسٹن چیمبرلین نے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی پالیسی
کا اتباع بتایا! اور موصل کے متعلق مسٹر ٹامس ریلوے کے ایک قلی کی پالیسی اس قدر
استعماری اور سرمایہ داری کی پالیسی تھی جس قدر ان کے جانشین کرنل ایمیری کی
پالیسی ہے۔

پھر خود ہندوستان میں لارڈ اولیور اور ”رامجی“ میکڈانلڈ ہی نے تو اس
آرڈیننس کو بنگال میں اجرا کی اجازت دی تھی جو مشہور لعنتی ”رولٹ بل“ کا نوزائیدہ
بچہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے لئے سب یکساں ہیں اور بقول برطانوی شاعر
ٹینی سن کے ”جیک“ (ہماری اصطلاح میں نتھو خیرا) اپنے شراب خانے کی

منچ پر بیٹھا ہوا اتنے ہی جوش ہوتا ہے جتنے کہ زار اپنے تخت پر بیٹھ کر ہوا کرتا ہے
(یا اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہوا کرتا تھا) ہمارے لئے سب یکساں ہیں اور سب ہندوؤں
سے بھی زیادہ مسلمانوں کے دشمن ہیں اس لئے کہ ہندوؤں کے پاس صرف ایک
نیپال ہے اور وہ بھی انگریزی سایۂ عاطفت میں اور مسلمانوں کے ابھی ترکی،
ایران اور افغانستان وغیرہ ہیں اور مصر و مراقش و تونس، عراق و شام و فلسطین
و یمن و حجاز وغیرہ ۔ ہم بھی کچھ نہ کچھ جان رکھتے ہیں بالکل بے جان نہیں ہو گئے
ہیں اگر مجھے اس کا یقین نہ ہوتا اور میں سمجھتا کہ لارڈ اولیور یا لارڈ برکن ہیڈ یا ویاوش
جیسے مسٹر لائڈ جارج ہی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں تو میں ضرور پوچھتا
کہ آپ نے دہلی کے اس تازہ انتخاب سے کیا نتیجہ نکالا۔

پنڈت مدن موہن مالوی گو وہ بھی "جگت بھگت" بن کر خدا کی وحدت
اور تمام نوع انسانی کی اخوت کا ضرور ذکر فرما دیتے ہیں، اپنے مذہبی غلو تعصب
اور تنگ نظری میں مشہور ہیں اور بظاہر ان کا خیال ہے کہ ویدوں اور پرانوں
کے ایک ایک حرف کے مطابق آج بھی لوگ زندگی بسر کر سکتے ہیں اور انسان
صرف اسی طرح شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس پر
بھی قانع ہیں کہ برطانوی حکومت ابھی ہندوستان میں قائم
رہے کیونکہ گو مان بھی لیا جائے کہ وہ "برکات" سے معرا ہے تب بھی ہنود کو مسلمانوں
کے پنجۂ ظلم و ستم سے وہی بچا سکی ہے اور وہی اب بچا سکتی ہے اس سے بس
اسی کا مطالبہ کیا جائے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہنود کو زیادہ عہدے و اختیارات
دے اور گو شہروں کی سڑکیں ہندوؤں کے باجے گاجے اور مورتیوں کے روزانہ
کے جلوسوں کے لئے بلا کسی قید کے کھلے ہیں تاہم مسلمانوں کے واسطے برس میں
میں تین دن بھی قربانی کی گایوں کے لئے وہی سڑکیں کھلی نہ چھوڑی جائیں۔

مالوی جی ۱۹۱۹ء کی کانگریس کے بعد سے حقیقتاً کانگریس سے علیحدہ ہو چکے تھے اور گو مذہبی تعصبات کی بنا پر وہ مہاراشٹر کے کٹر سے کٹر سیوا جی پرست برہمن سے بھی زیادہ مسلمانوں کے دشمن ہوں مگر وہ تلک مہاراج کے سیاسی چیلے نہ تھے بلکہ گوکھلے سے بھی کہیں زیادہ نرم تھے اور یہ کہنا زیادہ ہو گا کہ وہ تلک مہاراج کے ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ دوبارہ کانگریس میں شریک ہونے کے بعد سے کانگریس کی شرکت کے اہل نہ تھے۔ لیکن لالہ لاجپت رائے تو وہ بزرگ ہیں جن کے والد بزرگوار قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے اور غالباً انھیں بھی اس کی تعلیم دی تھی۔ بہر کیف موجودہ ہندو دھرم کی بے شمار قیود سے وہ ہمیشہ آزاد رہے اور آج بھی انشاء اللہ آزاد ہیں۔ بہر صورت کی کانگریس میں جو جوتیوں میں دال بٹی تھی تو انھیں کے انتخاب صدارت کے جھگڑے میں بٹی تھی۔ وہ تلک مہاراج کی طرف سے صدارت کانگریس کے امیدوار بنائے گئے تھے۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" لالہ جی کی سیاسی بہادری کا تو کلکتہ اسپیشل سشن میں کافی مظاہرہ ہو چکا تھا اور ناگپور میں بھی لوگوں کو ان کے اوصاف حمیدہ سے کافی آگاہی ہو چکی تھی تاہم وہ تان کو اپریشن اور نان کوآپریشن کے رزولیشن کی انھوں نے دھوم دھڑکے سے تائید فرمائی تھی۔ جب مالوی جی مہاراج شملہ کی "شانتی کٹی" میں براجتے تھے لالہ جی جیل خانے میں سرکار کے معزز مہمان تھے اور گو ان کی خاطر تواضع اور قیدیوں سے زیادہ کی گئی اور وہ قبل از وقت رہا بھی کر دیے گئے اور انتخاب اسمبلی کے لئے ان کی امیدواری حکومت نے منظور بھی کر لی حالانکہ غریب گردھاری لال ابھی تک راندۂ درگاہ ہیں تاہم حکومت کی نظر کم از کم مالوی جی کے مقابلے میں تو ان سے پھری ہوئی تھی۔ یہ دین میں اگر صلح کل مسلک نہ بھی رکھتے تھے تب بھی آزادہ رو ضرور تھے اور دنیا میں اپنی حب الوطن کے بل بوتے پر اگر "عشق تیر دو مشنہ" کے امتحان میں خود طلب گار مرد نہ ہے پورے

بھی اترے ہوں تب بھی اتنے مرد نبرد تو ضرور تھے کہ فقط وجگی میں نہ مرگئے تھے بلکہ
قید کا ایک بڑا حصہ کاٹ آئے تھے۔

جو لوگ ع "خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر" وہ تو نہ ان کے
نان کوآپریشن ہی کے قائل ہوئے تھے نہ ان کی شرکت سوراج پارٹی کے اور خوب
سمجھتے تھے کہ جس طرح انھوں نے مہاتما گاندھی کو چھوڑا تھا اسی طرح یہ موتی لال
جی کو مسلمانوں میں گندا کرکے سوراج پارٹی کو چھوڑ کھڑے ہوں گے تاہم گذشتہ
ہندو مہاسبھا کے جلسے منعقدہ دہلی میں تو انھوں نے سوراج پارٹی کے لیڈر اور پارٹی
کے ایک بڑے حصے کو بے وقوف بنایا اور کہا کہ کانگریس کے ہوتے ہوئے ہندو
مہاسبھا انتخابات میں حصہ لینے کی ہرگز اہل نہیں ہے لیکن یہ ساری کانگریس نوازی
اور وطن پرستی ولایت سے واپسی پر جہاں آپ حکومت کے صرف سے گئے تھے،
ختم ہوگئی اور کھڑے ہونے کی بھی ضرورت نہ تھی اور بے کھڑے ہوئے ہی لالہ جی پکے ہندو
اور ہندو مہاسبھا کے سب سے بڑے گرو نکل آئے۔

اس سے بڑھ کر کانگریس کے ساتھ کیا دغا ہوسکتی تھی کہ کانپور تک میں
موتی لال جی اور سوراج پارٹی کے ساتھ موافقت کی۔ دہلی میں آل انڈیا کانگریس
کمیٹی کے جلسے میں "واک آؤٹ" کی مخالفت نہ کی اور سب کے ساتھ نکل آئے
اور جب موتی لال جی تک اسکین کمیٹی سے علیحدہ ہوگئے تو حکومت کے خرچ سے
جنیوا گئے (گو اور جگہ سے بھی کچھ مصارف وصول کئے گئے) اور واپسی پر کانگریس
کے امیدواروں کی مخالفت کے لئے کھڑے ہوگئے اور غضب خدا کا ایک "اینٹی
کانگریس پارٹی" کو انڈیپنڈنٹ کانگریس پارٹی کا لقب دیا۔

خداوند کریم کو اس دغا و غداری، مکر و فریب کا بھانڈا پھوڑنا تھا۔ وہ
دہلی کے انتخاب میں ۲۹ اکتوبر کو پھوٹ گیا۔ یہ سمجھ کر کہ لالہ شیو نرائن علاوہ وکالت

میں ایک حد تک نام آور ہونے کے ہندو کالج کے سیکریٹری رہ چکے ہیں اور اب دہلی یونیورسٹی میں خزانچی کے عہدے پر ممتاز ہو گئے ہیں ان کو ہندو مہا سبھا کی کمک پہنچائی جائے گی تو ان کی کامیابی یقینی ہے۔ ساڑھے پانچ ہزار ووٹروں کے مقابلے میں سولہ سترہ سو مسلمانوں کی ہستی ہی کیا ہے۔ لالہ شونرائن کو "انڈیپنڈنٹ کانگریس پارٹی" کی طرف سے امیدوار بنایا گیا مگر دہلی کے ہندو بھائی جو مسلمانوں کے تعصب کا ہمیشہ شکوہ کیا کرتے تھے اتنے "تنگ نظر" نکلے کہ ان کی متعصب نگاہوں میں لالہ شونرائن بھی "آدھا تیتر آدھا بٹیر" اور "نقل کفر کفر نباشد" صحیح ہے تو "دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا" نکلے اور ان کی نظر انتخاب ساری دہلی میں ہندو ملوائیوں اور ہندو سبھا چودھری روشن سنگھ کے بے داموں کے وکیل لالہ رنگ بہاری لال کے سوا کسی پر نہ پڑی اور دہلی نے جو ہندو مہا سبھا کی ایدھ علف اور لالہ جی اور مالوی جی کی جولانگاہ ہے یہ عجیب سماں دیکھا کہ گو لالہ جی، مالوی جی اور ہندو سبھاوالوں نے لالہ رنگ بہاری لال کو حقیر جانا اور "کل کا لونڈا" گردانا اور "طفل نابالغ" مانا اور سمجھا کہ "رو کر جھک مار کر" وہ خود ہی بیٹھ جائیں گے، مگر ۲۰ اکتوبر کے ووٹوں نے ان حضرات کو قائل کر دیا کہ شیخ سعدیؒ نے صحیح فرمایا تھا۔ ع

دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد

اُدھر تو لالہ رنگ بہاری لال نے عجب رنگ بہار دکھایا ادھر مسٹر آصف علی کو مسلمانوں نے ایک حیرت انگیز یک جہتی کے ساتھ مدد دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ لالہ جی کو دہلی چھوڑنا پڑا اور اس "انڈیپنڈنٹ کانگریس پارٹی" کے بانی نے ایک غیر کانگریسی کو اسی وقت ڈسمس لیا۔ لالہ شونرائن بہ جبر ہٹا دیئے گئے اور جو لالہ رنگ بہاری لال پہلے ہی سے ایستادہ تھے انھیں لالہ جی کی "تم بازی" نے اور بھی کھڑا کر دیا

جو ۲۰ کے دن گذرنے تک "طفل نابالغ" قرار دیا گیا تھا جب وہ رات گذار کر ۲۹ ر کی صبح کو اٹھا تو اس نے اپنے کو بالغ پایا اور لالہ جی نے سویرے منہ اندھیرے اس کے بلوغ پر مہر تصدیق کر دی۔ لالہ شیو نرائن گم سے کہ پہلے تو کبھی کانگریس کے ممبر بھی تھے، مگر اس غریب کو تو میونسپل کمشنری بھی اسی بار نصیب ہوئی تھی اور اس سے بھی ہوتے تک ایک الیکشن کی درخواست کے باعث محروم رہا تھا، کانگریس یا جھولے سے بھی نکل گیا تھا۔ سارا اعزاز و امتیاز یہی تھا کہ دہلی کے جلوسے کے لڑکوں کی بے معنی نعرے کے پیروی کی تھی۔ مگر واہ رے لالہ جی! بھان متی کے سوانگ والوں کی آپ کے سامنے کیا ہستی ہے! کبھی گرم، کبھی نرم، کبھی تان کر اوپر، کبھی لڑا بھی، ابھی کانگریسی تھے ابھی ہندو مہا سبھائی ہو گئے۔ یہی نہیں کہ خود ہر لحظہ و ہر آن سچ مچ بدلتے رہتے ہیں بلکہ اوروں کو بھی آناً فاناً بدل دیتے ہیں۔ ابھی رنگ بہاری لال پورے آزاد ہندو تھے ابھی "انڈیپنڈنٹ کانگریس پارٹی" والے کر دیے گئے "چٹ میری منگنی اور پٹ میرا بیاہ" تو سنا ہی تھا مگر یہاں تو حالت اس سے بھی عجیب تر تھی یعنی لالہ رنگ بہاری لال "طفل نابالغ" کی جوانی رنگ لائی تھی۔ وہ یکایک سن بلوغ ہی کو نہ پہنچ گئے تھے بلکہ صاحب اولاد ہونے کے سارے آثار نظر آتے تھے۔ لالہ جی اگر "انڈیپنڈنٹ کانگریس پارٹی" کو ہندو سبھا سے فوراً لگن نہ کر دیتے تو کیا کرتے۔ ۲۰ ر اکتوبر کی صبح سے زیادہ شبھ گھڑی اور ساعت کون بچا سکتا تھا، لیجیے منگنی بھی ہو گئی، گونا بھی ہو گیا اور دلھن رخصت کر دی گئی مگر بیاہ کے گیت ابھی ختم ہی نہیں ہوئے تھے کہ زچہ گیریاں شروع ہو گئیں اور دہلی کے تمام ہیجڑے اور بھانڈ "ماں کرے نند لال، سو میری زچہ" گاتے ہوئے لالہ جی اور ہندو مہا سبھا کے دروازے پر مبارک باد دیے اور اپنا انعام لینے کے لیے جا دھمکے۔

اس ساری تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ جب یہاں کی ہندو مہا سبھا نے دیکھا کہ لالہ شو نرائن کے انتخاب کی کوئی امید نہیں ہے اور کانگریس اور سوراج پارٹی کا نمائندہ ہندوؤں کی مخالفت کے باوجود بھی تقریباً خالص مسلم ووٹوں سے منتخب ہوا جا رہا ہے تو "انڈیپنڈنٹ کانگریس پارٹی" کے ڈھکوسلے کو چھوڑ سب دھرم رکھشا کے لئے ہندو مہا سبھا کا نام لے کر اکھاڑے میں اتر گئے۔ رات کے بارہ بجے جلوس نکالا گیا اور گو کانگریس کا جھنڈا ' غداری اور عیاری کی علامت ' اب تک ساتھ تھا مگر ہر ایک کے لب پر ایک ہی صدا تھی اور وہ ہندو دھرم کی رکھشا کی صدا تھی اور ہر حلق سے ہندو دھرم کی لاج کا نعرہ بلند کیا جا رہا تھا۔ لالہ شو نرائن تو صبح کو بمشکل تمام بیٹھ جانے پر راضی ہوئے اور جب پنڈت موتی لال نہرو کے دروازے پر انھیں کے کمرے میں شری میت کوہلی اور شری میت ویش بندھو گپتا وغیرہ نے پنڈت جی سے گستاخانہ گفتگو کی اور وہ ناراض ہو کر چلنے لگے تو اس وقت بھی یہی بابو شو نرائن باوجود لالہ جی سے قول ہارنے کے مذبذب سے معلوم ہوتے تھے مگر رات ہی کو ہندوؤں کو یقین دلایا جا رہا تھا کہ سمجھوتہ ہو رہا ہے اور لالہ شو نرائن بیٹھ جائیں گے۔ سب ہندو اب لالہ بہاری لال کے لئے ووٹ دیں اور مسٹر آصف علی کو کسی طرح منتخب نہ ہونے دیں۔

سب جانتے ہیں کہ میں ان انتخابات کو کس قدر فضول اور مضر سمجھتا ہوں اور نہ کوئی ہندو مجھ پر یہ الزام لگا سکتا ہے نہ کوئی مسلمان مجھے اس پر "مرحبا و آفریں" کہہ سکتا ہے کہ میں نے اس انتخاب میں مسٹر آصف علی کو کسی قسم کی مدد دی۔ وہ اگر معاف کریں تو میں اتنا اور بھی کہہ دوں کہ ان مسلمانان دہلی کا بہترین نمائندہ ہی نہیں سمجھتا اور ڈاکٹر انصاری اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب

کو ان کے لئے کہیں بہترین سمجھتا ہوں اور ہندو کی مخالفت ہی اگر مسلمانوں کی نمائندگی
کی دلیل ہے تب بھی فقیر محمد صاحب اور اسی قسم کے اور بزرگ دہلی میں موجود تھے
مگر مسٹر آصف علی وہ مسلمان تھے جن کے خلاف ایک ہندو کو بھی ان کی اسلام دوستی
کی بنا پر کچھ کہنا نہ چاہیے تھا۔ ان کو کانگریس نے اپنا نمائندہ بنایا تھا اور ان کے
مقابلے میں کوئی کانگریسی کھڑا نہ ہوا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں کانگریسی مسلمانوں نے
لالہ پیارے لال کے لئے جان توڑ کر کوشش کی تھی اور ہر شخص جانتا تھا کہ ۱۹۲۶ء کے
انتخاب میں ایک مسلمان کو نامزد کیا جائے گا۔ بیشک ایک مسلمان ہی امسال
کانگریس کی طرف سے نامزد کیا گیا اور وہ اسی نوے کانگریسی ہندو ہر طرح لائق تحسین
و تبریک ہیں جنہوں نے مسٹر آصف علی کو ووٹ دیے مگر خود آصف علی صاحب کا
تخمینہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور گو وہ مسلمانوں کی یکجہتی پر عش عش کرتے ہیں
لیکن خود ان کا قول ہے کہ غالباً ۵ مسلمانوں نے بھی ہندو امیدواروں کو ووٹ
دیا۔ یقیناً کانگریس کو بھی شکست ہوئی اور فتح "انڈپینڈنٹ کانگریس پارٹی" اور
لالہ جی اور مالوی جی کی ہوئی بلکہ ہندو تعصب اور تنگ نظری کو جو لالہ جی اور مالوی جی
کے تعصب اور تنگ نظری سے بھی بڑھ چڑھ کر نکلا اور جس کے ساتھ بالآخر وہ شیر و
شکر ہوگئے۔ حقیقی شکست مشترکہ قومیت اور مخلوط مقامی انتخاب کو ہوئی اور حقیقی فتح
اس نفاق و انتشار کو حاصل ہوئی جس کی موجودگی میں کوئی ذی عقل مسلمان غیر مخلوط ملی
حلقہ ہائے انتخاب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس سے میری سیاسی دور بینی کی داد ضرور
ملتی ہے مگر میرے دل میں بھی درد اٹھتا ہے۔ خدا ہم پر رحم کرے۔

(۵) کہاں سے کہاں

ہمدرد ۱۵ نومبر ۱۹۲۶ء

ہر شخص جانتا ہے کہ مہاتما گاندھی تشدد کے قائل نہیں اور اس سے بڑھ کر ناانصافی اور کیا ہوگی کہ اگر ہندوستان میں کہیں تشدد کا مظاہرہ ہو تو اس کے لیے مہاتماجی کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ اس زمانے میں جبکہ عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی حکومت اور غلامان حکومت میں سے ہر وہ شخص جو دو لفظ بول سکتا تھا ہر اس واقعے کو جس میں کسی ہندوستانی نے تشدد کا استعمال کیا ہو خواہ وہ خفیف سا خفیف یا شدید سا شدید ہی کیوں نہ ہو مہاتماجی کی تعلیم کی طرف منسوب کرتا تھا اور مہاتماجی کے ساتھیوں کے لیے جو بات سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی وہ یہ تھی کہ خود مہاتماجی "اقبال جرم" فرمایا کرتے تھے اور اخباروں اور حکومت کی رپورٹوں میں اس "اقبال جرم" سے بے حد ناجائز فائدے اٹھائے گئے۔

مہاتماجی کے "اقبال جرم" کے معنی حقیقتاً اس سے زیادہ نہ تھے کہ ان کے نزدیک سوراج کے یہی معنی ہیں کہ خود ہندوستانی ہندوستانیوں کے تمام افعال نیک و بد کے ذمہ دار بن جائیں اور سمجھے جائیں اور ہندوستان کے ارباب حل و عقد اس امر کی کوشش کریں کہ عوام کے افعال پر انھیں پوری طرح قابو حاصل ہو جائے اور ملک بھر میں اس قسم کے واقعات نہ ہونے پائیں جو ارباب حل و عقد کے مسلک کے خلاف ہوں۔ یہ معیار حکومت اس سے کہیں بلند تر ہے جو آج حکومت نے اپنے لیے بنا رکھا ہے۔

حقیقت میں حکومت ہی بہت سے ان فسادوں اور خرابیوں کی ذمہ دار

ہوتی ہے جو ہندوستان میں آئے دن رونما ہوتی رہتی ہیں لیکن حکومت اپنے آپ
کو ان کا ہرگز ذمہ دار بھی نہیں سمجھتی بلکہ ان کا الزام لوگوں ہی کے سر یا ان کے
پیدا کرنے والے خدا کے سر جس نے کالے آدمیوں کو گوروں کی طرح بے عیب
نہیں بنایا تھونپتی رہتی ہے چہ جائیکہ لوگوں کے واقعی عیوب کے لیے بھی اپنے کو
ذمہ دار ٹھہرائے۔ مہاتما جی کا یہ بلند معیارِ ذمہ داری اگر بعض لوگوں کے نزدیک
قابل عمل نہ بھی ہو تب بھی مہاتما جی کے اس قول کی صحت سے تو کسی کو انکار نہ
ہونا چاہیے کہ وہ تشدد بھی جو مہاتما جی کو ایک آنکھ نہیں بھاتا اس بزدلی اور جبن
سے لاکھ درجے بہتر ہے جس کا ہم ہندوستانی ہر روز ہزار جگہ مظاہرہ کرتے رہتے
ہیں۔ وہ امن و سکون کو دل سے چاہتے ہیں مگر زندگی کے، نہ موت کے امن و
سکون کو۔ وہ بار بار خود فرما چکے ہیں کہ باوجود اس نفرت کے جو مجھے تشدد سے
ہے میں ہر تشدد کو موجودہ قبر کے سکون اور جبن و بزدلی سے بہتر سمجھتا ہوں۔

ہندو مسلمانوں کے ناگوار تعلقات کے متعلق مہاتما گاندھی نے اپنے عملِ
جراحی اور اس کے باعث رہائی کے بعد اپنے قیام جوہو میں ایک طویل مضمون
تحریر فرمایا تھا جس کا ایک فقرہ ایک دو سال برابر بچے بچے کی زبان پر رہا۔ وہ یہ تھا
کہ "ہندو بزدل ہے اور مسلمان ہیکڑی یا زبردستی کرنے والا"۔ اس قسم کے جملے کسی
قدر حقیقت پر کیوں مبنی نہ ہوں ساری حقیقت اپنے اندر نہیں رکھتے اور جو صاحب فہم
و عقل ہوتے ہیں وہ ان کو حقیقی حدود سے باہر نہیں کھینچا کرتے۔ اس جملے میں یقیناً
ایک بڑی حقیقت مضمر تھی لیکن وہ حقیقت بھی محدود تھی، غیر محدود نہ تھی اور اگر ہندو
اور مسلمان اس حقیقت کو اس کی حدود کے اندر ہی رکھ کر اپنی اپنی اصلاح کرتے
تو ہندوستان کے دن کب کے پھر گئے ہوتے اور بجائے آج کے نفاق و شقاق
اور ان کے لازمی نتیجے غیر کی غلامی کے آج ہندو مسلمان دونوں باامن اور بہادر

ہوتے اور ملک میں فتنہ و فساد کی گرم بازاری نہ ہوتی بلکہ ہر طرف اتحاد و اتفاق کی بہار نظر آتی اور جو حقیقی بزدلی آجکل کی 'بہادری' میں صاف نظر آتی ہے اس کا پتہ نہ ہوتا اور ہندوستان کی سب ملتیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر حقیقی بہادری کا ثبوت دیتی ہوتیں اور ہماری پر امن جنگ میں ہندو اور مسلمان، سکھ اور پارسی، یہودی اور عیسائی ایک ہی صف میں دوش بدوش کھڑے ہو کر رہتے ہوتے اور آزادی کی فتح ابھی نہیں ہوئی ہوتی تو ہونے کے قریب ہی ہوتی۔

میں ایک مسلمان ہوں اور مسلمانوں کی اخوت میرے ایمان کا جزو ہے۔ میں مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہوں اور نہیں چاہتا کہ انھیں کسی ملت کے ہاتھوں ذرا سا بھی گزند پہنچے خواہ وہ ملت ہنود کی ہو یا نصاریٰ کی۔ لیکن آزادی بھی میرے ایمان کا اسی طرح جزو ہے جس طرح کہ 'اخوت' اور اگر ہنود حقیقتاً بزدل ہیں اور اسی بزدلی کے باعث ہندوستان کو آزادی نصیب نہیں ہوتی تو میں ہرگز نہیں چاہ سکتا کہ وہ بزدل ہی رہیں اور خود بھی ایک ذلیل اور حقیر ملت بنے رہیں اور ہندوستان کو بھی آزادی کی نعمت عظمیٰ سے محروم رکھیں۔

سنا ہے کہ بھینس جب حملہ کرتی ہے تو ڈر کر کرتی ہے۔ بعض سر برآوردہ ہنود کے لئے "افغانی ہوّا" اس قدر خوف اور اندیشے کا باعث ثابت ہوا ہے اور ہندو پریس میں اس پر اس طرح بار بار مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں کہ بہاتما جی کا خیال کہ ہندو بزدل ہیں کچھ ایسا غلط نہیں معلوم ہوتا اور ہندوؤں کا ڈرنکالنا مسلمانوں کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بزدلی اور جبن وہ لعنت ہے کہ کسی انسان میں اس کا ہونا کسی دوسرے کو گوارا ہرگز نہ ہونا چاہیئے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے اور نیز اسلام کو یورپ کے استعماری خطرے سے بچانے کے لئے یہ اور بھی ضروری ہو گیا کہ اگر فی الواقع ہنود میں جبن اور بزدلی موجود ہو تو اسے سب

ہندوستانی ملتیں اور بالخصوص مسلمان ان میں سے نکالنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح زبردستی اور ہیکڑی بھی ایک لعنت ہے اور اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر مسلمانوں میں یہ فی الواقع موجود ہو تو اسے سب ہندوستانی ملتیں ان سے لے نکالنے کی کوشش کریں، کیونکہ یہ بری عادت امن عامہ کے قیام اور اطمینان کے حصول کے منافی ہے اور جب تک اس کا کامل استیصال نہ ہوگا ہم میں یکجہتی ہرگز پیدا نہ ہوگی اور ہم آزادی ہند کے دشمنوں کا مقابلہ ہرگز نہ کرسکیں گے اور اپنے وطن عزیز کو غلامی سے ہرگز نہ نکال سکیں گے۔

مہاتما جی نے کئی بار زبانی گفتگوؤں میں اپنے خیال کی تشریح اور توضیح اس طرح فرمائی تھی کہ انھوں نے ریل میں بارہا دیکھا کہ ایک مسلمان نے اپنے حق سے کہیں زیادہ جگہ ریل کے سفر میں لے لی اور ہندو مسافروں کی حق تلفی کی اور جب ان مسافروں نے شکایت کی تو ان سے سخت کلامی کی اور مار پیٹ کے لئے بھی آمادگی ظاہر کی جس کے باعث ہندو مسافر چپ ہوگئے اس لئے کہ ان میں بزدلی اور جبن کا عنصر زیادہ تھا۔ بالخصوص اس باب میں مہاتما جی نے سرحدی پٹھانوں اور افغانوں کی زیادہ شکایت کی۔ یہ شکایت بے جا نہیں اور آج کی کشاکش میں کوئی مسلمان اس سے لاکھ انکار کرے مگر یہ الزام بعض مسلمانوں کے نزدیک تو ان کی ملت کی مدح سرائی کے مرادف ہے۔ لیکن ایک حق کوش مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کی بے جا حمایت ہرگز نہ کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان واجب الاذعان ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی ہر حالت میں مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، اور ایک ظالم مسلمان بھائی کی بس یہی مدد ہے کہ اس کو اس کے ظلم سے روکو۔ اگر مسلمان مسافر ہندو مسافروں کی کسی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسی حرکات سے انھیں باز رکھیں

ان ہی نقائص کی اصلاح کا جن کی طرف مہاتما جی نے اشارہ کیا ہے بہترین طریقہ یہی تھا کہ ہندو بزدلی کی خو اور مسلمان زبردستی کرنے کی عادت کو چھوڑنے کی کوشش کرتے، لیکن یہ اصلاح کا ہرگز طریقہ نہیں ہے کہ ہندو اپنا ملی عیب چھوڑ کر مسلمانوں کا ملی عیب اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگیں، مہاتما جی نے جہاں پر فرمایا تھا کہ تشدد کرنے سے بڑھ کر اگر کوئی عیب ہے تو وہ بزدلی ہے، وہیں انھوں نے یہ بھی بارہا فرمایا ہے کہ بزدلی سے بڑھ کر زبردستی اور ہیکڑی کرنے کا عیب ہے اور وہ ایک بزدل ملت کا فرد بننا اس سے بہتر سمجھتے ہیں کہ ایک ظالم ملت کے فرد بن جائیں۔ مگر افسوس ہے کہ جب سے یہ تاریخی جملہ کہ "ہندو بزدل ہے اور مسلمان زبردستی اور ہیکڑی کرنے والا" مہاتما جی کے قلم سے نکلا ہے، اس دن سے بہت سے ہندو دے اس کے یہی معنی سمجھے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو بزدل بنا دیں اور خود زبردستی اور ہیکڑی کرنے والے بن جائیں۔ فی الواقع مہاتما جی یا کسی اور صحیح الخیال شخص کے نزدیک نہ سب ہندو بزدل تھے نہ سب مسلمان زبردستی اور ہیکڑی کرنے والے، اور یہ تو واقعہ ہے کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے بنگال سے بزدل دلت پرست ہندو تجارت پیشہ سب سے زیادہ ہیکڑی کرنے والے ہوتے ہیں اور ریل کے سفر میں ہر شخص کو کبھی نہ کبھی ایسا اتفاق ضرور پیش آیا ہوگا کہ اس قسم کے ایک ہندو نے دوسروں کی حق تلفی کی ابتدا کی ہو اور جب شکایت کی گئی ہو تو بڑے جوش کے ساتھ جواب دیا ہو کیا ہم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے، کیا ریل تیرے باپ کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جوں ہی سخت کلامی سے نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی ہو تو دو ایک بار اسی جوش سے کہا ہو کہ .... اب کے تو مار اور بالآخر یہ صاحب پٹ پٹا کر خاموش ہو گئے ہوں۔

میں نے حال ہی میں ایک نہایت معزز اور محترم خاندان کی ایک نہایت

ہی شریف اور رنجاں مرنج مسلمان خاتون سے سنا تھا کہ آٹھ دس جوان ہندو خواتین نے ریل کے سفر میں ان سے اور ان کی ساتھیوں سے نہ صرف سخت کلامی کی بلکہ وہ ہاتھا پائی تک پر آمادہ نظر آئیں۔ میرا ارادہ ہوا کہ اس کے متعلق کچھ لکھوں اس لئے کہ گو اس قسم کا ایک ہی واقعہ میرے علم میں آیا تھا تاہم جس طرح اڑتے ہوئے تنکے سے ہوا کا رخ معلوم ہو سکتا ہے اسی طرح اس واقعے میں بھی مجھے ایک عالم گیر وبا کے آثار نظر آتے تھے۔ تاہم اس خوف سے کہ مبادا میرے کچھ لکھنے سے تعلقات کی ناگواری اور بھی بڑھ جائے میں نے کچھ نہ لکھا۔ لیکن حال ہی میں ایک دوسرا واقعہ بالکل اسی قسم کا ظہور پذیر ہوا اور میں نے ضروری سمجھا کہ اب مہر سکوت کو توڑوں اور جہاں میں مسلمانوں کو ہمیشہ صبر و سکون اور ضبط کی نصیحت کرتا رہتا ہوں وہاں اپنے ہندو بھائیوں سے بھی اپیل کروں کہ وہ بھی اپنے ہم مذہبوں کو صلاح نیک دیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مرد تو بہت سی نیک خصلتوں کو خیرباد کہہ بیٹھے مگر ہندوستان کی عورتیں اب تک شرافت کی روایتوں کی محافظ ہیں۔

مولانا حالی نے اس بے مثل نظم میں جو علی گڑھ کالج میں ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ تعلیم نسواں کے ایک جلسے میں پڑھی گئی تھی جس کا عنوان "چپ کی داد" تھا اور جس کی ابتدا اس مصرع سے ہوئی تھی کہ ع

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا میں عزت تم سے ہے

بالکل صحیح فرمایا تھا کہ ؎

ست والے تھے دنیا میں جو ست بیچھے اپنا کب کے
لے دے کے اب ستونتیو! دنیا میں ست اب تم سے ہے

افسوس کہ بجائے اس کے کہ ہم اپنی عورتوں سے شرافت کا سبق سیکھتے، ہم اپنے عیوب کو ان میں بھی رواج دے رہے ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہندو اور مسلمان

کہیں دونوں اس عزت کو بھی نہ کھو بیٹھیں جو لے دے کے ان کی عورتوں میں باقی ہے۔ اگر مسلمانوں کے عیوب مسلمان عورتوں میں نظر آنے لگے اور ہندوؤں کے عیوب ہندو عورتوں میں تو ہماری رہی سہی شرافت کا بھی خاتمہ ہے اور پھر ہم سر پکڑ کر روئیں گے، مگر کھوئی ہوئی عزت و شرافت پھر ہاتھ نہ آسکے گی۔ میں دونوں ملتوں سے دست بستہ عرض کروں گا کہ میری اس تحریر کو تعصب پر مبنی نہ سمجھیں بلکہ ایک شکستہ دل کی صدا سمجھ کر اس پر توجہ فرمائیں۔ میں نے نان کواپریشن کی تحریک کے سلسلے میں ہندوستان میں جو دورے کئے ہیں ان میں ہزاروں ہندو ماؤں اور بہنوں نے میری اور میری بیوی بچوں کی وہ خاطر تواضع کی ہے کہ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا، لیکن ھل جزاء الاحسان الا الاحسان (احسان کا بدلہ سوائے احسان کے کیا ہو سکتا ہے) میں ہرگز احسان فراموشی نہیں کرتا، بلکہ اس تحریر کے ذریعے سے صرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ اپنی ہندو بہنوں کو یاد دلاؤں کہ ان کا بہترین زیور ان کی وہ شفقت و محبت ہے جس نے ہم سب کے دلوں کو موہ لیا تھا، اور مسلمان مرد یا ہندو مرد کچھ ہی کیوں نہ کریں ان کا شعار وہی ہونا چاہیے جو اب تک رہا ہے۔ ایک شاعر نے خوب کہا ہے ؎

نازک کلائیاں مری توڑیں عدو کا دل

میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

(۶) عورتیں بھی میدان میں اتر آئیں

ہمدرد ۲۶ نومبر ۱۹۲۶ء

کل میں نے "ہمدرد" میں جن دو واقعات کی طرف اشارہ کیا تھا جن سے ہمیں عبرت حاصل کرنا چاہیے آج ان کی تفصیل دیتا ہوں۔

بیگم صاحبہ ریاست .... معہ اپنے چند رشتے دار خواتین اور ماماؤں کے کلکتے سے روانہ ہوئیں۔ اس گاڑی میں بارہ یا چودہ ہندو خواتین بھی تھیں جنھوں نے ابتدا ہی سے کوشش کی کہ یہ مسلمان خواتین اس گاڑی میں داخل نہ ہونے پائیں لیکن جو مرد ان کے ساتھ تھے وہ انھیں اس گاڑی میں تو بٹھا گئے اور کہہ گئے کہ اگر یہاں جگہ کم ہے تو اگلے اسٹیشن پر کسی دوسری گاڑی میں بٹھانے کا انتظام کر دیا جائیگا۔ جب گاڑی چھوٹی تو ان مسلمان خواتین نے اپنے بیٹھنے کی جگہ نکالنا چاہی مگر ہندو خواتین نے جگہ دینے سے بالکل انکار کیا اور سخت کلامی شروع کر دی۔ بیگم صاحبہ کی ایک عزیزہ جوان کے ہمراہ تھیں ان کا اکلوتا اٹھارہ برس کا ایک لڑکا جو ایک تالاب کی سیڑھیوں پر نہا رہا تھا پاؤں پھسلنے کے باعث تالاب میں گر کر ڈوب چکا تھا۔ بیگم صاحبہ یہ خبر پا کر اپنی عزیزہ کی تعزیت کرنے اور انھیں اپنے ہمراہ لانے کی غرض سے کلکتے تشریف لے گئی تھیں۔ انھوں نے اس دردناک واقعے کا ان خواتین کے سامنے ذکر کیا اور فرمایا کہ بہنو ہم لوگ غم زدہ ہیں ہمارے دل دکھے ہوئے ہیں، ہم یوں بھی لڑائی جھگڑا کو پسند نہیں کرتے نہ ہمارے دلوں میں آج کسی سے لڑنے کی سکت ہے۔ ہم تم سے تھوڑی ہی سی جگہ مانگتے ہیں، ہمیں ایک کونے میں بیٹھ جانے دو اور ہمیں زیادہ نہ ستاؤ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ ان

شکستہ دل خواتین کی دردانگیز داستانیں بھی کچھ اثر نہ کیا اور یہ ہندو خواتین انھیں چلتی گاڑی میں سے گرا دینے کی دھمکی دینے لگیں۔ اس خوف سے کہ کہیں واقعی یہ تنگ دل عورتیں انھیں گرا ہی نہ دیں بیگم صاحبہ نے دروازے میں اپنا ایک صندوق اڑا دیا تاکہ دروازہ کھل ہی نہ سکے اور جب یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا تو بیگم صاحبہ کی ساتھیوں میں سے ایک نے کہا کہ ٹھہرو، اسٹیشن آنے دو ہم ابھی اپنے ساتھ کے مردوں کو بلاتے ہیں۔ اس پر یہ ہندو خواتین فرمانے لگیں کہ تم کتنوں کو بلا سکتی ہو؟ تمھارے ۷ کروڑ ہیں تو ہمارے ۲۲ کروڑ ہیں۔ تمھیں اور تمھارے مردوں کو سب کو بھون ڈالیں گے۔ وہ دن دور گئے جب ہم دب جایا کرتے تھے، اب ہم تم مسلمانوں سے ہرگز دبنے والے نہیں۔

بیگم صاحبہ ایک صبر رضیہ ہیں جن کی خاندانی شرافت اور طبیعت کی افتاد انھیں ہرگز اجازت نہ دیتی تھی کہ اس قسم کے جھگڑوں میں پڑیں اور تو تو، میں میں یا ہاتھا پائی کریں۔ انھوں نے ابتدا ہی سے اس سے بچنا چاہا مگر سب کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ وہ ہندو مسلمانوں کے آئے دن کے جھگڑوں کا حال سنا کرتی تھیں اور افسوس کیا کرتی تھیں کہ ہندو مسلمانوں کو کیا ہو گیا۔ جو لڑائیاں کبھی پہلے پچاس برس میں ایک بار بھی نہ ہوتی تھیں وہ اب ہر برس کیا ہر مہینے ہونے لگیں۔ لیکن ان کو اس کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان جیسی پردہ نشین خاتون خود کسی ایسے جھگڑے میں مبتلا ہوں گی۔ ان کے ساتھ کی ایک خاتون کے محض اس کہنے پر "ٹھہرو، اسٹیشن آنے دو، ہم بھی اپنے ساتھ کے مردوں کو بلاتے ہیں" سات کروڑ اور بائیس کروڑ کی بحث چھڑ جانے سے وہ ہکا بکا ہو کر رہ گئیں اور انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں واقعی ہندو مسلمانوں میں فساد صرف ان کے ریل گاڑی میں تھوڑی سی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کے باعث نہ برپا ہو جائے اور ان کا نام سب اخباروں

میں چھپتا ہو۔ (انھیں معلوم نہیں ہے کہ میں واقعے کو درج اخبار کر رہا ہوں اور مجھے خوف ہے کہ وہ میری اس تحریر کو بھی اسی بنا پر پسند نہ کریں گی۔) ان پر اس صریحاً خلافِ توقع واقعے نے بڑا اثر کیا اور جن معزز خاتون نے شاید ساری عمر میں ایک بار بھی کسی برابر والی کی بھی منت سماجت نہ کی ہو اس نے الٹا اپنے ساتھی ہی کو ڈانٹا اور ہاتھ جوڑ کر (استعارۃً نہیں بلکہ واقعتہً) ان ہندو عورتوں سے کہا کہ بی بیو، ان سے قصور ہوا معاف کرو، تم ہم سے جہاں بیٹھنے کو کہو گی ہم وہیں بیٹھ جائیں گے۔ اتنا لمبا سفر نہ ہوتا تو ہم کھڑے کھڑے ہی چلے جاتے، نہ ہم اپنے مردوں کو بلائیں گے نہ کسی سے شکایت کریں گے۔ تم اپنی مہربانی سے ہمیں جتنی جگہ دیدو گی ہم اسی پر قناعت کریں گے اور صبر و شکر کرکے بیٹھ جائیں گے۔ اس طرح یہ قصہ ختم ہوا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ قصے 'کہاں'، 'کب'، اور 'کس طرح' ختم ہوں گے۔

میں نے کل عرض کیا تھا کہ میں اس قصے کے شائع کرنے میں بہت متامل تھا اور کچھ تو بیگم صاحبہ ...... کے خیال سے اور کچھ اس وجہ سے کہ مبادا ہندو مسلمانوں کے ناخوش گوار تعلقات اور ناخوش گوار ہو جائیں میں نے اب تک اس کو شائع نہیں کیا تھا لیکن اس ایک ہی واقعے سے مجھے نہ صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ ہوا کا رخ کدھر ہے بلکہ آنے والے ایک بڑے اور سخت تباہ کن طوفان کا بھی پتہ چلتا تھا مگر جب میں نے وہ دوسرا واقعہ سنا جس کی تفصیل میں درج ذیل کرتا ہوں تو میں مجبور ہو گیا کہ اپنے ہم وطنوں کو متنبہ کر دوں کہ اس قسم کے واقعات سے عبرت حاصل کریں اور اس جنگ بین الملل کا جلد سے جلد خاتمہ کریں جو قریب ہے کہ ہماری عورتوں کی شرافت کا بھی ہماری ملکی عزت کی طرح خاتمہ کر دے۔

اودھ، روہیلکھنڈ ریلوے کے ایک اسٹیشن سے چند مسلمان خواتین اور

ایک ہندو خاتون ایک گاڑی میں سوار ہوئیں اور حسب معمول سابق یہ سب اخلاص و محبت کے ساتھ بات چیت کرتی چلی آئیں۔ لیکن مراد آباد کے اسٹیشن پر ان خواتین کی گاڑی میں ۹ اور ہندو خواتین داخل ہوئیں جو گنگا اشنان کے لئے گڑھ مکتیشر جا رہی تھیں۔ امروہہ کے اسٹیشن پر ایک مسلمان خاتون اسی گاڑی میں چڑھنے لگی۔ جوں ہی اس نے گاڑی میں قدم رکھا' ان ہندو خواتین نے اسے اس زور کا دھکا دیا کہ وہ پیچھے کو گر پڑی اور اگر اس کا شوہر پیچھے نہ ہوتا اور اسے سنبھال نہ لیتا تو اسے سخت چوٹ آتی جو مسلمان خواتین اس گاڑی میں تھیں انھوں نے پوچھا کہ آخر اس غریب کو کیوں دھکا دیا تو کہا کہ یہاں جگہ نہیں ہے اور فوراً گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ اس پر اس کے شوہر نے اصرار کیا کہ جگہ دو تو ان ہندو خواتین میں سے ایک نے فوراً اپنے پیر سے جوتی نکالی اور وہ اس غریب شوہر کے رسید ہی کر دی گئی ہوتی اگر ایک مسلمان خاتون جو گاڑی میں تھی اس جنگ جو ہندو خاتون کا ہاتھ نہ پکڑ لیتی۔

یہ مسلمان خواتین بیگم صاحبہ ریاست .... کی طرح نہ معمر تھیں' نہ ان میں اس قدر ضبط کا مادہ تھا اور وہ اس کی بھی پرواہ نہ کرتی تھیں کہ کہیں اخباروں میں ان کا ذکر آ جائے' انھوں نے اصرار کیا کہ اس مسلمان خاتون کو بھی گاڑی میں آنے دیا جائے اور ان میں سے ایک نے اس غریب کو اپنی جگہ دے دی اور خود کھڑی ہو گئی۔ مراد آباد سے سوار ہونے والی ہندو خواتین نے اس پر بھی سخت کلامی کا سلسلہ جاری رکھا اور ممکن ہے کہ یہ بڑھ کر ہاتھا پائی تک پہنچ جاتا' مگر جو ہندو خاتون ان مسلمان خواتین کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار ہوئی تھی اس نے اپنا کھانا پٹلی پر سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس مسلمان خاتون کو جس نے اپنی جگہ امروہہ سے سوار ہونے والی مسلمان بہن کو دے دی تھی اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس پر کوا س

کی بیٹریاں اس ہندو بہن پر گولہ باری کرنے لگیں۔ اس سے سب کہنے لگیں کہ کیا یہ تیری سگی تھی جو اس کے لئے تونے جگہ خالی کردی۔ اور پھر اس کا افسوس کیا گیا۔ مسلمانوں میں تو اس قدر اتفاق ہے کہ ایک مسلمان عورت کے لئے دوسری نے جگہ خالی کردی مگر ہندوؤں میں مطلق ایکا نہیں، دیکھو ایک ہندو عورت نے ہندو عورتوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ایک مسلمان عورت کو اپنا کھانا اٹھا کر اپنی بغل میں بٹھا لیا۔ پھر اشنان کے باعث ہندو مسافروں کی کثرت پر گھمنڈ کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ ابھی مسلمانوں کا خون ہو جاتا اور بار بار اس حسرت پاپوش رسانیدن کا بھی اظہار کیا جاتا تھا کہ ہائے میں اس مسلمان مرد کی جوتی سے خبر نہ لے سکی، میرے دل کو تو اس وقت چین آتا جب میں نے اس کی چندیا پر ایک جوتی رسید کی ہوتی۔ مسلمان خواتین جوان تھیں اور پر جوش تھیں مگر مہاتما گاندھی جیسے ہندو کے اخلاص و محبت کی گرویدہ تھیں اور ہزاروں ہندو خواتین ان سے اسی اخلاص و محبت کا سلوک کر چکی تھیں۔ اس ایک واقعے سے ان کے دلوں میں ہندوؤں کی نفرت پیدا ہونے والی نہ تھی، نہ وہ تشدد کی حامی تھیں کہ اس قسم کی گفتگو سن کر وہ ایک مسلمان مرد کے جوتی رسید کرنے کی خواہش مند ہندو عورتوں سے کہتیں کہ مردوں سے تو بعد میں جنگ کرنا پہلے ہم سے نبٹ لو۔ انھوں نے اسی پر اکتفا کیا کہ ان بہنوں سے کہہ دیں کہ واہ! آپ کیسی اچھی عبادت گذار ہیں کہ عبادت کی غرض سے گنگا جی کے اشنان کو تو جا رہی ہیں مگر دل میں اتنا بغض و کینہ بھرا ہوا ہے کہ مسلمان مردوں کے جوتیاں نہ مار سکنے پر دل ہی دل میں جلی اور بھنی جاتی ہیں!

میں ہندو اور مسلمان خواتین کا مقابلہ کرنا نہیں چاہتا۔ میرے لئے اس ہندو خاتون ہی کا جس نے اپنا کھانا اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور ایک مسلمان بہن کے لئے جگہ خالی کردی، ان ہندو خواتین سے مقابلہ کافی ہے جنھوں نے

ایک مسلمان بہن کو گاڑی میں قدم رکھتے ہی دھکا دے کر پلیٹ فارم پر گرانا چاہا، پھر اس کے شوہر کے جوتی لگانا چاہی اور جو مسلمانوں کے اس اتفاق پر رشک کرتی تھیں کہ ایک مسلمان بہن نے دوسری بہن کے لیے اپنی جگہ خالی کردی اور ہندوؤں کی اس "نا اتفاقی" پر نوحہ کرتی تھیں کہ ایک ہندو بہن نے اس مسلمان بہن کے لیے جگہ نکال دی۔

خدا مسلمانوں کا اتفاق تا قیامت قائم رکھے اور خدا ہندوؤں میں وہ "اتفاق" کبھی قائم نہ ہونے دے جو ایک ہندو بہن سے دوسری ظالم اور زیادتی کرنے والی ہندو بہنوں کے ساتھ کشمکش پات کرائے بلکہ خدا ہمیشہ اس "نا اتفاقی" ہی کو قائم رکھے جو پہلے ہندو مسلمانوں کو حق اور شرافت کی حمایت پر آمادہ کیا کرتی تھی۔ ہماری جنگ بین الملل اب مردوں سے نکل کر عورتوں تک پہنچ گئی ہے۔ خدا ہمیں عقل اور سمجھ دے کہ اس کے انجام پر غور کریں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار (اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔)

(۷) سوامی شردھانند جی کا قتل

اور

دونوں ملتوں کا امتحان

ہمدرد ۷ جنوری ۱۹۲۷ء

میں نے کوکناڈا کے سالانہ جلسہ انڈین نیشنل کانگریس کے موقع پر اپنے خطبہ صدارت میں جس کا ملک نے خاصا خیر مقدم کیا تھا، عرض کیا تھا کہ ہندو مسلم مناقشات کے موقعوں پر یہ سخت غلطی ہوتی ہے کہ ہندو حضرات مسلمانوں کو ان کے عیوب بتاتے ہیں اور مسلمان حضرات ہندوؤں کو ان کے عیوب جتلاتے ہیں۔ یہ صحیح طریقہ اصلاح ہرگز نہیں کیونکہ بجائے اپنی اصلاح کرنے کے ہر ایک ملت دوسری ملت پر اور برافروختہ ہوتی ہے۔ صحیح طریقۂ اصلاح یہ ہے کہ ہر ملت کی اصلاح کا کام اسی کے رہنماؤں پر چھوڑ دینا چاہیے ورنہ دوسری ملتوں کے کتنے ہی مصلح مشفق اپنی موعظت و پند، نصیحت و ملامت سے کام کو کچھ اور بگاڑ ہی دیں گے، فائدہ مطلق نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ:-

"کتنی ہی بار ہم نے دیکھا ہوگا کہ ایک محلے کے رہنے والے بچے ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے کھیلتے کسی چھوٹی سی بات پر آپس میں جھگڑنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد ہر بچہ اپنی ماں کے پاس دوڑا ہوا جاتا ہے اور اپنے ساتھ کے کھیلنے والے بچوں کی زشت خوئی کا الم ناک قصہ اپنی ماں کو سناتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی خوش خصالی کی تعریف

کے بھی پل باندھ دیتا ہے۔ سمجھدار مائیں ہمیشہ اپنے ہی بچے کے خلاف فیصلہ صادر کیا کرتی اور انھیں جھڑک دیا کرتی ہیں اور اس پر بھی ان کے بچے اپنے ساتھیوں کی شکایت کرتے رہتے ہیں تو انھیں حکم ملتا ہے کہ اچھا آئندہ ایسے شریر ساتھیوں کے ساتھ نہ کھیلا کرو! سڑک جو محلے کے بچوں کے لئے کھیل کا میدان ہوتی ہے اس کے بعد شکایت کرنے والے کے لئے شجر ممنوع قرار دے دی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے نیک خو شکایت کرنے والے دوست پر قید تنہائی بہت جلد گراں گذرنے لگتی ہے اور اپنے ساتھیوں سے چند دن کی علیحدگی ان کے گناہوں کو دھونا شروع کر دیتی ہے اور دوسرے تیسرے ہی دن وہ بالکل بخش دیے جاتے ہیں اور شکایت کرنے والا خود اپنی ماں سے اُن کی سفارش کرتا ہے اور ان کے ساتھ کھیلنے کی اجازت حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اس حصول اجازت کے ساتھ ہی سمجھدار ماں یہ بھی نادر شاہی حکم صادر کر دیا کرتی ہے کہ دیکھو پھر روتے ہوئے اور دوسروں کی شکایت کرتے ہوئے نہ آنا۔ یہ وہ طریقہ ہے جس سے محلے میں امن و صلح قائم ہوتی ہے۔ لیکن دنیا میں اگر سمجھدار مائیں ہیں تو ناسمجھ ماؤں کی بھی کمی نہیں بلکہ اکثریت ناسمجھ ماؤں ہی کی ہے۔ جوں ہی ایک ناسمجھ ماں کے پاس اس کا جگر گوشہ روتا، منہ بسورتا اور ساتھیوں کے جور و ستم کا گلہ لے کر ان کی ہمدردی ہی نہیں بلکہ ان کی امداد کا طالب ہو کر آتا ہے وہ پیٹ کی ممتا سے مجبور ہو کر اسے سینے سے لگاتی اور اس پر محبت اور درد کے آنسو گراتی ہے اور جب وہ جذبہ اپنی فطرتی انتہا کو پہنچ چکتا ہے تو پھر جذبۂ انتقام کی ابتدا کی باری آتی ہے۔ یہ ناسمجھ ماں دوڑی ہوئی اس شریر

بچے کی ماں کے پاس جاتی ہے جس نے اس کے فرشتہ خصلت نونہال پر اس قدر ظلم ڈھایا ہے اور اس سے شکایت کر کے خوب دل کے پھپھولے پھوڑتی ہے اور اشارے کنایے میں یہ بھی صاف ظاہر کرتی ہے کہ بچے کی شرارت اس خرابی تربیت کا نتیجہ ہے جس کی ذمہ دار شریر بچے کی ماں ہے۔ اس کا جواب سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ میرا بچہ تو شریر نہیں ہے تیرا ہی بچہ شیطان کے کان کاٹتا ہے اور بہوت ایسا کیوں نہ ہو جب اس کے ماں باپ خود شیطان کے بھی باوا ہیں پھر جنگ چھڑنے میں کیا دیر تھی؟

گالیوں اور کوسنوں کی توپوں کے دہانے کھل جاتے ہیں اور سات پشت تک ان کی زد میں آجاتی ہیں۔ اب کیا تھا؟ اب مردوں کی باری آتی ہے اور اگر وہ بھی ناسمجھ ہوتے ہیں اور عزت آبرو کا انھیں بھی اتنا ہی خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اتنے بڑے ناک والے ہوتے ہیں کہ ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو ناک کٹوا لیں تو عورتوں کی سب عذر گالم گلوچ میں وہ بھی شریک ہو جاتے ہیں اور وہی گالی جو ایک عورت دوسری عورت کو دیتی ہے اور جو بالعموم بے معنی سمجھی جاتی ہے جب وہی ایک مرد بھی ایک عورت کو دیتا ہے تو نہایت معنی خیز ہو جاتی ہے اور اگر اس کا جواب دوسرا مرد لفظ سے نہ دے تو خاندان بھر کی ناک کٹ جاتی ہے۔ اب زبانی جمع خرچ بند ہو جاتا ہے اور ہاتھ پیر کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے اور وہ محلہ بڑا خوش نصیب ہوتا ہے جہاں لٹھ پونگ فقط ان دو لڑنے والے بچوں کے والدین ہی تک محدود رہے اور دونوں کے کنبے بلکہ دونوں خاندانوں کے حامیوں تک اس کا سلسلہ

نہ پڑے۔ اس جنگ پر بہترین تبصرہ تو اس طرح ہوتا ہے کہ ادھر
پولیس اگر دونوں فریقوں کے بڑوں کی مشکیں کس کے اور انھیں ہتھکڑیاں
پہنا کر حوالات کو لے جاتی ہے اور اُدھر وہ دونوں گھرانوں کے سپوت
جن سے اس جنگ عظیم کا آغاز ہوا تھا، گلے میں ہاتھ ڈالے، سڑک پر
گلی ڈنڈا، دھاں مچونا یا کبڈی کھیلنے اس طرح روانہ ہوتے ہیں گویا کبھی
ان میں لڑائی ہی نہیں ہوئی تھی!

انھی تجربات کی بنا پر ہمیں کافی سبق مل چکا ہے کہ ہمارے ملی
مناقشات نہ تو اپنی ملت کی حمایت سے مٹ سکتے ہیں جیسا کہ ایک
زمانہ میں میں خود کرتا تھا، نہ ایک منصف مزاج اور بے تعصب ثالث
کا جامہ پہننے سے بلکہ یہ اسی طرح مٹ سکتے ہیں کہ ہر دو ملت کے رہبر
اور رہنما اپنی ہی ملت کی گالیوں کے مستحق بنیں۔ اور چونکہ مجھے اور میرے
بھائی کو بطور رسائی کے اپنی ہی ملت کی بہت کچھ گالیاں سننی پڑتی
ہیں مجھے صرف اطمینان ہی نہیں ہے کہ میں ایک سچا محب وطن
بن رہا ہوں بلکہ اس کی بھی کسی قدر امید اب ہو چلی ہے کہ دونوں ملتیں
عنقریب مل جائیں گی اور ان میں باہمی صفائی ہو جائے گی۔ غالباً اس
کے بعد مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں اس سیاسی ورزش'
کے شروع کرنے کا مشورہ ہر ملت کے احباب کو دیتا ہوں:

افسوس کہ میرا کوکناڈا کا خطبہ صدارت اور معاملات کی طرح اس معاملے
میں بھی صدا بصحرا ثابت ہوا۔ جو مسلمان ترک تعاون میں شروع سے شریک بھی
نہ ہوئے ان سے شکایت ہی کیا ہے۔ مگر الّا ماشاء اللہ وہ مسلمان بھی کسی قدر ان ملی
مناقشات کی رو میں بہ گئے جو ہمارے شریک و معاون تھے لیکن بحمداللہ کہ ہمارے

اکثر شرکا رو معاونین ثابت قدم ثابت ہوئے اور حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب، خواجہ عبدالمجید صاحب اور تصدق احمد خاں صاحب شروانی اور چودھری خلیق الزماں صاحب اور شعیب قریشی صاحب، محمد شفیع صاحب داؤدی اور سیٹھ یعقوب حسن صاحب، ڈاکٹر محمود صاحب اور منظر علی صاحب سوختہ آج تک اسی شاہراہ وحدت قومیہ پر گام زن ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے متعلق تو مسلمانوں کو ایک حد تک واجبی شکایت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ غرض کہ مسلمان کانگریسیوں کی جماعت کی جماعت اپنے اصولوں پر قائم رہی اور جو ذرا بھی صراط مستقیم سے بھٹکا خود ان کے مسلمان ساتھیوں نے ان پر ملامت کی چنانچہ ڈاکٹر کچلو صاحب، ظفر علی خاں صاحب اور بعض پنجاب کے اور حضرات اس کی نظیر ہیں۔ خود دہلی میں جو فسادات جولائی ۱۹۲۴ء میں رونما ہوئے ان کے بعد بھی دہلی میں دوبارہ قیام پذیر ہوا اور یہاں آتے ہی جو بیان میں نے اخبارات میں شائع کرایا اس میں بھی مسلمانوں کی غلطیوں پر ان کو نصیحت کی اور صاف کہہ دیا کہ گو مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہندوؤں سے بھی اس قسم کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں مگر ہندوؤں کی اصلاح ان کے رہنماؤں کا کام ہے اسے وہ انجام دیں۔ اس سے پیشتر حکیم اجمل خاں صاحب بھی ایک مفصل اور مشرح بیان اخبارات میں شائع کرا چکے تھے اور گو ہم دونوں پر اپنی ملت کے بہت سے افراد کی طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھار ہوتی رہی اور بعض گمراہ کن نام نہاد رہنماؤں نے جھوٹ اور جاننے سے کام لے کر ملت اسلامیہ کو ہمارے خلاف بہت کچھ ابھارا اور بعض آج تک ابھار رہے ہیں۔ لیکن ہم نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور اسی باعث مسلمان ہم سے اب تک اس کی شکایت کرتے ہیں کہ جب اور تو اور مہاتما گاندھی بھی اپنی ملت کے مفسدہ پردازوں کو تنبیہہ نہیں کرتے تو تم بعض مسلمانوں کو کیوں برا کہتے ہو۔

میری رائے میں مہاتما گاندھی نے اس امر میں غلطی کی۔ گو انھوں نے بھی اپنے "ینگ انڈیا" والے مشہور مضمون میں جو ۱۹۲۴ء میں جو تحریر میں لکھا گیا تھا آریہ سماج اور ان کے بعض نیتاؤں اور خود آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" کے متعلق اپنے خیالات کا صفائی سے اظہار کرکے اپنے تئیں آریہ سماج کے طعن تشنیع کا مورد بنایا تھا: تاہم بعض اور ہندوستانیوں سے متعلق ہم اور وہ آج تک ہم خیال و ہم زبان نہ ہو سکے۔ مسز نائیڈو نے کانپور کانگریس سے کچھ قبل پنجاب کے بعض مسلمان لیڈروں کے ساتھ ساتھ وہاں ہندو لیڈروں کے طرز عمل پر بھی اعتراض کیا تھا جس کے باعث ہندو ان سے سخت بیزار ہوگئے تھے لیکن سب ہندو یکساں نہ تھے۔ ہزاروں لاکھوں اس تعصب کا شکار اب تک نہ ہوئے تھے جو ہندو سبھائیں پھیلا رہی تھیں۔ مگر افسوس وہ بھی زبان بند نہ تھے اور ایک حد تک دریدہ دہن ہنود کی حمایت سے مرعوب۔ اس مرعوبیت پر ایک ہندو بھائی نے جو "پریم چند" کے ادبی نام سے مشہور ہیں غالباً ۱۹۲۳ء میں ہی کانپور کے مشہور رسالے "زمانہ" میں صحیح تبصرہ کرکے ہنود کی بھی حق پسندی کا ثبوت دیا تھا۔ کاش انھی کے تبلانے اور جتلانے پر ان کی ملت اپنی حق پسندی کا مزید ثبوت دیتی مگر ایسا نہ ہوا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب میں، صوبجات متحدہ میں، صوبجات متوسط و برار میں، اور صوبہ بمبئی میں سوراجیوں کو زک اٹھانی پڑی اور ہندو سبھا کا پروپیگنڈا کامیاب ہوا۔ خود بنگال میں بھی سوراجیوں کو شکست ہوتی اگر بنگال کے سوراجیوں نے بے وطن پرور داس آنجہانی کے ہندو مسلم معاہدہ کو اپنی پارٹی کے پروگرام سے خارج نہ کر دیا ہوتا اور کلکتہ کے فسادات کے دوران میں اور ان کے بعد مسلمانوں کے خلاف ایک حد تک بڑے بازار کے مارواڑیوں کی سی ذہنیت بنگالیوں میں پیدا نہ ہو گئی ہوتی اور سوراج پارٹی کے اخبار "فارورڈ" نے بھی دیگر بنگالی اخبارات کی طرح مسلمانوں

کے خلاف زہر اگلنا شروع نہ کر دیا ہوتا۔ بہار کو سریحیت راجندر پرشاد اور مولانا محمد شفیع داؤدی نے اس زہریلے اثر سے بہت کچھ محفوظ رکھا اور وہ اس کے لیے لائق صد تبریک و تحسین ہیں۔ مدراس میں جنگ ہندو مسلم کی نہ تھی بلکہ برہمن اور غیر برہمن کی تھی مگر وہاں بھی سری نواس آئنگر جیسے سچے وطن دوست اور غیر متعصب رہبر کو اسی طرح کے وطن دوست اور غیر متعصب مسلمان رہبر مل گئے جن میں سید مرتضیٰ صاحب جیسے سوراجیہ کے زخم خوردہ سوراجی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور بحمد اللہ اس صوبے کی کانگریس پارٹی بھی ہندو سبھا کے پروپیگنڈے کے اثر سے محفوظ رہی۔ بہر حال جہاں جہاں اس پروپیگنڈے کا اثر انتخابات میں کانگریس کی کامیابی پر پڑا وہاں کے کانگریسی ہندو خود سبھا کے لیڈروں سے سخت بیزار ہیں اور یہ ہرگز مصلحت وقت نہیں کہ کوئی مسلمان ان کے زخموں پر نمک چھڑکے۔ میرا آج بھی یہی عقیدہ ہے کہ خود ہندو بھائی ہندو غلط کاروں کی اصلاح کریں اور مسلمان بھائی مسلمان غلط کاروں کی اصلاح کریں۔

مہاتما گاندھی کا البتہ مرتبہ دوسرا ہے اور وہ ضرور ثالثی کا اہم اور نازک فرض ادا کرنے کے اہل ہیں اور وہ اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش بھی کرتے رہتے ہیں۔ گو میرا آج بھی ان سے بہ حیثیت ان کے ایک عزیز خوردہ اور سیاسی چیلے کے نہایت ادب و احترام سے مطالبہ ہے کہ وہ بعض ہندو لیڈروں کے طرز عمل پر از سر نو غور دمائیں اور اگر ان پر بھی اسی طرح ثابت ہو جائے جس طرح خود مجھ پر ثابت ہو چکا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف تعصب سے کام لیتے ہیں اور ہنود کو مسلمانوں کے خلاف ابھار کر اس وحدت قومیہ کو نقصان پہنچا رہے ہیں جو مہاتما جی کو اس قدر عزیز ہے تو ان کو بھی تنبیہ کریں خواہ وہ ہندو جاتی کے اور کاموں میں ان کے ساتھ رہ کر اور ان کے دوش بدوش کھڑے ہو کر کام کرتے رہیں اور ان کی اس شرکت کے باوجود

سب ہندوؤں کو معلوم ہو جائے کہ مہاتما جی اور ان لوگوں کے درمیان یقیناً وہ مہاساگر حائل ہے جس کا مہاتما جی نے الہ آباد میں اکتوبر ۱۹۲۰ء میں صوبجات متحدہ کی کانفرنس کے موقع پر اس قدر صاف الفاظ میں اظہار فرمایا تھا۔ آج یقیناً مسلمانوں کو ان کی خاموشی اور نیز ان کے بعض الفاظ سے غلط فہمی ہوتی ہے اور جو تعصب کے شکار ہیں ان کے تعصب میں اور جو اس سے بچے ہوئے ہیں ان کی مایوسی میں مہاتما جی کے طرز عمل سے ترقی ہوتی ہے اور ان میں غیر متعصب سے غیر متعصب کے قلب کی بھی وہی کیفیت ہے جو غالب کے اس حسرت بھرے شعر سے ظاہر ہوتی ہے ؎

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائے گا

مہاتما جی پر سوامی جی کے قتل کے دردناک واقعے نے وہی اثر کیا جس کی توقع تھی۔ میں مسلمانوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اسے نہ بھولیں کہ مہاتما جی ہندو ہیں اور وہ فخریہ فرمایا کرتے ہیں کہ میں ایک "سیت سنیاسی" ہوں۔ وہ ایک ہندو گھر میں پیدا ہوئے ہیں اور ایک ہندو گھر میں ان کی پرورش ہوئی ہے۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ ہندو دوست احباب کی صحبت میں گذرا۔ گو ان کی جبلی سچائی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ سب ملتوں کے لوگوں سے مل کر ان سے بھی محبت کریں اور ان کے عقائد اور اعمال پر منصفانہ نظر ڈالیں۔ وہ کسی مذہب کو خوبی سے معرا نہیں سمجھتے اور میرا یہ خیال تھا کہ گوہاٹی میں خود انھوں نے بھی تصدیق فرما دی کہ ان کا کلمہ لا الہ الا اللہ ، ولکل قوم ھاد وکان الناس امۃ واحدۃ ہے۔ وہ رسول اکرم کی رسالت پر بھی ایمان رکھتے ہیں، مگر وہ غالباً کسی نبی کو ہمارے عقیدے کے مطابق معصوم نہیں سمجھتے اور نہ رسول اکرم (روحی فداہ) کے خاتم النبیین

ہونے کے ہماری طرح قائل ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ ان کی ذہنیت بھی وما الفینا علیہ آبارنا سے بالکل محفوظ نہیں رہے اور ہندو کے عوام سے ضرور تشابہ العقیدہ ہیں گروہ سمجھتے ہیں کہ جو ان کا خاص عقیدہ ہے وہ ہندو دھرم ہے اور جو ہندو ان سے اختلاف رکھتے ہیں انھوں نے ہندو دھرم کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مسلمانوں میں ایک کلمہ ہم میں سے ہر ایک کے اسلام کی کسوٹی ہے۔ مگر جہاں تک مجھے علم ہے ہندو دھرم میں ایسا مختصر جامع اور مانع کوئی کلمہ نہیں ہے۔ ہمارا صحیفہ آسمانی بھی ایک مختصر سی کتاب ہے جس کے حرف حرف کو ہم خود اللہ کا کلام مانتے ہیں نہ کہ نبی اکرم کی الہامی تصنیف ع

ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ می دارم

ہندو میں یہ درجہ کسی کتاب کو نہیں دیا جاتا۔ پھر آریوں اور سناتنیوں میں گو وید کے تقدس پر اتفاق ہے مگر پرانوں کے متعلق ان میں سخت اختلاف ہے اس پر بھی تفسیر و تاویل، رائے اور قیاس نے ہم میں کتنے اختلافات پیدا کر دئے ہیں پھر ہندو میں اختلافات کیوں نہ ہوں۔ اور اگر سر سید احمد خاں کہہ سکتے تھے کہ جس کو علمائے ان کی "نیچر" کہا وہ عین اسلام ہے تو پھر مہاتما گاندھی سے کون کہہ سکتا ہے کہ جسے آپ ہندو دھرم کہتے ہیں وہ ہندو دھرم نہیں۔ بہر کیف وہ اسے سناتنی ہندو دھرم اور ورن آشرم دھرم مانتے ہیں اور جس چیز کو وہ ہندو دھرم مانتے ہیں اس سے اب تک ان کو تسکین ملتی رہی ہے اور وہ اس پر مطمئن ہیں۔ اسی دھرم میں وہ "اہنسا پرمو دھرم" کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ چاہے مالوی جی اور لالہ لاجپت رائے سوتی لال جی اور بہت سے اور ہندو شامل نہ سمجھیں یا اس کے وہ معنی نہیں جو مہاتما جی لیتے ہیں۔ اہنسا پر مہاتما جی جس قدر اصرار کرتے ہیں اور جن معنوں میں وہ اسے لیتے ہیں اس قدر مسلمان نہ اصرار کرتے ہیں نہ ان معنوں میں مسلمان اسے لیتے ہیں۔ اس لئے جو اثر

چوری چوریا کوہاٹ کے کشت وخون کا ان پر ہوتا ہے وہ مسلمانوں پر ہوتا ہے اور نہ برہندو پر۔ اور اسی طرح قتل کی واردات ہیں جن کا اثر ان کے قلب پر اور لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ کشت وخون میں کامیاب فریق اور قتل کی کسی واردات میں قاتل کے خلاف اور لوگوں سے زیادہ اثر قبول کرتے ہیں اور جو لوگ میری طرح ان کی سچائی اور بے تعصبی پر کامل یقین رکھتے ہیں وہ بھی یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ایسے فریق اور ایسے شخص کے متعلق مہاتما جی بلا ادراک وشعور کے یعنی (Unconsciously) تو وہ فریق مخالف ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی یقینی ہے کہ جتنا اثر ہندو کی جانب سے خطوط کے ذریعے اور زبانی گفتگوؤں میں مہاتما جی پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے اس کا عشر عشیر بھی مسلمانوں کی طرف سے ڈالنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ایسی حالت میں تعجب اس پر نہ ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کے متعلق فلاں بات جس پر مسلمان پوری طرح راضی نہیں ہو سکتے مہاتما جی نے کیوں کہی بلکہ تعجب اس پر ہونا چاہیئے کہ مہاتما جی بھی مسلمانوں کے خلاف ایسی آزار باتیں کیوں نہیں کہا کرتے۔ حقیقتاً جس کامیابی کے ساتھ مہاتما جی اپنے گرد و پیش کے مخالف اثرات کا مقابلہ کرتے ہیں وہ ان کی جیتی سچائی اور بے تعصبی کی بہترین دلیل وبرہان ہے اور اگر ہم جانتے ہیں کہ وہ اس مقابلے میں اور بھی زیادہ کامیاب ہوں تو ہمیں ان کو حقیقت سے آگاہ کرنے کی اب سے کہیں زیادہ کوشش کرنی چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں نے اگر کما حقہ کوشش کی تو وہ ہرگز ناکام نہیں رہیں گے۔

میں چاہتا ہوں کہ مسلمان تمام امور کا لحاظ رکھ کر اس مضمون پر غور کریں جو سوامی جی کے قتل کی خبر وحشت اثر سنتے ہی اس سے متاثر ہو کر مہاتما جی نے اس دردناک واقعے پر ارقام فرمایا تھا۔ آج میں اسی قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ

مہاتما جی نے خوب کیا کہ دونوں ملتوں کو تنبیہ کردی کہ آج ہندو مسلمان دونوں کا امتحان ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مسلمان اب تک اس امتحان میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور انھوں نے اس دردناک واقعے پر نہایت صفائی کے ساتھ اور ریب وشک کی ذرا سی بھی گنجائش چھوڑے بغیر اپنی طرف سے اظہار بیزاری کیا ہے اور اپنی ملت کی طرف سے برأت حق ادا کردیا۔ اس طرح بیزاری کا اظہار اور برأت کرنے والوں میں کانگریسی اور غیر کانگریسی، خلافت والے اور خلافت والوں کے مخالفین، علما کی جماعت اور عوام، حکومت کے "باغی" اور اس کے "غلام" سب شامل ہیں اور وہ مسلمان اگر کوئی مسلمان ایسا ہے جو مسلمانوں کی ایک "خفیہ اور گہری سازش" میں ملوث کئے جانے کے خوف سے یا فیشن کی تقلید کے طور پر قتل سے اظہار بیزاری اور برأت کر رہا ہے مگر دل میں اس واقعے پر خوش ہے اور ایسے جرائم کو جائز سمجھتا ہے وہ حقیقتاً وحدت قومیہ اور ملت اسلامیہ دونوں کے خلاف دشمنی کر رہا ہے اور اگر اس میں ایمان کا ایک شمہ بھی باقی ہے تو میدان میں آئے اور جس طرح کاتب عبدالرشید نے صاف صاف اپنے خیالات اور اعتقادات کا اظہار کیا ہے (جیسا کہ ایک شائع شدہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے) اسی طرح وہ بھی اپنے خیالات اور اعتقادات کا اظہار کردے تاکہ علمائے امت کو اس کی اصلاح خیالات کا موقع ملے اور کم از کم مسلمان قتل کے ایک جرم پر جھوٹ کے ایک دوسرے گناہ کا اضافہ نہ کریں۔

لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ باوجود مہاتما جی کے یاد دلانے کے کہ ہندو جاتی کا بھی امتحان ہو رہا ہے ابھی تک بہت سے ہندو اس امتحان میں کامیاب ہونے کی بظاہر کوشش نہیں کر رہے ہیں اور اگر "اہنسا پرمو دھرم" میں فعل کی طرح قول اور قول کی طرح نیت اور ارادہ بھی شامل ہیں تو وہ اس

عقیدے پر اپنے یقین کامل کا ثبوت ہرگز نہیں دے رہے ہیں۔ دہلی کے چند مسلمان
اسی وقت ان کے جذبۂ انتقام کا شکار ہوئے جن میں سے ایک معمر بزرگ جو
سوامی جی سے کم ضعیف نہ تھے اور جن کی جان سوامی جی سے کم خطرے میں
ہونا چاہیے تھی۔ اسی وقت ایک جوش سے بھرے ہوئے ہندو کے ہاتھوں
مہما پر بھینٹ چڑھا دئے گئے۔ اس پر جن ہندو لیڈروں اور ہندو اخباروں
نے اظہار افسوس وندامت، نفرت و برأت کیا ہو وہ براہ کرم اس سے مجھے
مطلع فرمائیں۔ میں اُسے مسلمانوں کی تسلی اور ان کی اصلاح دونوں کے لئے ضرور
شائع کروں گا۔ مسلمانوں سے ایسی حرکات پر اظہار بیزاری و برات کے لئے کوئی
ہندو نہیں جو پیچھے رہا ہو مگر کتنے ہندو لیڈر اور ہندو اخبارات ہیں جنھوں نے کٹارپور
کی ظالمانہ اور وحشیانہ حرکات پر یا آرہ، شاہ آباد، گیا اور پٹنہ کی سازش پر اظہار ندامت
و افسوس کیا تھا؟ بالخصوص پنڈت مدن موہن مالویہ صاحب اس معاملے میں اپنے
تمام ارشادات ارسال فرمائیں۔ میں انشاء اللہ سب کو شائع کروں گا گو شاید ہمدرد
کا ایک کالم بھی ان سے نہ بھرا جا سکے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوؤں نے خون کی ندیاں
بھی ابھی تک نہیں بہائی ہیں اور خدا کرے کہ وہ ایسا کبھی بھی نہ کریں اور نہ اس
قسم کا خیال اپنے دل میں لائیں۔ مگر مسلمانوں نے جن پر مہاتما جی کو اعتراض ہے
"کہ اس میں شک نہیں کہ چھری اور پستول کے استعمال میں وہ بہت بے باک
اور آزاد ہیں۔" بہار اور کٹارپور کے مظالم پر کونسی خون کی ندیاں بہا دی تھیں؟ ہم
دونوں بھائیوں نے تو کٹارپور کے وحشی قاتلوں تک کو معاف کر دیے جانے کے
لئے وزیر ہند کو تار بھیجا تھا اور ہماری والدہ مرحومہ نے بہار کی سازش کے متعلق
ارشاد فرمایا تھا کہ یہ سوراج کا .... نہیں ہے بلکہ یہ راج کے ڈوبتے ہوئے
سورج کی خون فشانی ہے مگر آج ہمارے ہندو بھائی کیا کر رہے ہیں؟ جذبۂ انتقام

کے نشے میں اگر وہ ڈوبے نہیں ہیں تو اس شراب کی جرعہ کشی انھوں نے ضرور کی ہے
اور ان کی کوشش برابر جاری ہے کہ اگر ساری ملت اسلامیہ کو قتل کے جرم میں
ملوث نہ بھی کیا جائے تب بھی اسے ایک گہری سازش کا نتیجہ ثابت کرنے کی جان توڑ
کوشش ضرور کی جائے کہ اس جرم کی تحقیقات انھیں افسران پولس کے سپرد کی جائے
جن پر ہندوؤں کو بھروسہ ہو اور اس میں ایک مسلمان بھی نہ ہو چاہے ایک مسلمان
کو بھی ہندوؤں کے مستند علیہ افسران پر بھروسہ نہ ہو۔ مولنا احمد سعید صاحب نے
جو تار والسرائے کو دیا ہے وہ ترک تعاون کی کوئی اچھی مثال نہیں اور جمعیۃ العلماء
کے فیصلے دربارہ داخلہ کونسل کی طرح ہمارے علماء کے ثبات قدم کا ثبوت اس میں
ملے گا۔ مگر جو شکایت اس تار میں کی گئی ہے وہ بالکل وہی ہے اور میں نے خود
مجبور ہو کر آج اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ کاش مولنا احمد سعید صاحب بھی الجمعیۃ
ہمدرد اور دیگر اخبارات میں اظہار رائے پر اکتفا کرتے اور ایک بیداد پسند حکومت
سے طالب داد نہ ہوتے۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں شکایت فی نفسہ بجا ہے اور
اس کی ضرورت ہے کہ آج مہاتما گاندھی اور اور غیر متعصب ہندو اس پر توجہ فرمائیں
عنقریب انشاء اللہ ہندو کی روش کے متعلق ایک مشرح اور مفصل مضمون لکھا جائیگا
جس میں ان کی موجودہ روش پر تبصرہ کیا جائے گا۔

(۱۰) شدھی کانفرنس میں صدر کانگریس کی صدارت

شدھی کے مذموم طریقے

ہمدرد ۳ فروری ۱۹۲۷ء

سال گذشتہ میں سریجت سری نواس آئنگر صدر کانگریس اسی زمانے میں دہلی آئے ہوئے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشاں تھے۔ اسی زمانے میں یہاں ہندو مہاسبھا کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا اور وہ ہندو سوراجی بھی جن کا دامن تعصب سے بھی پاک تھا خائف تھے کہ اگر وہ اب بھی ہندو مہاسبھا سے علیٰحدہ ہی رہے تو کہیں انتخابات میں سب ہندوؤں کو پنڈت مدن موہن مالوی سمیٹ نہ لے جائیں اور سوراج پارٹی کے سردار سب تہی کارواں ہو کر نہ رہ جائیں۔ اس لئے لالہ لاجپت رائے کی بے حد ضیافتیں کی جاری تھیں اور اگر سریجت سری نواس آئنگر اس طرف اپنے میلان کا ذرا بھی ثبوت دیتے تو یقیناً سب سوراجی ہندو لیڈر ہندو مہاسبھا میں شامل ہو جاتے، گو مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ان کی نیت ہرگز یہ نہ تھی کہ وہ ہندو مہاسبھا کی فرقہ وارانہ زیادتیوں میں خود بھی شریک ہو جائیں اور سب کچھ وہی کرنے لگیں جو ہندو مہاسبھا کے سربرآوردہ رہنما اس وقت کر رہے تھے۔ لیکن میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک دو بار ہندو سوراجی لیڈروں نے سریجت سری نواس آئنگر سے اس طریقے پر اصرار کیا جو ان کو ہندو سبھا کی رکنیت قبول کرنے کے مشورے کے مترادف تھا۔ مگر وہ برابر انکار ہی کرتے رہے اور بالآخر ان کے رفقاء نے بھی انھیں کی طرح ہندو سبھا کی رکنیت سے اجتناب کیا۔

امسال سریجیت سری نواس آئنگر صدر کانگریس بھی ہیں اور مدراس کی طرف سے اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے بھی منتخب ہو کر آئے ہیں اور آخر مارچ تک ان کا قیام دہلی میں ہی رہے گا۔

وہ اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ ہندو مسلم تنازعات لازمی طور پر ہوتے ہی رہیں گے، نہ وہ ہندو مسلم اتحاد کو اس قدر مشکل یا محال ہی خیال کرتے ہیں جس قدر کہ بعض شمالی ہندوستان کے لیڈر اسے مشکل یا محال خیال کرتے ہیں اور وہ یہ سنتے سنتے تنگ آگئے ہیں کہ آپ اس مسئلے کی پیچیدگیوں اور دشواریوں کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ آپ جنوبی ہند کے رہنے والے بھلا انھیں کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ انھوں نے گذشتہ ہفتے کو شدھی کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کرتے وقت جو تقریر کی اس میں صاف ظاہر کر دیا کہ انھوں نے اپنی رکنیت اسمبلی کے تین سال اس کام کے لئے وقف کر دیے ہیں کہ شمالی ہند کے لوگوں سے مل جل کر یہاں کے حالات سے اپنے تئیں واقف کریں اور بچشم خود ان کا معائنہ اور ملاحظہ کریں۔ تاہم اس کے لئے ضروری نہ تھا کہ شدھی کانفرنس کی صدارت ہی کی جاتی۔ اس لئے کہ صدارت ایک قسم کی رہبری اور رہنمائی ہوتی ہے اور جو شخص راہ سے خود ہی پوری طرح واقف نہ ہوگا وہ دوسروں کی رہبری اور رہنمائی کس طرح کر سکے گا۔ بہرحال مقامی ہندو پریس میں صاف ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ان جیسے شخص کا بھی آج شدھی کانفرنس کی صدارت کو قبول کر لینا ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگر سوامی شردھانند کے قتل کا سانحہ واقع نہ ہوا ہوتا تو صدر کانگریس نے یہ قدم نہ اٹھایا ہوتا اور اس کے یہی معنی ہیں کہ سوامی جی کا قتل مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کو ایک چیلنج، ایک صلا اور ایک مبارز طلبی ہے اور جو ہندو اب تک اس مذہبی تنازعہ کے محض تماشائی تھے اور اس سے زیادہ اس میں دلچسپی نہ لیتے تھے انھیں بھی اس صفوں اور

منطقی نتیجے پر پہنچنا پڑا ہے کہ اس چیلنج کو قبول کیے بغیر اب چھٹکارا نہیں اور چونکہ ان کے ہم مذہبوں کو ایک زبردست دھمکی دوسرے مذاہب کے غنڈوں کی طرف سے دی گئی ہے اس لئے اب وہ بھی اس مذہبی تنازعہ میں حصہ لینے والوں میں شریک ہوئے بن نہیں رہ سکتے" ورنہ یہی نہیں کہ ان کے مذہب پر ایک آفت ٹوٹ پڑے گی بلکہ دنیا نے آزادی خیال اور آزادی عقیدہ کی طرف جو ترقی کی وہ بھی رجعت قہقری سے مبدل ہو جائے گی۔

یہ خیالات پنڈت مدن موہن مالوی اور لالہ لاجپت رائے کے اخبار "ہندوستان ٹائمز" نے جس کے سرپرست مسٹر برلا ہیں، نہایت صفائی کے ساتھ ظاہر کیے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہاں تک مسٹر سری نواس آئنگر کے اپنے خیالات ہیں، اس لئے کہ انھوں نے صدارت قبول کرنے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار نہیں فرمایا اور جو کچھ کہا وہ شمالی ہند سے واقفیت پیدا کرنے کے متعلق ہی کہا جو قبول صدارت کے لئے تو کم سے کم ایک معقول وجہ نہیں سمجھی جا سکتی۔ ایک مسلمان بزرگ جواز سماع کے قائل تھے۔ ان کے یہاں ایک دوسرے بزرگ تشریف لائے جو سماع کے جواز کے قائل نہ تھے اور محفل سماع کو جو اس وقت ہو رہی تھی بند کرا دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی عظمت کرتے تھے۔ میزبان نے مہمان سے کہا کہ آپ اب تک سماع کے مخالف ہیں، اچھا ذرا آنکھیں بند فرمائیے۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک دو لمحے کے بعد میزبان نے کہا کہ اب کھول دیجئے۔ پھر کہا کہ فرمائیے کیا ملاحظہ فرمایا۔ مہمان نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلعم دروازے سے تشریف لا رہے ہیں۔ میزبان نے کہا کہ بس! اب آپ ہی فرمائیے جس محفل میں رسول اللہ صلعم شرکت فرمائیں اس میں آپ کو شریک ہونے میں کس طرح عذر ہو سکتا ہے؟ مہمان نے جواب دیا کہ ممکن ہے

کہ نئے زمانے ہی کو حضور تشریف لائے ہوں۔

کیا عجب ہے کہ جن خیالات کو "ہندوستان ٹائمز" نے سریجیت سرینواس آئنگر کی طرف منسوب کیا ہے وہ صحیح نہ ہوں اور انھوں نے شدھی کانفرنس کی صدارت صرف اسی لیے قبول کی ہو کہ جس طریقے پر شدھی کا کاروبار چلایا جاتا رہا ہے اور جس طریقے پر بالخصوص وہ آج سوامی جی کے قتل کے اشتعال انگیز اور شورش خیز سانحے کے بعد چلایا جا رہا ہے، اس کی اصلاح اپنے اثر اور اپنی صلح جویانہ رہنمائی سے کر سکیں اور جہاں تک ان سے ہو سکے ایک جائز مذہبی کام کو ایک ناجائز سیاسی کام نہ بننے دیں۔

بہرحال، صدر کانگریس نے شدھی کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اس کی ابتدا اپنی صدارتی تقریر سے فرمائی۔ اس تقریر میں جس چیز پر زور دیا گیا ہے ممکن ہے کہ وہ مہاتما گاندھی اور ان کی طرح دوسرے سناتنی ہنود کے باعث جو سمجھتے ہیں کہ اور مذاہب کے لوگوں کے تبدیل مذہب کے لیے کوشش کرنا ہندو شاستروں کے خلاف ہے، اسی کی مستحق ہو کہ اس پر زور دیا جائے، لیکن کم از کم مسلمانوں کے باعث جن کی طرف آج کل شدھی کے خواہاں ہنود کا روئے سخن ہے، تو یہ چیز ہرگز اس کی مستحق نہ تھی۔ اگر کوئی مسلمان آج یہ کہتا ہے کہ دوسرے مذہب والوں کو اپنے مذہب کے نشر و اشاعت، تبلیغ، پرچار کا حق نہیں ہے تو ہمیں تیار ہونا چاہیے کہ اس کی دماغی حالت کا امتحان کرایا جائے۔ میں نے تو کوکناڈا کانگریس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبۂ صدارت میں عرض کیا تھا کہ میں تبلیغی مذہب کا قائل ہوں اور تبلیغی مذہب کے یہ معنی لیتا۔ جیسے کہ بقول پروفیسر میکس ملر اس میں حق کے نشر و اشاعت اور اس پر ایمان نہ لانے والوں کو ایمان لانے کی تلقین کرنا ایک مقدس غرض کے مرتبے تک پہنچ جائے۔ جو سچائی کی روح ایک تبلیغی مذہب کے

ماننے والوں کے دلوں میں ہوتی ہے وہ اس وقت تک چین نہیں لیتے جب تک
کہ افکار میں، اقوال میں، افعال میں اس کا ظہور ہوئے، اور وہ اپنے تئیں اس
طرح آشکار اور نمایاں نہ کرے۔ مشہور حدیث قدسی کے الفاظ اسی سچائی اور
حقیقت کی روح کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان
اعرف۔ حق تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ میں ایک ڈھکا
خزانہ تھا سو میں نے چاہا کہ سب مجھے جان لیں۔ اور جس نبی اکرم کی زندگی کو قرآن کریم
میں ہمارے لئے اسوۂ حسنہ فرمایا گیا ہے اور جس کا خود فرمان ہے کہ تخلقوا باخلاق
اللہ (اپنے اندر خداوند کریم کے اخلاق کریمہ پیدا کرو)۔ اس کے لئے غالب
کہہ سکتا تھا ؎

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

حقیقت اور سچائی کی روح حقیقت اور سچائی کی روح ہو ہی نہیں سکتی
اگر وہ اپنے ظہور کے لئے نہ تڑپے، اور بے چین نہ ہو۔ اسے اس وقت تک سکون و
طمانیت نصیب ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنا پیغام ہر متنفس تک نہ پہنچا دے
اور جس چیز کو وہ خود کلمۂ حق مانتی ہے اسے تمام انسانی کنبے اور برادری اور تمام
بنی آدم کا گھرانا بھی کلمۂ حق نہ مان لے۔ اس میں لڑائی جھگڑے کا کیا کام، یہ تو
اپنی حاصل کردہ دولت کو اپنی ساری برادری میں لٹا دیتا اور اس پر نچھاور کر دیتا
ہے اس لئے یہاں تلوار اور اوزار حرب نامناسب اور ناموزوں بھی ہیں اور بے کار
بھی۔ لا اکراہ فی الدین (دین میں جبر و اکراہ ہو ہی نہیں سکتا)۔ تلوار یہی کر سکتی
ہے کہ جن لوگوں کا اس پر اعتماد و اعتبار ہو اور دلیل و برہان کے قائل ہی نہ ہوں
اسی کو دلیل اور اسی کو برہان سمجھتے ہوں، تو ان کے پنجے یا کلائی پہ ایک جھٹکی

لگائے اور اگر ہو سکے تو ایک ہی وار میں انھیں تلوار چلانے کے قابل نہ چھوڑے تا کہ فتنہ و فساد کا انسداد ہو جائے۔ فطرت انسانی جو حق نما ہے حق کی طرف رہنمائی کے لیے آزاد چھوڑ دی جائے اور جو جس شخص کا دین ہو وہ اسے اسی بنا پر اپنا دین بنائے کہ یہ چیز اس کے خالق کو محبوب ہے، کسی اور کے ڈر سے اسے قبول کرنے کو اختیار نہیں کیا گیا۔ حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للّٰہ۔ اس لیے بجائے تلوار سے مجاہدہ کرنے کے تبلیغ کے لیے جو موزوں اور مناسب طریقہ تھا وہ بتا دیا گیا اور ارشاد ربانی ہوا کہ جادلھم بالتی ھی احسن۔ زبانی لڑائی سے کہیں بہتر ایک طریقہ ہے۔ اس طریقے سے مذہبی مجادلے کو البتہ کم از کم یعنی اکراہ فی الدین کو دور کیا جا سکتا ہے ؎

دین میں اکراہ کیسا! ہاں بجائے خنداں ہیں
دل میں قرآں ہو بجائے ہاتھ میں شمشیر ہے

(جوہر)

نصرانیت نے جو الزام مسلمانوں پر لگایا تھا: مسلم کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے اس کی حقیقت اسی قدر ہے اور جو اس سے انکار کرے وہ یا تو اسلام پر اور مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پر جس میں فاتحین اور ملوک بھی شامل ہیں تہمت تراشتا ہے یا پھر تاریخ اسلام سے بالکل ناواقف ہے، اور اگر وہ مسلمان ہے اور عالم دین ہونے کا بھی دعویٰ کرتا ہے تو اسلام کے ساتھ اعدائے اسلام سے بھی کچھ زیادہ ہی دشمنی کرتا ہے۔ البتہ لطف و کرم، اخلاص اور محبت کے ساتھ مذہبی جد و جہد اور مجادلہ ہر مسلمان کا فرض ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان واجب الاذعان ہے کہ اگر کسی غیر مسلم کا گھر اتنے فاصلے پر ہو کہ دن کو نظر نہ آتا ہو، مگر رات کو اس کے گھر کی روشنی نظر آ جاتی ہو تو ایک مسلمان کو وہ

رات چین سے سونے میں بسر نہ کرنی چاہیے بلکہ اسی فکر میں گذار دینی چاہیے کہ کب دن
نکلتا ہے اور میں اس کے گھر تبلیغ اسلام کے لئے جاتا ہوں۔ اگر مہاتما گاندھی اس
سے واقف نہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ہم لوگ جو اپنے مذہب سے ان
کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقف ہیں وہ اپنے فرض تبلیغ کو بھول نہیں سکتے۔ یہ البتہ
صحیح ہے کہ انسان وعظ و پند سے اس قدر مؤثر طریقے پر تبلیغ نہیں کر سکتا جس قدر کہ
اپنے اخلاق و مکارم اور اپنی زندگی کے اعلیٰ نمونے سے کر سکتا ہے اور یہی رسول اکرمؐ
اور آپ کے صحابہؓ اور صوفیائے کرام کی کامیابی کا راز تھا۔ گندی زندگی اور پوسٹر بازی
سے تحریری تبلیغ کے جو قائل ہوں ان کا اثر ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں کہ الٹا پڑ رہا ہے
اور فتنۂ ارتداد کی چیخ و پکار سے بس یہی ہوا ہے کہ ہم اس میدان میں نبرد آزما
ہونے سے پہلے ہی غنیم کے جوش و خروش اور اس کی فوج کے نظم و ترتیب سے
مرعوب ہو جاتے ہیں اور لڑائی سے پہلے گویا ہار مان لیتے ہیں حالانکہ ہم کو اس یقین
کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھنا چاہیے کہ اگر حقیقتاً ایمان والے ہیں تو ہمیں برتر
رہیں گے۔ لا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔ حق حق ہے اور
باطل پھر باطل ہے۔ اور باطل اسی لئے رونما ہوا ہے کہ ہمارے کام شروع کرتے ہی
اور حق کے آتے ہی روپوش ہو جائے۔ جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل
کان زهوقا۔

یہ ایک ضمنی بحث تھی، اصل بحث یہ تھا کہ تبلیغی مذہب والے کو اس چیز کے
نشر و تبلیغ کی ایک دھن ہوتی ہے جس کو وہ سچ سمجھتا ہے اس کی اشاعت اور تمام
عالم کو اس کا قائل کرنے کی اسے ایک عجیب فکر ہوتی ہے، اور گو یہ ممکن ہے کہ
واقعۃً اس کا عقیدہ غلط ہو اور اس کے پاس حق کا ایک شمہ برابر بھی نہ ہو مگر میرے
نزدیک یہ ممکن نہیں کہ کسی کے پاس حق کا ایک شمہ برابر بھی ہو اور اسے اس کے

تمام عالم میں نشر و اشاعت کی دھن نہ ہو۔ حق اور سچائی وہ غذا نہیں کہ تنہا خوریاں ممکن ہوں جس کے پاس حق ہو اور یہی نہیں بلکہ وہ بھی جو سمجھتا ہو کہ اس کے پاس حق ہے وہ اس کا ذائقہ چکھتے ہی اور اپنے حلق سے اس کا ایک نوالہ اتارتے ہی چاہتا ہے کہ خود ہی اس غذا کو نہ کھائے بلکہ ساری دنیا کو بھی کھلائے۔ ایک مسلمان کے نزدیک حقیقتاً تمام مذاہب اپنی اصلی حالت میں ایک ہی دین برحق تھے لیکن اپنی مسخ شدہ حالت میں بھی عیسائیت اور بودھ مذہب اسلام ہی کی طرح تبلیغی مذہب رہے۔ اور انھوں نے عالم گیر مذہب ہونے کا دعویٰ کیا، لیکن یہودی، زرتشتی اور ہندو مذہب تبلیغی نہ رہے۔ یہاں تک کا دعویٰ بھی شاید کہیں کہ ہندو مذہب کبھی بھی تبلیغی نہ تھا، لیکن میں بہ حیثیت ایک مسلمان ہونے کے اس کا یقین رکھتا ہوں کہ اپنی اصلی شکل میں یہ بھی وہی دین تھا جو حضرت آدمؑ کے وقت سے برابر انسانوں کا دین چلا آیا ہے اور جسے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا فرما کر بالآخر خداوند کریم نے اسلام کی شکل میں کامل کر دیا جس کے سوا اب اللہ کوئی دین کسی سے قبول نہیں فرماتا۔ اس لئے اپنی اصلی شکل میں ہندو دھرم بھی ضرور تبلیغی ہوگا۔ مسلمان آج اسے لاکھ مسخ شدہ سمجھیں (اور آریہ بھی اسے کب مسخ شدہ نہیں مانتے اور خود اسلام کے کٹر پیرو ان کے دوسرے پیرووں کے اسلام کو مسخ شدہ نہیں سمجھتے) لیکن وہ یہ نہیں کہتے کہ کسی ہندو کو سناتنی دھرم یا آریہ دھرم کی تبلیغ کا حق ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اس حق پر زور دینا نہ سرکیت سری نواس آئنگر کے لئے ضروری تھا نہ ہمارے مقامی معاصر ہندوستان ٹائمز کے لئے۔ یہ تو تحصیل حاصل اور انگریزی محاورہ کے مطابق اس شخص کو تبلیغ کرنا ہے جو اس سے پہلے ہی ایمان لا چکا ہو۔

مجھے تو ایک عرصے سے ہندو بھائیوں سے یہی شکایت تھی کہ وہ برحق

ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اس غذا کو بانٹ کر نہیں کھاتے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں میں نے الٰہ آباد میں دو لیکچر دیے تھے اور مسلمانوں اور ہندوؤں میں جو فرق تھا وہ حاضرین کو جتایا تھا۔ زیادہ سے زیادہ مسلمان کی ہمارے ہندو بھائی یہ شکایت کر سکتے تھے کہ ایک بیکی سیٹھی کھچڑی پکا کر لایا ہے اور کہتا ہے کہ یہ طباق نواب کے کھانے کا ہے اور سب کو کھلانا چاہتا ہے اور جو نہیں کھانا چاہتے ان کے حلق میں بھی زبردستی ٹھونس دیتا ہے۔ لیکن ہندو بھائی تو یہ غضب کرتے ہیں کہ دعویٰ تو رکاب داری کا ہے مگر جب رسوئی تیار ہو گئی تو اس خوان نعمت کو اس طرح تنہا خوری کے لیے مخصوص کر لیا کہ چوکے کی کنڈی اندر سے چڑھالی اور دوسروں کو دینا تو در کنار، دکھایا تک نہیں اور کسی اور کی پرچھائیں بھی اس پر نہ پڑنے دی۔ یہ امتیاز صرف مزاحاً نہیں کیا گیا تھا اور الٰہ آباد سے اگست ۱۹۲۱ء میں شب کو بمبئی جاتے ہوئے میں نے مہاتما گاندھی سے پوچھا تھا کہ آپ ہندو دھرم کا غیر تبلیغی ہونا کس بنا پر جائز سمجھتے ہیں جبکہ اپنے سیاسی اور اقتصادی اور تعلیمی اعتقادات کی تبلیغ آپ شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھر کر کر رہے ہیں۔ مہاتما جی کا جواب میری سمجھ میں آج تک نہ آیا اور وہ لاکھ معقول ہو مگر میں اب تک غیر تبلیغی مذہب کا قائل نہ ہو سکا۔ پھر میں ہندو بھائیوں سے کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ تم کو اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کا حق نہیں ہے۔

سوال جو کچھ ہے وہ تبلیغ کا نہیں بلکہ طرز تبلیغ کا ہے اور اس کے متعلق مہاتما گاندھی نے جو کچھ ۱۹۲۴ء میں ہندو مسلم کشیدگی کے سلسلے میں لکھا تھا اور جس پر سارا آریہ ورت ان پر برس پڑا تھا، اُسے کوئی آریہ آج نہیں دہراتا اور مہاتما گاندھی بھی اسے کسی آریہ کو یاد نہیں دلاتے۔ لاطینی کی ایک مثل ہے کہ مرے ہوؤں کے متعلق کچھ نہ کہو، کہو تو کلمۂ خیر ہی کہو۔ لیکن اس پر عمل کرنے

کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب غلط دعوے کیے جائیں تو انھیں تسلیم بھی کر لیا جائے۔ جو طریقہ شدھی کے لیے کوشش کرنے والوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ یقیناً وہ طریقہ نہیں جسے سریجت سری نواس آینگر ایک لمحہ کے لیے بھی روا رکھیں گے۔ ان سے کوئی نہیں کہتا کہ وہ اپنے مذہب کی خوبیاں عالم آشکارا نہ کریں۔ ان سے یہ بھی کوئی نہیں کہتا کہ دوسرے مذاہب میں جو خامیاں ہیں ان سے چشم پوشی ہی کریں۔ تاہم جادلہم بالتی ھی احسن پر اگر وہ بھی عمل کریں تو کچھ نقصان نہ ہوگا بقول غالب ؎

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

اگر سریجت سرینواس آینگر ۲۰ جنوری کے جلسے کے بعد جس میں چین کو ہندوستانی افواج بھیجے جانے کے خلاف انھوں نے تقریر کرتے ہوئے اس قدر محبت آمیز پیرایے میں ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں بھی اپنے خیالات ظاہر فرمائے تھے چاندنی چوک سے گذرتے اور اپنی شدھی کانفرنس والے آریہ سماجی "جلوس" کو ملاحظہ فرماتے اور جو کچھ اس نام نہاد جلوس کے بہانے سے کہا جا رہا تھا اس کو سنتے اور سمجھ سکتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ مسلمان شدھی سے اس قدر کیوں بیزار ہیں۔ اسلام میں جلوس نہیں نکلا کرتے گو بہت سے مسلمانوں نے محرم میں تعزیوں وغیرہ کے نکالنے کی رسم قائم کر لی ہے ہنود کے جلوس آئے دن نکلتے رہتے ہیں اور یہ رسمیں تعزیوں سے بھی بہت زیادہ پرانی ہیں۔ آریہ سماج اس قسم کے جلوس نہیں نکالتے تاہم انھوں نے ایک پرانی رسم چھوڑ کر ایک نئی رسم قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ جلوسوں کے ذریعے شدھی کا پرچار کیا جائے۔ پیاسا کنویں کے پاس نہیں آتا تو کنویں ہی کو پیاسے کے پاس لے جایا جائے۔ جو راہبوں میں مذہبی تبلیغ ہندوستان میں عیسائیوں کی ایجاد تھی لیکن آریہ سماج کی حرکت سب سے

نمالی ہے اور سڑکوں پر جلوس نکال کر تبلیغ متروک ان کی بدعت ہے۔" ان نمان میں ترامہمان۔ راستہ چلنے والوں کو خواہ مخواہ چھیڑا جاتا ہے پھر جواہر پیش دیئے جاتے ہیں اور جو بھجن اور دوسرے گیت گائے جاتے ہیں وہ اس قدر اشتعال انگیز ہوتے ہیں کہ ان کو سن کر تحمل کرنا بڑے عزم الامور کا ثبوت دینا ہے۔ اگر کہیں کوئی لغویت ہو رہی ہو تو ایک مسلمان کو حکم ہے کہ اذا مروا باللغو مروا کراما۔ لغویت کے پاس سے گذرو تو شریفانہ انداز سے گذر جاؤ۔ وہاں رکنے کی ممانعت ہے۔ لیکن جب لغویت خود بازاروں سے گذرنے کو اپنا رویہ بنائے تو کیا کیا جائے!

اگر مسلمان گایوں کو سجا کر ان کے جلوس نکالیں تو خود مسلمان اس کو بدعت قرار دیں گے لیکن جہاں دہلی کی طرح حکم ہو کہ اپنے گھروں میں قربانی نہ کرو اور مسلخ سے جا کر اپنے قربانی کے جانور ذبح کرو اور اس کے لئے بھی سوائے چند کے تمام راستے ممنوع قرار دے دیئے جائیں تب بھی ہندو بھائیوں کا کہنا کہ اس سے ہماری حیات کو ٹھیس لگتی ہے ایک فطرتی امر اور جائز قرار دیا جائے اور سڑکوں کو گذرگاہ انسانات و حیوانات بھی نہ رہنے دیا جائے۔ لیکن اگر ہندو بھائی نماز با جماعت کے وقت بھی مسجدوں کے سامنے کھڑے ہو ہو کر ڈھول پیٹیں سنکھ بجائیں اور مقتدیوں کو امام کی قرات تو در کنار کان پڑی آواز نہ سننے دیں تو یہ بھی جائز اور مسلمانوں کا گلہ شکوہ ہرگز ایک فطرتی امر نہیں اور بالکل ناجائز۔ لیکن اب معاملہ اس سے بھی آگے گذر گیا۔ اب گاڑیوں میں اور تانگوں میں مجھ کر شدھی جلوس کے ساتھ نکلتے ہیں اور اسلام، خدائے اسلام اور رسول اسلام (روحی فداہ) کی شان میں اور مسلمانوں کے خلاف وہ کچھ کہا جاتا ہے جسے دہرا کر میں اشتعال کو اور بڑھانا نہیں چاہتا۔ اگر سریحت سری نواس آئنگر نے اس لئے شدھی کانفرنس کی صدارت قبول کی ہے کہ اس بیہودگی اور لغویت کی اصلاح کریں اور ڈاکٹر شاستری

اور پروفیسر اندر جیسے ذمہ دار آریہ سماج کے رہبر اس کی اصلاح میں ان کی مدد لینا
چاہتے ہیں تو میں سریجت سری نواس آئنگر کو ان ذمہ دار آریہ سماجی حضرات کو،
ساری سماج کو، اور دہلی کو اور مشتعل شدہ مسلمانان دہلی کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اس
کے علاوہ اور بھی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اور بشیرن کا اسی مجسٹریٹ کی عدالت
میں پیش ہونا جس میں سوامی شردھانند کے قتل کا مقدمہ پیش تھا، صاف بتاتا ہے کہ
وہ طریقہ تبلیغ جو شدھی کرنے والے بعض اوقات استعمال کرتے ہیں کس طرح فضا
کو اس قدر مکدر کر دیتا ہے کہ قتل تک کی وارداتیں ظہور پذیر ہونے لگتی ہیں۔

ہندو بیواؤں کو نکاح سے محروم رکھنا اور اس کے جو لازمی نتائج ہیں ان
کے پیدا ہونے پر مسلمانوں سے اس طرح انتقام لینا کہ آریہ آشرم کے کرگے اسٹیشنوں
پر چھوڑ دیے جائیں تاکہ پریشاں حال مسلمان عورتوں کو جو اپنے عزیز و اقارب سے
بچھڑ گئی ہوں آشرم میں داخل کر لیا جائے، اسی انتقام کی طرح ہے جو سوامی ستیدیو
جیسا تعلیم یافتہ مگر بظاہر فاترالعقل شخص سوامی جی کے قتل کا مسلمانوں سے اس طرح
لینا چاہتا ہے کہ پنجابیوں سے انتقام کا نام صاف صاف لے کر اردو رسم الخط
چھوڑتا ہے کہ وہ عرب سے آیا ہے گویا آریہ ورت میں تو ازل سے آریہ ہی رہتے
تھے اور سنسکرت ہی یہاں کے اصلی باشندوں کی زبان تھی اور دیوناگری ہی
ان کا رسم الخط تھا۔ سریجت سری نواس آئنگر نے بالکل بجا فرمایا کہ اگر کسی کی شدھی
کرائی جائے تو علانیہ کرائی جائے چاہے مردوں کی ہو چاہے عورتوں اور بچوں
کی اور انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ شدھی اس طرح کی جائے کہ مسلمانوں کو یقین ہو جائے
کہ یہ سرکاری نوکریوں اور وزارتوں کے جھپٹ لینے کے لیے دوڑ نہیں ہے۔ مگر اس کو
کیا کیا جائے کہ آریہ اخبارات خود لکھ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ آئندہ مردم شماری کے
لیے کیا جا رہا ہے تاکہ ہندوؤں کی تعداد زیادہ نظر آئے اس لیے کہ موجودہ حکومت

مختلف ملتوں کے اعداد کے تناسب ہی پہ ان سب چیزوں کی تقسیم کرتے وقت نظر رکھتی ہے۔ مہاتما گاندھی نے...... خواجہ...... تبلیغ کے راجہ کی "داعی اسلام" کے متعلق اور نیز سر آغا خاں کی ایک تجویز کے متعلق بالکل صحیح فرمایا تھا کہ "یہ ایک مذہبی کام کو غیر مذہبی طریقے پر کرنا ہے" لیکن دس مسلمان یتیموں کا یتیم خانے سے ایک مجوزہ نو مسلم آریہ کے ذریعے سے اغوا اور بشیرن جیسی لاوارث لڑکیوں کو اسٹیشنوں پر سے لا کر آریہ آشرم میں داخل کر لینا کیا ایک مذہبی کام کو مذہبی طریقے پر کرنا ہے؟ مگر کوئی ہندو اس کے خلاف آواز بلند نہیں کرتا اور جو نصیحت کی جاتی ہے وہ مسلمانوں ہی کو کی جاتی ہے۔

ہندو زمینداروں اور سود خوار بنیوں کا دباؤ ایک طرف، روپے پیسے اور مقدمات وغیرہ کی پیروی کا لالچ دوسری طرف، اس پر آریہ آشرم والوں یا ان کے ہوا خواہوں کا دھوکہ اور زبردستی ان سب پر مستزاد۔ شکایت اس طرز تبلیغ کی ہے نہ کہ نفس تبلیغ کی، اور اگر سریجت سری نواس آئنگر اپنے فرائض بحیثیت ایک انسان، ایک ہندوستانی، ایک صدر کانگریس نیز ایک صدر شدھی کانفرنس کے ادا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس طرز تبلیغ کو جانچیں اور پرکھیں۔ اور اگر یہ ناجائز اور دل خراش اور قومیت مشترکہ ہندیہ کے خلاف ہے تو اس کی اصلاح کریں ورنہ ان کی صدارت شدھی کانفرنس غیر مفید اور ان کی صدارت کانگریس بھی بے اثر ثابت ہوگی، ہندو مسلمان اسی طرح لڑتے مرتے رہیں گے اور انگریزوں ہی پر لاجتے رہیں گے اور ہم کو غلامی میں مبتلا رکھیں گے۔ دونوں ملتوں کو یقیناً نشر و تبلیغ کی آزادی ہونا چاہیے۔ دنیا میں مختلف تہذیبیں اور تحریکیں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ یہ بازار کا سودا ہے جس کی خوشی چاہے ایک کو لے، جس کی خوشی چاہے دوسرے کو۔ ہر سوداگر اپنے ہی مال کو سراہتا ہے اور گاہکوں کو لالچ دلاتا ہے۔ یہ بیسویں صدی

ہے اور آج امید کی جا سکتی تھی کہ انسانی زندگی کے لئے وہ مسرفانہ طریقہ تبلیغ یکقلم ترک کیا جائے گا، جو عقائد باطلہ کا استیصال اس طرح کرنا چاہتا ہے کہ معتقدین باطل ہی کا استیصال کر دیا جائے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اپیتین کا تخلیہ، اعتصاب و تعبدیت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا اور اب کسی کو یہ خیال بھی نہ آئے گا کہ کافروں ہی کا صفایا کرکے کفر کی صفائی ہو سکتی ہے۔ کسی مذہب کے پیروؤں کی تعداد اور بڑھانے کے لئے سیدھا اور بے اندازہ یہی ہے کہ اپنے اپنے مذہب کی ہر شخص تبلیغ کرے اور جس کو تلقین و تبلیغ کی جائے وہ اپنے انتخاب دل پسند میں بالکل آزاد ہو اور جو مذہب اسے بھائے اسے قبول کر سکے۔ جس چیز کو سوداگری نے اپنا شعار بنا لیا ہے کیا اسے دین داری اپنا شعار نہیں بنا سکتی؟ میرا تو خیال ہے کہ خداوند کریم کو کسی کا تبدیل مذہب اس طرح ہرگز نہ بھائے گا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے کلمہ پڑھ لیا، یا دل کے مطمئن ہوئے بغیر اقرار باللسان کر لیا یا بھوک سے تنگ آکر روٹی کپڑے کے لالچ میں تھوڑا سا گوبر اور گئو مترا بھی چکھنا گوارا کیا یا کسی عورت کے حسن سے مسحور ہو کر اسی کا کلمہ پڑھ لیا اور اس کے ساتھ دو بول پڑھوا لئے۔ لیکن خدا کو وہ شدھی یا تبلیغ تو ہرگز نہ بھائے گی جس کا مطمح نظر جنت سے کہیں زیادہ دہ سالہ مردم شماری ہو اور ایسی تبلیغ اور شدھی سے جو اس بیسویں صدی کی بدعات ہیں ہمارے باپ دادا کا وہ پرانا طریقہ ہی لاکھ بہتر تھا جو بجائے سروں کے شمار کرنے اور ان کے اعداد کو قلم بند کرنے کے سروں ہی کو قلم کر دیا کرتے تھے۔ یہ سروں کے اعداد کی قلم بندی کا ذوق ایک نہ ایک دن اور بھی زیادہ سروں کو قلم کرا کے رہے گا اور اگر سری لوگ اس آنکھ سے وہ دن دیکھنا نہیں چاہتے تو اس طریقہ شدھی کو بند کرائیں اور اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کو اکثریت کا اولین فرض قرار دیں۔ یہ آئی ہوئی بلا اگر ٹل سکتی ہے تو بس اسی طرح ٹل سکتی ہے۔

(۹) یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

ہمدرد ۱۷ مارچ ۱۹۲۷ء

خداوند کریم ہم ہندوستانیوں کی آزمائش کر رہا ہے لیکن بظاہر ہم کو اس کا احساس نہیں اور ہم غلطیوں پر غلطیاں کر رہے ہیں اور پھر بھی امید رکھتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے اور ہندوستان کو آزادی نصیب ہوگی اور ہندوستان میں قومی حکومت کسی نہ کسی طرح خود بخود قائم ہو جائے گی۔

جوں جوں ۱۹۲۱ء اپنے خاتمے کی طرف قدم بڑھاتا جاتا تھا امید بڑھتی جاتی تھی کہ حکومت مجبور ہو کر مہاتما گاندھی کو بلائے گی اور حقیقی اصلاحات کے متعلق گفت و شنید شروع کرے گی لیکن بدقسمتی سے مالابار میں جو جھگڑا ہو چکا تھا وہ رنگ لانے لگا اور سر سنکرن نائر جو "گول میز کانفرنس" کے متعلق ایک جلسے کی صدارت کر رہے تھے اپنے وطن مالوف کی ناگوار صورت حالات سے کچھ اس طرح متاثر ہو گئے کہ وہ حضرات جو تارک تعاون نہیں ہوئے تھے مگر ترک تعاون کی تحریک کے باعث حکومت کی مرعوبیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک حد تک تیار ہو گئے تھے پھر "وفاداری" اور "اعتدال" کی طرف راغب ہو گئے۔ چتارنجن داس آنجہانی حوالات میں تھے، پنڈت مدن موہن مالوی ان کے، مہاتما گاندھی کے، حکومت کے، نہ معلوم اور کس کس کے درمیان سفیر اور ایلچی بنے۔ اُدھر چوری چورے کا واقعہ ہوا اور مختلف صوبوں کی کانگریس کمیٹیوں کے لیڈر جو اس وقت ہماری طرح جیل میں محبوس نہ تھے سنا ہے کہ انھوں نے بھی مہاتما گاندھی پر اثر ڈالنا شروع کیا کہ اگر کانگریس کی گرم رفتاری اسی طرح رہی تو عدم تشدد کا خاتمہ ہو جائے گا اور سارا

ملک خون کے ایک سیلاب کی نذر ہو جائے گا۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اس وہم کے اسباب میں ہم ہندوستانیوں کی بزدلی بھی شامل تھی۔ میں نے سوائے مولانا ابوالکلام آزاد کے کسی کم سن شخص کو استاذی فہم اور ذکی نہیں پایا تھا کہ مہاتما جی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے دیوی داس جی کو پایا لیکن وہ نہ صرف ناتجربہ کار تھے بلکہ جس غیر معمولی عدم تشدد کی فضا میں ان کی تربیت ہوئی تھی اس کے باعث چوری چورے کے واقعے نے ان کے قلب پر وہ غیر معمولی اثر پیدا کیا ہوگا جو ان کی عمر کے اور نوجوانوں کے قلب پر نہ پیدا ہو سکتا تھا۔ بہرحال مالوی جی کا مشورہ، صوبجات کی کانگریس کمیٹیوں کے لیڈروں کی گھبراہٹ، اور دیوی داس جی کے تاثرات تھے جس سب نے مہاتما جی کو مجبور کر دیا کہ یکایک بارڈولی کا فیصلہ صادر کر دیں۔ ہم اگر اس وقت محبوس نہ ہوتے تو ممکن ہے کہ یہ فیصلہ اس طرح صادر نہ ہوتا۔ کم از کم ہم یہ تو ضرور کرتے کہ اس فیصلے کا اپنے ساتھ کے کام کے کرنے والوں پر وہ اثر نہ ہونے دیتے جو واقعتہً ان پر ہوا۔

اس فیصلے کے بعد اگر مہاتما جی خود بھی آزاد رہتے تو یہ اثر ہرگز نہ ہوتا مگر حکومت نے سب چالیں پہلے سے سوچ لی تھیں۔ سب سے پہلے ہندوؤں کو مسلمانوں سے کسی قدر الگ کرنے کے لئے ہم پر ایک ایسے امر کے متعلق مقدمہ چلایا تھا جس کا تعلق اسلام اور خلافت اسلام اور ایک اسلامی ملک ترکی سے تھا اور گو ملزموں میں ایک ہندو شنکراچاریہ بھی شامل تھے لیکن سزا صرف مسلمانوں ہی کو دی گئی۔ مہاتما گاندھی نے نہایت خوبی سے اس کا جواب اس طرح دیا کہ خود اسی اعلان پر دستخط کر دیے جس کی بنا پر ہم کو سزا دی گئی تھی اور اسی طرح تمام کانگریسی لیڈروں سے بھی، جن میں کثیر التعداد بڑے سے بڑے ہندو لیڈر شامل تھے دستخط کرائے مگر حکومت نے اس کے بعد یہ غلطی نہ کی کہ ان کو بھی اسی سلسلے میں سزا دے دے۔ تاہم

والنٹیر بنانے کا ایک جرم فوراً وضع کر لیا گیا اور اس میں تو مذہب کا سودائی بنا کر قید
کیا تھا مگر اس کے بعد کانگریسی لیڈروں کو جن میں کثیر التعداد ہندو تھے، وطن کا شیدائی
بنا کر جیل میں ڈال دیا۔ یہ بھی حکومت کی ایک چال تھی۔ مہاتما گاندھی اور ہندو
لیڈروں سے پہلے ہمیں بند کر دیا۔ ہماری قید و بند پر لوگوں میں جو جوش پیدا ہوا اس
کو فرو کرنے کے لئے مہاتما جی موجود تھے۔ اب بمبئی میں جو فساد پرنس آف ویلز کے
ہندوستان آنے پر رونما ہوا اس کو مہاتما جی نے خلافت اور کانگریس کے کام کرنے والوں
کی مدد سے جلد رفع کر دیا لیکن چھ ماہ بعد جب حکومت نے خود مہاتما جی کو قید کیا تو
وہ خوب جانتی تھی کہ اس اہم ترین واقعے پر اتنا جوش و خروش بھی سطح پر نمایاں
نہ ہوگا جتنا کہ ہمارے سزایاب ہونے پر ہوا تھا اور کم سے کم علی برادران اس وقت
باہر نہ ہوں گے کہ ہندوستان کو آمادہ کریں کہ جلد سے جلد یروودہ جیل کی کنجی وضع کرے۔
لوگ متوقع تھے کہ کچھ نہ کچھ ضرور کیا جائے گا مگر کچھ کانگریسی لیڈر جو بعد کو
"نو چینجر" کے نام سے پکارے جانے لگے کہتے تھے کہ مہاتما جی خود منع فرما گئے ہیں
کہ میرے لئے کچھ نہ کرنا (گویا رخصت ہوتے وقت مہاتما جی سے کسی اور ہدایت
کی بھی توقع تھی) اور بعض لیڈر جو بعد میں سوراجی کہلائے جانے لگے یا تو مہاتما جی
سے پہلے ہی ناراض تھے (اور ان میں لوکمانیہ تلک کے چیلوں کا ایک بڑا حصہ
تھا جو ایک مہاراشٹر والے ہی کو لوکمانیہ کا جانشین دیکھنا چاہتے تھے) یا
(اس آنجہانی کی طرح (جن پر مہاتما گاندھی کا جادو پنڈت موتی لال نہرو کے
بہت بعد چلا تھا اور بظاہر اس سے زیادہ دیر تک کارگر بھی نہ رہا) سمجھتے تھے
کہ مہاتما جی نے والنٹیر لئے سے صحیح طریقے پر معاملہ نہیں کیا اور حقیقتاً معاملے کو بگاڑ دیا۔
بہرحال باردولی کے فیصلے کے صادر ہوتے ہی حکومت نے مہاتما جی کو قید کر دیا اور
سول نافرمانی کا جو بہتر سے بہتر موقع مہاتما جی کی گرفتاری نے دیا تھا اسے ان

لیڈروں نے ہاتھ سے نکال دیا اور اپنی غفلت شعاری اور سست رفتاری پر پردہ ڈالنے کے لئے حکومت کی وضع کردہ ایک چال چلی اور ایک تحقیقاتی کمیٹی کو سول نافرمانی کے متعلق رائیں لینے کے لئے سارے ہندوستان میں گھما چھوڑا۔ حالانکہ اگر کوئی امر دریافت طلب تھا تو ایک گشتی چٹھی بھی اس کے لئے کافی تھی۔

ان مسلسل غلطیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ متحدہ کانگریس میں فرقہ بندی شروع ہوگئی اور چونکہ سول نافرمانی کرنے کی ہمت نہ تھی اور ملک کو کسی نہ کسی طرح اطمینان بھی دلانا تھا کہ ہم لوگ بے کار نہیں ہیں کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں اس لئے کونسلوں میں جاکر جنگ زرگری کرنے کا ایک جماعت نے فیصلہ کر دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ جماعت خود بھی اسے جنگ زرگری سمجھتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو طبائع سول نافرمانی کو ایک قابل عمل کارروائی نہیں سمجھتی تھیں تاہم ان سے اتنا ضبط بھی نہ ہو سکتا تھا کہ حکومت کے منہ نہ لگیں نہ اتنا تیتا ہو رہا جا سکتا تھا کہ گاؤں گاؤں پھر کر ملک کی قوت کو بڑھائیں اور اسے آئندہ سول نافرمانی کے لئے تیار کریں، وہ کونسلوں کی نقلی جنگ کی طرف جھک پڑیں۔

گیا میں کانگریس کے صاف دو ٹکڑے ہو گئے۔ ادھر ملابار کے جھگڑے کا خمیازہ پنجاب کو بھگتنا پڑا۔ مہاتما جی کے قید ہو جانے پر مالوی جی کو جو موقع ملا اسے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور پنجاب کے ہندو پریس کی تحریروں اور مالوی جی کی تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ شمالی ہندوستان کے ہندوؤں کو یقین ہو چلا کہ مہاتما گاندھی نے ان کی غلط رہنمائی کی اور جو کچھ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے لئے کیا تھا اسے ہندوؤں کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ناانصافی سمجھا جانے لگا۔ سنگھٹن یا تنظیم ہر ملت کا ہر حالت میں فرض ہے لیکن جس زمانے میں یہ اصطلاحیں پہلے پہل استعمال ہونا شروع ہوئیں اس وقت ان کا صاف مطلب یہی تھا کہ ایک ملت کو دوسری

لت کے مقابلے کے لیے تیار کیا جائے۔ جب مالوی جی نے سنگٹھن کی سرپرستی فرمائی تو انھیں کی طرح سے حکومت پسند مسلمان بھی ہندو کے مقابلے کے لیے کھڑے ہونے لگے اور مالوی جی نے تو مہاتما جی کو کبھی بھی اس طرح کہا ہوگا کہ اس کی تاویل نہ کی جا سکے مگر ان جیسے مسلمان جو ان کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے انھوں نے خلافت والوں اور بالخصوص علی برادران کو علانیہ اور نام لے لے کر اس طرح برا کہنا شروع کیا کہ کسی تاویل کی گنجائش باقی نہ رہی۔

اسی زمانے میں سوامی شردھانند نے ملکانوں کی شدھی کی ٹھان لی اور سارے شمالی ہندوستان میں ایک آگ سی لگ گئی۔ جمیعت خلافت ایک خاص متعین اور محدود مقصد کے لیے بنائی گئی تھی اور اس میں بہت سے ہندو بھی شامل تھے اور بعض اضلاع میں تو ہندو اس کے عہدہ دار بھی تھے۔ جمیعت خلافت اس لیے تبلیغ کا کام اس وقت تک شروع نہیں کر سکتی تھی جب تک اس کے قانون اساسی کو نہ بدلا جائے۔ البتہ مسلمانوں کی جو جماعت خلافت کمیٹی اور کانگریس دونوں کے خلاف تھی حکومت کی خوشامدی تھی اور ہندو مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کو بری نظر سے دیکھتی تھی اور خلافت والوں اور کانگریسی مسلمانوں کو اس کے متعلق طعنے دیا کرتی تھی وہی حقیقتاً ہندو سبھا اور سنگٹھن والوں کی مدمقابل تھی۔ اس جماعت نے تنظیم اور تبلیغ کا نام تو اس قدر لیا کہ آج تک ہر شہر کے ہر محلے اور ہر ضلع کے ہر گاؤں کی تنظیم ہو جانا چاہیے تھی اور اسلام کا پیغام دیہات کے جاہل اور مذہب سے ناواقف مسلمانوں ہی تک نہیں بلکہ تمام ہندوؤں تک بھی پہنچ جانا چاہیے تھا مگر یہ جماعت اپنی مدمقابل ہندو جماعت کی طرح کام کرنے والی جماعت نہ تھی بلکہ صرف نام چاہنے والی تھی۔

رائے بہادر لاکھ حکومت کی خوشامد کرے مگر وہ اپنی دولت، اپنا وقت

اور عمال حکومت کے حلقوں میں حاصل کردہ رسوخ کو اپنی جاتی کے لیے استعمال
بھی کیا کرتا ہے، مگر "خان بہادر" جب حکومت کی خوشامد کرکے عمال حکومت کے
حلقوں میں کچھ رسوخ حاصل کرتا ہے اور اپنی ملت کا نام لے کر اس کی طرف ان
عمال کی بے اعتنائی اور بے مہری کی شکایت کرکے انھیں اس کی طرف مائل کرتا
ہے تو اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اپنے لیے کوئی اور خطاب پالیتا ہے یا نہروں کے
پاس نکلی ہوئی اراضی کے کچھ مربعے حاصل کرلیتا ہے۔ "ملت" کے لیے چند عہدے
لے مرتا ہے مگر "ملت" اپنے بیٹوں، دامادوں، بھتیجوں اور بھانجوں ہی تک محدود
ہوتی ہے۔ غریب مسلمان غریب ہندوؤں سے کہیں زیادہ ہمت والے، غیور،
اور مذہب و ملت کے فداکار اور شیدائی ہیں لیکن امیر مسلمان امیر ہندوؤں سے
کہیں زیادہ عشرت پسند، نفس پرست اور خود غرض ہیں اور یہی حال ایک دو کو چھوڑ کر
والیان ریاست کا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نہ تعلیم ملی میں، نہ تنظیم میں، نہ تبلیغ میں
ہمارے "خان بہادروں" نے جو کانگریس اور خلافت والوں کے خلاف تھے اس کا
عشر عشیر بھی نہیں کیا جو ہندوؤں کی تعلیم میں، سنگھٹن میں اور شدھی میں "ہندو
رائے بہادروں" نے کیا۔ البتہ مالوی جی کے ساتھیوں نے مہاتما گاندھی کے
اثر کو اس بیدردی کے ساتھ ہندوؤں میں نہیں مٹانا چاہا جس بے دردی کے
ساتھ خلافت والوں کے اثر کو ہمارے "خان بہادروں" نے مسلمانوں میں مٹانا چاہا!
مگر مہاتما گاندھی کا اثر ہندوؤں میں کم بھی ہوگیا تو ہندو جاتی کو اسی قدر نقصان ہوا
اور میرے نزدیک یہ عظیم الشان نقصان ہے، کہ ملک کی آزادی کی دوڑ میں
وہ پیچھے رہ گئی۔ یہ نہیں ہوا کہ ہندوؤں کی مردانہ وار نہ تعلیم یا سنگھٹن یا شدھی کے
لیے روپیہ نہ ملا اور ہندو سبھا کی ساکھ ہندو جاتی میں قائم نہ ہوئی ہو لیکن خلافت والوں
کا اثر مسلمانوں میں کم ہوا تو یہی نہیں ہوا کہ مسلمان بھی آزادی کی دوڑ میں پیچھے

رہ گئے بلکہ یہ بھی نہ ہوسکا کہ تنظیم و تبلیغ کے نام لیواؤں کی ساکھ قائم ہو جاتی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی نام نہاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہی کامیاب اور ملت کی فیاضی کے چشمے سے سیراب ہوتی ہوتی۔ "خان بہادروں" کی جیبیں اس طرح تعلیم ملی اور تنظیم و تبلیغ کے لئے ہرگز خالی نہ ہوسکیں جس طرح "رائے بہادروں" کی جیبیں ہندو جاتی کی تعلیم سنگھٹن اور شدھی کے لئے خالی ہوئیں۔ ہندو اب بھی اپنی جاتی کے لئے روپیہ دے رہے ہیں اور حاصل کر رہے ہیں مگر مسلمان ہیں کہ "ملت" اسلامیہ کے لئے نہ روپیہ دے رہے ہیں نہ حاصل کر رہے ہیں۔ جو غریب اور متوسط الحال مسلمان خلافت کو باوجود حکومت کی سخت مخالفت کے بھی تین سال میں تقریباً ساٹھ لاکھ روپیہ دے چکے تھے "چھوٹانی سیٹھ" کی اندوہناک حرکت کے بعد سے وہ بھی ہاتھ روک بیٹھے ہیں۔

بہرحال ہندوستان کی آج یہ حالت ہے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کے خلاف سنگھٹن کے لئے سرگرم ہیں اور تبلیغ کے مذہبی اور روحانی فرض کو اس طرح ادا کر رہے ہیں کہ ایک غیر مذہبی اور مادی طریقے کی تحریک شدھی جاری ہے۔ مسلمان بھی تنظیم کا بہت نام لے چکے، مگر آج سے زیادہ مسلمانوں میں کبھی بھی فقدان نظام ملی نہ تھا اور تبلیغ تو درکنار، فتنۂ ارتداد سے تحفظ کے لئے بھی جو دیہاتی مدارس چند علاقوں میں کھولے گئے تھے تقریباً سب کے سب بند ہیں، دس فی صدی سے زیادہ باقی نہ ہونگے۔ قومی درسگاہیں یا بند ہوگئیں یا سسک رہی ہیں۔ حکومت کی زیر اثر جو تعلیم گاہیں قائم تھیں وہ غلامی کی ذہنیت کو سارے ملک میں پھیلا رہی ہیں۔ کم ہمتی، خود غرضی اور نفس پرستی کا دور دورہ ہے۔ سوراج پارٹی کی بغاوت کے اندر سے خود اسی کے خلاف "جوابی تعاون" کی بغاوت نکل پڑی اور جو حالت ۱۹۲۳ء کے انتخابات عام کے بعد

نظر آتی تھی وہ بھی آج ۱۹۲۶ء کے انتخابات کے بعد نظر نہیں آتی۔ سال گذشتہ میں اسی زمانے میں سوراج پارٹی اسمبلی اور کونسلوں کو چھوڑ کر چلی آئی تھی جس کے صاف یہ معنی تھے کہ اگر نئے انتخابات میں گذشتہ انتخابات سے زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی تو سوراج پارٹی اپنی گیا والی بغاوت سے تائب ہو کر پھر اسمبلی اور کونسلوں کی تفضیع اوقات میں حصہ نہ لے گی مگر افسوس کہ پھر تفضیع اوقات میں حصہ لیا گیا اور کہا گیا کہ نہیں اس بار ہم زیادہ کامیاب رہے ہیں اور ہم تین مہینے کے اندر اندر اسے ثابت کر دیں گے۔

میں نے گوہاٹی میں عرض کیا تھا کہ انتخابات کے نتائج حسب دل خواہ نہیں مارچ ۱۹۲۶ء کی "واک آؤٹ" کے بعد انہی نشستوں کے پر کرنے کے لئے جنوری ۱۹۲۷ء میں "واک اِن" سے کیا فائدہ؟ مگر میری ہنسی کی گئی اور بعض سوراجیوں نے فرمایا کہ یہ تو نو چینجروں کی نہ بدلنے والی ذہنیت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جو کچھ میں نے التماس کیا ہے وہ اسی قدر ہے کہ مارچ ۱۹۲۶ء کی سوراجی ذہنیت اور جنوری ۱۹۲۷ء کی سوراجی ذہنیت میں تضاد اور تباین نظر آ رہا ہے اس کو نو چینجروں کی ذہنیت سے کیا علاقہ؟ سری جبت جے۔ ایم۔ سین گپتا صاحب کلکتے کے رئیس البلدیہ اور دس کے جانشین نے ارشاد فرمایا کہ کل تین مہینے کی بات ہے، مارچ ۱۹۲۷ء میں معلوم ہو جائے گا کہ اسمبلی اور کونسلوں میں سوراجیوں کا اقتدار و اثر کس قدر ہے۔ میں نے تین ماہ اور انتظار کرنے کو قبول کیا اور کہا کہ اب یہ بھی وعدہ ہے کہ تین ماہ بعد نئے تجربے کی بنا پر فیصلہ کیا جائے گا لیکن اسی وقت ایک اور سوراجی بھائی نے کہا کہ نہیں یہ سری جبت جے۔ ایم۔ سین گپتا کی ذاتی رائے ہے یہ سوراج پارٹی کی طرف سے عہد و پیمان نہیں ہے۔ یہ ایک اپوزیشن کی آواز تھی لیکن میں نے بھی یہ ٹھان لی کہ جہاں ہم جیسے نو چینجروں نے سوراجیوں

کی خاطر اپنے تئیں یہاں تک مٹا یا وہاں آتنا اور بھی کرنا چاہیے کہ جو لوگ انتخابات کے لیے سوراجی ٹکٹ پر کھڑے نہ ہوئے تھے تاہم کامیاب ہوگئے اور اب اسمبلی میں شریک ہوں گے۔ ان میں سے جتنوں پر اثر ڈالا جا سکے ڈالا جائے۔ انھیں بھی سوراجیوں کے ساتھ ووٹ دینے پر آمادہ کیا جائے۔ اسی باعث میں جنوری کے چند اجلاسوں میں اپنے اخبار کے ٹکٹ کے ذریعے سے شریک ہوا اور اسی میں کوشش شروع کی۔ مگر افسوس کہ سوراج پارٹی کی کامیابی کی مطلق صورت نہ نظر آئی۔ آج سے زیادہ کبھی حکومت مطمئن نہ تھی اور آج عمال حکومت ان تارکین تعاون پر ہنستے ہیں جو ترک تعاون کرنے اسمبلی میں آئے ہیں۔ سولہ پینس اور اٹھارہ پینس کی جنگ بھی عام افسردگی کو کسی قدر کم کرنے کا باعث نہ ہوئی۔ اگر سر پرشوتم داس سر وکرز دیسون اور مسٹر برلا کی طرح کے دو تین غیر سوراجی تاجر اس قدر زور نہ لگاتے۔ بظاہر اس سیشن میں یہی ایک جنگ ہونے والی تھی لیکن اس نے بھی میری نبض کی حرکت کو تیز نہ کیا اور چونکہ ۶ مارچ کو جس دن یہ جنگ شروع ہوئی سوامی شردھانند کے قتل کے مقدمے میں وکلا کی آخری بحث ہونے والی تھی اس لیے میں لنچ کے بعد اسمبلی میں نہ ٹھہر سکا اور جتنی دیر تک ٹھہرا تھا اُس وقت تک جو سنا تھا اس نے ۸ مارچ کو بھی اسمبلی جانے پر آمادہ نہ کیا۔ بالآخر سنا کہ بہت سے مسلمانوں نے مسٹر جناح کی نام نہاد لیڈری کا بھانڈا پھوڑنے اور سوراجی ہندوؤں کو بھی یہ جتانے کی غرض سے کہ ان کی امداد بھی مفید اور ان کی مخالفت بھی غیر مفید ہو سکتی ہے فیصلہ کیا ہے کہ وہ حکومت کے ساتھ ووٹ دیں گے۔ چنانچہ ۱۶ پینس والوں کو بھی باوجود سوراجیوں، ہندو سبھائیوں، اور سر پرشوتم داس کی نام نہاد پارٹی کے نام نہاد لیڈر، مسٹر جناح کے اتحاد و اتفاق کے تین ووٹوں سے شکست ہوئی۔ اس کے بعد بجٹ مسترد کرنے کا کسے خیال

ہو سکتا تھا؛ میں نے سمجھ لیا کہ اب "سیر دیکھنے کے لئے" بھی اسمبلی جانا فضول ہے۔

البتہ ایک غیر سیاسی کام کے لئے عمال حکومت میں سے اپنے ایک بہت ہی پرانے دوست اور ہم جماعت سے ملنا تھا اس لئے ۱۵ مارچ کو جو بجٹ کی مانگوں پر بحث کے لئے ایک آخری دن مقرر تھا اسمبلی جا نکلا۔ پریس گیلری تک جانے کا ارادہ نہ تھا مگر ایک دو ممبران اسمبلی اور باشندگان "نئی دہلی" کے ساتھ ہی میں اپنی اس "پرانی دہلی" کو واپس آتا تھا ان کے انتظار میں باہر بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو پریس گیلری کی طرف رخ کیا۔ دیکھا تو فوج کے متعلق ایک "زوردار بحث" ہو رہی ہے اور دیوان چمن لال صاحب ہندوستانی غربا کے عشرت پسند حامی، سوراج پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے سابق نائب جو آج ہندو سبھا کے پر جوش نیتا اور مالوی جی کے نائب ہیں، لالہ لاجپت رائے اور ہندو جاتی کے سب سے بڑے سردار پنڈت مدن موہن مالوی حکومت کے خلاف پورے اتفاق رائے کے ساتھ دھواں دھار تقریریں کر رہے ہیں اور مسلمان بھی ان کے ہم آواز نظر آتے ہیں؛ اس لئے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس جلسے کی کارروائی دیکھتا رہا اور تقریریں سنتا رہا۔ سب سے زیادہ پر جوش تقریر لالہ لاجپت رائے کی تھی اور جوں جوں اس کو سنتا جاتا تھا ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کی یاد تازہ ہوتی جاتی تھی اور ۱۹۲۳ء سے جو تفرقے کا دور شروع ہوا ہے اس کی یاد دل سے محو ہوتی جاتی تھی، مگر اسمبلی میں ایک ایسے بزرگ بھی ہیں جو خود تو مشکل ہی سے کبھی تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں مگر ہر تقریر کرنے والے کی تقریر میں اتنی بار نامعقول طریقے سے دخل در معقولات کیا کرتے ہیں کہ اسمبلی میں ان کی ساری مداخلتوں کا مجموعۂ الفاظ مالوی جی کی طول طویل تقریروں کے مجموعۂ الفاظ سے بھی بڑھ جاتا ہے، کبیر الدین صاحب نے لالہ جی کی تقریر میں بھی دخل دیا اور فرمایا

کہ ہندو مسلم تنازعات کی بابت کیا کہتے ہو۔ میرا خیال تھا کہ لالہ جی ان کی نوعیت کی طرف توجہ نہ فرمائیں گے مگر انھوں نے توجہ ہی نہ فرمائی بلکہ ایک ایسی پرزور معقول اور سچی تقریر کی کہ میرا تو جی خوش ہو گیا۔ وہ کیا تھی اس کے متعلق انشاءاللہ کل کچھ عرض کروں گا۔ آج اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ اس کو سن کر غالب کا جو شعر زبان پر آئے بن نہ رہ سکا اسے ہدیہ قارئین ہمدرد کروں۔ وہ شعر یہ تھا ؎

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

اس وقت سے اس وقت تک یعنی تقریباً چوبیس گھنٹے ہو جانے پر بھی یہی الفاظ زبان سے نکل رہے ہیں کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"۔ کاش ہندو مسلمان سوراجی اور ہندو سبھائی سب کے سب سوچیں اور سمجھیں کہ آج کی جنگ وجدل کے بدلے آپس میں اتحاد و اتفاق ہوتا تو کیا ہوتا!

(۱۰) لاڑکانہ (سندھ) کے واقعات

ہندو خبر رساں ایجنسیوں کی بے ایمانی

ہمدرد ۱۰ اپریل ۱۹۲۶ء

بدنصیبی سے جو فضا آج ہندو مسلم تنازعات نے ملک میں پیدا کر دی ہے اس نے تنازعات کو ایک متعدی مرض سا بنا دیا ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ملک بھر میں ایک وبا پھیلی ہوئی ہے جس کے باعث کسی کے متعلق بھی پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس موذی مرض میں مبتلا ہونے سے ضرور بچ سکے گا۔ اس وبا کے پیدا کرنے والے عوام نہیں تھے بلکہ خواص ہی تھے اور سیاسی رہنماؤں اور اخبار نویسوں ہی سے اس کا آغاز ہوا۔ اس لئے اصل میں کسی سیاسی شخص یا اخبار نویس کے متعلق پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہی نہیں کہ وہ اس وبا کے پھیلانے کی کوشش نہیں کرے گا بلکہ خود بھی اس متعدی مرض سے بچا رہے گا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس ہندوستان کی سب سے زیادہ وقیع خبر رساں ایجنسی ہے اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں اس کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان کے اخبارات کا اسی پر زیادہ تر انحصار اور دارومدار ہے اور اگر یہ ایجنسی بھی اس وبا میں مبتلا ہو گئی تو پھر اخبارات اس سے کس طرح بچ سکیں گے؟ کوئی اخبار اس سے لاکھ بچنا چاہے مگر جب خبر ملنے کا یہی ایک ذریعہ ہے تو کیا کیا جائے؟ ایک مرتبہ غالباً لارڈ روزبری سابق لبرل وزیر اعظم انگلستان نے اس شکایت کے متعلق جو بعض انگریزی اخبارات کے ناطرف دار نہ رہنے کی کی گئی تھی

کہا تھا کہ اخبارات کے مضامین پڑھتے ہی کیوں ہو؟ میں تو صرف خبریں پڑھ لیا کرتا ہوں۔ مگر یہ ایک نسل پہلے کی حالت تھی۔ آج لارڈ روزبری بھی کسی اخبار بین کو اخبارات کی طرف داریوں سے غیر متاثر رہنے کے لئے یہ نسخہ نہیں لکھ سکتے کیونکہ خبر رساں ذرائع خود ہی گندے ہیں، وہ لوگوں کو ماءِ مصفا کہاں سے لا کر دیں گے؟ آج یورپ اور امریکہ بھر میں اخبارات کی خبریں "لیڈنگ آرٹیکل" سے زیادہ ایڈیٹروں کی زیر بار منت ہوتی ہیں۔ جب ہمارے استادوں کا یہ حال ہے تو ان کے شاگردوں کا کیا پوچھنا؟ حقیقت یہ ہے کہ آج ہندو مسلم تنازعات کی خبروں کے متعلق جو ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوتی ہیں یہ کہنا بالکل ناممکن ہے کہ ان سے صحیح واقعات کا پتہ لگ جائے گا اور خبر بھیجنے والے کے تعصبات مذہبی اور سیاسی رجحان کا ان کی بھیجی ہوئی خبر پر اثر نہ پڑا ہوگا۔ مگر جو کچھ لاڑکانہ کے واقعات کے متعلق اخبارات میں شائع ہوا ہے اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ ایسوسی ایٹڈ پریس کی بھیجی ہوئی خبروں پر تبصرہ کروں اور ہندوستان کی اس سب سے بڑی ایجنسی کے ذمہ دار حضرات کو اس کی اصلاح کی طرف متوجہ کروں۔

اس کے مقامی ایجنٹ جو اسے مقامی خبریں ارسال کیا کرتے ہیں غالباً تقریباً تمامتر ہندو ہیں اور ممکن ہے کہ جن مشکلات کا خود مجھے چند مسلمان سب ایڈیٹروں کے حاصل کرنے میں سابقہ پڑا ہے انہی نے اس ایجنسی کو بھی مجبور کر دیا ہو کہ ہندوؤں ہی سے کام لے۔ لیکن وجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو اور کسی قدر معقول کیوں نہ ہو ایسی حالت میں اس کے ذمہ دار کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ ان ہندو ایجنٹوں کی بھیجی ہوئی مقامی خبروں پر جو ہندو مسلم تنازعات کے متعلق ہوں پوری تجسس اور احتساب کی نظر ڈالیں اور اس وقت تک ان کے شائع کرنے سے احتراز کریں جب تک کہ تحقیق نہ کر لیں کہ ہر واقعے کے متعلق طرفین کے بیانات ذمہ دار اشخاص سے حاصل

کردیے گئے ہیں۔ اگر کسی وقت ممکن نہ ہو تو کم از کم مراس خبر کے شائع کرتے وقت جس کے
راوی ایک ہی فریق کے ہوں ایسوشی ایٹڈ پریس کو چاہیے کہ اس حقیقت کو بھی شائع
کردے تاکہ اخبار پڑھنے والے اس یک طرفہ بیان سے اس طرح متاثر نہ ہو جائیں
جس طرح وہ طرفین کے دیے ہوئے متفق علیہ بیان سے متاثر ہوتے۔ افسوس ہے
کہ لاڑکانہ کے واقعات کی خبروں کو ایسوشی ایٹڈ پریس نے اس طرح اخبارات میں
شائع نہیں کرایا اور اس پر مستزاد یہ کہ جو مفصل بیان سندھ کے پانچ ذمہ دار سے ذمہ دار
مسلم لیڈروں نے آج سے کئی دن پیشتر شائع کرایا ہے اس کو ایسوشی ایٹڈ پریس نے
قطعاً نظر انداز کر دیا اور جب اخبارات کو بھیجا تو اس غلط طریقے پر کہ واقعات کے
متعلق جو اہم ترین حصہ تھا اس کو بالکل حذف کر دیا اور اخبارات کو ارسال کیا تو صرف
وہ آخری حصہ جس میں ان مسلمان لیڈروں نے لاڑکانہ کے مسلمانوں کی ان حرکات پر
نہایت شریفانہ اور منصفانہ طریقے پر اظہار نفرین و افسوس کیا تھا جو فوری اشتعال کے
باعث جس منٹ کے مختصر عرصے میں اور پیشتر اس کے کہ شہر کے سربرآوردہ مسلمان ان
سے کہہ بھی سکیں کہ اپنی طبیعتوں کو قابو میں لاؤ، ان سے سرزد ہو گئیں۔

تعجب تو یہ ہے کہ فوری اشتعال کا سبب تک ان مسلمان لیڈروں کے بیان
سے اخذ نہیں کیا گیا۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ پہلے ہندوؤں کا یک طرفہ بیان، خود فرد
قرار داد جرم اور اس کی تائید میں شہادت کے سوا کچھ نہ تھا، شائع کیا گیا اور پھر ملزم
کی طرف سے اقبال جرم شائع کر دیا گیا۔ اس کے بعد اخبار پڑھنے والوں سے فیصلہ سنانے
اور سزا دینے کے سوا اور کس چیز کی توقع ہو سکتی ہے؟ اسی قسم کی کارروائی مقامی ہندو
پریس عید کے دن کے کوچہ نشواں (غالباً کوچہ ناتواں) نے صاحب بہادروں کے
قتل اور تعجب سے اس کی یوں رٹ لگائی ہے، کے واقعے کے متعلق کر رہا ہے حالانکہ
اس واقعے میں تو قصور سراسر ہندوؤں کا معلوم ہوتا ہے اور مسلمان بالکل مظلوم ہیں۔

اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو ناممکن ہو جائے گا کہ کوئی مسلمان اخبار کسی ہندو خبر رساں ایجنسی کی بھیجی ہوئی خبر کو اپنے اخبار میں جگہ دے اور مسلمانوں کے اخبارات کو یا تو ایک مسلم خبر رساں ایجنسی کھولنی پڑے گی جس کا چلانا ایسی حالت میں آسان کام نہ ہوگا کہ اخبارات ہی کا چلانا مسلمانوں کے لئے محال سا ہو رہا ہے یا پھر اخباروں ہی کو بند کرنا پڑے گا، گو یہ بھی آسان نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے لئے ہر طرف مشکلات ہی مشکلات ہیں لیکن یہ کچھ کم مشکل نہیں کہ اس طرح غیر ثقہ ہندو راویوں کی روایتوں کو مسلمانوں کے اخبارات ہی مسلمانوں تک پہنچاتے رہیں۔

ایسوسی ایٹڈ پریس نے جو پہلا تار "ہمدرد" کو ارسال کیا تھا وہ لاڑکانہ کا نہ تھا بلکہ حیدر آباد (سندھ) کا تھا اور گو ہمیں معلوم ہے کہ وہ کن بزرگ نے بھیجا تھا تاہم جس ذریعے سے ہم کو بھیجنے والے صاحب کا نام معلوم ہوا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ ہم اس کی دی ہوئی اطلاع کو شائع کر دیں۔ البتہ اس کے ظاہر کر دینے میں کچھ حرج نہیں کہ ہمارے قیاس کی کہ یہ صاحب ہندو ہی ہوں گے تصدیق ہو گئی۔ یہ تار ۲۹ر مارچ یعنی وقوعے ہی کے دن کا ارسال کردہ ہے۔ اب اس کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"لاڑکانہ کا ایک تار اطلاع دیتا ہے کہ ہندوؤں نے ایک مسلمان عورت کو مع اس کے تین بچوں کے شدھ کر لیا تھا۔ اس پر ہندو و مسلمانوں میں آج لڑائی ہو گئی۔ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی دوکانیں لوٹ لیں اور چند ہندوؤں کے چوٹ آئی ہے۔"

اس خبر میں جو بات سب سے پہلے قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ مطلق بیان نہیں کیا گیا کہ لاڑکانہ کا تار کس نے بھیجا ہے اور کس کو بھیجا ہے۔ بھیجنے والا ہندو ہے یا مسلمان۔ دوسری بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ لڑائی کا سبب ایک

مسلمان عورت اور اس کے بچوں کا شدھ ہو جانا ہے جس کے صاف یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں
کو جو خود تو تبلیغ کو جائز اور ضروری سمجھتے ہیں ہندوؤں کی تبلیغ یعنی شدھی پر غصہ آگیا
اور انھوں نے لڑائی کی ابتدا کی۔ تیسری بات جو قابل توجہ ہے وہ اس صریح گمان
کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ یہ ہے کہ "مسلمانوں نے ہندو دوکانیں لوٹ لیں اور چند
ہندوؤں کے چوٹ آئی"۔ مسلمانوں کو نہ جسمانی گزند پہنچی نہ ان کا مالی نقصان ہوا یعنی ابتدا
بھی مسلمانوں ہی کی طرف سے ہوئی اور ہندوؤں کو تکلیف اور نقصان بھی انھیں نے
پہنچایا۔ اس سارے بیان میں ایک حرف بھی ایسا نہیں جس سے ظاہر ہو کہ مسلمان
عورتوں کو ہندوؤں نے لاڑکانہ لا کر کسی مکان میں بند کر رکھا تھا یا رکھ ہی چھوڑا تھا،
نہ اس کا ذکر ہے کہ ایک مسلمان کے تین لڑکے اور اس کی ایک بھتیجی جس کا شرعی نکاح
اس کی نو مسلم بیوی کے اس لڑکے سے ہوا تھا جو اس کے پہلے ہندو شوہر سے ہوا تھا
چاروں ہندوؤں کے قبضے میں تھے اور وہ مسلمان اور اس کے ساتھ ہزار اور مسلمان
سب ڈویژنل مجسٹریٹ کو درخواست دے کر ان مسلمانوں کو ان ہندوؤں کے قبضے سے
چھڑانا چاہتے تھے مگر مجسٹریٹ نے مداخلت کرنے سے انکار کیا تھا اور مسلمانوں کو ہدایت
کی تھی کہ عدالت دیوانی میں جا کر نالش کرو اور بالترتیب ۱۴ برس، ۱۱ برس اور ۹ برس
یعنی تین اچھی خاصی عمر کے لڑکے اور شادی شدہ بھتیجی سب کے سب باوجود اپنے مسلمان
باپ اور چچا کے ساتھ جانے پر مصر ہونے کے ہندو سبھائیوں اور آریہ سماجیوں کے حوالے
کر دیے گئے تھے باوجودیکہ وہ قرآن کریم کی آیتیں پڑھ پڑھ کر اپنے اسلام کا اظہار کر رہے
تھے اور اپنے مسلمان باپ اور چچا سے چھوٹنے پر زار و قطار روتے تھے اور ہندوؤں
کی طرف زبردستی دھکیلے جانے پر کمرۂ عدالت کی میزوں اور کرسیوں ہی کو پکڑتے اور
ان سے چمٹے جاتے تھے تاکہ غیروں کے پنجے میں پڑنے سے کسی نہ کسی طرح بچ سکیں۔
اگر ان امور کی طرف ایسوسی ایٹڈ پریس کے بیان میں ذرا سا بھی اشارہ ہوتا تو کون

منصف مزاج انسان سمجھتا کہ مسلمانوں کا سارا غصہ فقط اس بنا پر تھا کہ ایک مسلمان عورت مرتد ہو گئی لیکن اس بیان کے مصنف یا ان کے راوی، لاڑکانہ کے تار بھیجنے والے بزرگ کی جب یہ نیت ہی ہو کہ صحیح واقعات سے دنیا کو مطلع کیا جائے۔ جب نیت سیاسی اور مذہبی پروپیگنڈا ہو تو اس مختصر سے بیان سے بہتر کیا ہو سکتا ہے جس میں مسلمانوں پر لوٹ مار کا الزام لگایا ہے اور لوٹ مار کی ساری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک مسلمان عورت کو ان ستم رسیدہ ہندوؤں نے شدھ کر لیا تھا۔ اگر کہیں یہ بھی بتا دیا جاتا کہ "مسلمانوں کا غصہ" مسلمان لڑکوں اور عورتوں کا ہندوؤں کے گھر میں بند کئے جانے یا ایک مسلمان شادی شدہ لڑکی اور تین خاصی عمر کے مسلمان لڑکوں کا اپنے مسلمان چچا اور باپ سے اس دل خراش طریقے پر جدا کر کے غیروں اور ہندوؤں کے سپرد کئے جانے کی بنا پر بھی نہ تھا بلکہ اس فوری اشتعال کے باعث تھا کہ انھیں یکایک اطلاع ملی کہ ہندوؤں نے ایک آل رسول کو شہید کر ڈالا گو بعد کو تحقیق کرنے پر یہ خبر صحیح نہ نکلی بلکہ نہایت مبالغہ آمیز ثابت ہوئی۔ تب کون ذی عقل باور کر سکتا تھا کہ لاڑکانہ کے مسلمانوں کی وارفتگی کا سبب فقط ایک مسلمان عورت کا ارتداد تھا۔

ایسوسی ایٹڈ پریس کا دوسرا تار کراچی سے چلا ہے اور وقوعے کے دوسرے دن چلا ہے۔ تفصیلات اس میں بھی نہیں دی گئیں مگر اتنا ضرور بتایا گیا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دوپہر کو موقعہ پر جا پہنچ گئے اور دو بجے تک فساد موقوف ہو گیا۔ چند گرفتاریاں بھی ہوئیں اور ۴۰ مجروح شفا خانے میں داخل کئے گئے جن میں سے ایک کی حالت نازک ہے۔ مجسٹریٹ کی تحقیقات جاری ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ شہر لاڑکانہ میں آج صبح سکون ہے۔ مگر کراچی میں دونوں ملتوں کے لوگوں میں بہت جوش پھیلا ہوا ہے۔ اس تار میں ایسی کوئی چیز نہیں جس سے ہندو مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف جوش پیدا ہو سکے یا اخبار میں طبقے کی بے اطمینانی ہی میں کسی قسم کا اضافہ ہو اور گو ان مجروحین

کی تعداد جنہیں شفا خانے میں داخل کیا گیا تھا اتنی زیادہ بتائی گئی تھی کہ واقعے کی اہمیت ضرور بڑھ گئی تھی مگر چونکہ یہ نہیں ظاہر کیا گیا تھا کہ مجروحین ہندو ہی ہندو تھے یا ان میں ہندو مجروحین بہت زیادہ تھے۔ اس لئے اخبار بیں ہندوؤں کے قلوب پر کچھ بہت زیادہ تکلیف دہ اثر اس تار سے نہ پڑ سکتا تھا۔ سب سے زیادہ قابل توجہ یہ امر ہے کہ اس تار میں اس فساد کی وجہ نہ بتائی گئی کہ ایک مسلمان عورت کو ہندوؤں نے شدھ کر لیا تھا بلکہ اس سے کہیں صحیح تر وجہ بتائی گئی تھی اور ظاہر کیا گیا تھا کہ ایک عورت اور تین بچوں کا قبضہ ہندوؤں کو دلایا جائے یا مسلمانوں کو یہی امر دونوں ملتوں کے درمیان مابہ النزاع تھا۔

لیکن اسی دن حیدرآبادی ایجنٹ صاحب پھر چھوٹتے ہیں اور نہایت شرمناک طریقے پر پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ اب کیا تھا اب تو لاڑکانہ سے بھی اسی طریقے پر پروپیگنڈا ہوتا ہے اور کراچی تک یہ وبا پھیل جاتی ہے۔ انشاء اللہ "ہمدرد" کی اگلی اشاعت میں اس بے ایمانی کا بھانڈا میں نہایت تفصیل کے ساتھ پھوڑوں گا اور دکھا دوں گا کہ سندھ کے ہندو اخبار نویس اور سیاسئین کس طرح مسلمانوں کو بدنام کرتے ہیں اور اپنی تہمت تراشیوں سے حقیقت پر کس طرح پردہ ڈالتے ہیں جو کچھ دہلی میں ہوا ہے وہ بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔ خدا ہم پر رحم کرے۔

(۱) فسادات لاہور

ہمدرد ۱۰ مئی ۱۹۲۴ء

کوکناڈا میں کانگریس کا جلسہ ہو رہا تھا۔ سبجکٹس کمیٹی میں بہت سی ایسی چیزیں پیش کی جا رہی تھیں جو ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں پیش کی جایا کرتی تھیں۔ مجھے جیل سے چھوٹ کر آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور گو قید تنہائی کے باعث ملک کی حالت سے بالکل بے خبر رہا تھا تاہم دہلی کی اسپیشل کانگریس میں شریک ہو چکا تھا اور مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ملک کی حالت اب وہ نہیں رہی ہے جو میرے جیل جاتے وقت تھی مگر اس کو کیا کیا جائے کہ دل بار بار چاہتا تھا کہ ہمت کرو، بلند حوصلگی سے کام لو۔ کراچی کے مقدمہ والے قیدیوں کے چھٹ کر آنے اور یرودا جیل کی کنجی کی جستجو میں لگ جانے سے کوکناڈا کانگریس کے اور اراکین نے بھی پھر پریوں کی طرح ایک بار پھر سب کی امیدیں کچھ کچھ بندھنے لگی تھیں۔ لیکن جب کوئی زوردار تحریک پیش ہوتی تھی، پنجاب کی طرف سے آواز اٹھتی تھی کہ پنجاب اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ دہلی اسپیشل کانگریس میں خود پنجاب کے "ہیرو" ڈاکٹر کچلو نے پر امن خلاف ورزی کی تحریک پیش کی تھی تو پنجاب کے ہندو مسلمان دونوں ایک بار تو اپنے اختلافات کو بھول کر متفق اور متحد ہی ہو گئے تھے اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی تحریک کے خلاف تقریریں کرنا شروع کر دی تھیں۔ ایک ہندو اٹھتا تھا اور کہتا تھا کہ پنجاب اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ جب یہی سماں کوکناڈا میں بھی نظر آیا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول ہی اٹھا کہ پنجاب آخر سارا ہندوستان تو ہے نہیں، پنجاب تیار نہ سہی سارا ہندوستان تیار ہو جائے۔ اس پر میرے دوست اور پنجاب کانگریس کمیٹی کے

پرجوش کام کرنے والے اور عہدے دار، مدراس نژاد سرینیت ستانم نے ایک عجیب
فقرہ کہا جو اس دن سے آج تک میرے دل سے محو نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے فرمایا
کہ پنجاب سارا ہندوستان تو نہیں ہے لیکن پنجاب میں اتنا زہر بھرا پڑا ہے کہ سارے
ہندوستان کو ہلاک کر دے۔

جب ابتدائے دسمبر ۱۹۲۴ء میں مہاتما جی لاہور تشریف لے گئے اور مالوی جی
اور لالہ لاجپت رائے اور ڈاکٹر انصاری اور ہم دونوں بھائی بھی لالہ جی کے مکان
کے ایک کمرے میں جس میں مہاتما جی فروکش تھے جمع ہوئے اور پنجاب کے ہندو مسلمان
اور سکھ لیڈر بھی تشریف لائے اور ہندو مسلم فسادات کے متعلق بحث چھڑی تو مالوی جی
نے فرمایا کہ یہ جاہل عوام کا کام ہے۔ مجھے اس میں اختلاف تھا اور میں نے عرض کیا
کہ جاہل عوام محض آلۂ کار بنالئے جاتے ہیں۔ فساد کی جڑ تعلیم یافتہ خواص ہیں جو بڑی
بڑی سرکاری ملازمتوں اور سیاسی امتیازات پر ٹوٹے پڑتے ہیں اور اپنے ان
حقوق کو "حقوق ملی" کا نام دے کر عوام اور جہلا کو ابھارتے اور اشتعال دیتے
رہتے ہیں۔ عوام اور جہلا غریب ان کے دھوکے میں آجاتے ہیں اور ذرا سی دیر میں
مارنے اور مرنے لگتے ہیں۔ جب سر سے کچھ خون نکل جاتا ہے تو ٹھنڈے پڑ جاتے
ہیں لیکن تعلیم یافتہ اور خواص ایسی لڑائیوں سے جن میں سر پھٹول ہو دور ہی دور
رہتے ہیں اور ان کے ٹھنڈے پڑنے کا کوئی موقع نہیں آتا۔ فاؤنٹین پین سے
سیاہی برابر نکلتی رہتی ہے۔ خالی ہو جائے تو پھر بھر لو۔ ایک روپے میں اچھی خاصی
بوتل آجاتی ہے جو بیسیوں جرنلسٹ بہت سے اخبارات کے کالموں کو سیاہ کر سکتی ہے۔
یہ خون تھوڑے ہی ہے کہ ذرا سا نکل گیا اور فوراً ٹھنڈے پڑ گئے۔ مالوی جی اس
بات پر بہت ناراض نہ ہوئے تھے اور فرماتے تھے تب تو آپ تعلیم ہی پر الزام
لگاتے ہیں جس کے جواب میں میں نے عرض کیا تھا کہ بے شک جس طرح کی تعلیم

ہم کو دی جا چکی ہے اور جو آج بھی سوائے معدودے چند قومی مدارس کے ہر جگہ دی
جا رہی ہے میں اسے بس کی گانٹھ سمجھتا ہوں۔ اسی سلسلے میں میں نے پنجاب کے پریس
پر بھی اعتراضات کئے اور ان کو ہندوستان کے بہت سے فسادات کا سرچشمہ بتایا۔
اس پر لالہ جی بگڑ گئے اور فرمانے لگے کہ لاہور ان فسادات کا سرچشمہ نہیں ہے بلکہ رام پور
ہے۔ میں نے عرض کیا کہ وہ تو کبھی بھی نہ تھا لیکن بہرحال اب تو اس کو خشک ہی
سمجھئے اس لئے کہ ہم دونوں بھائی تو پانچ برس سے وہاں نہیں جا سکتے ہیں۔ اس پر
اسی غصے کی حالت میں بگڑ کر فرمایا کہ رام پور نہ سہی علی گڑھ فساد کا سرچشمہ ہے اور پھر
ارشاد ہوا کہ فسادات تو انبیٹھہ، سنبھل اور شاہ جہاں پور میں ہوئے ہیں، پنجاب میں تو ایک
جگہ بھی فساد نہیں ہوا۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ لاہور تعلیم یافتہ خواص کا مرکز ہے اور
ہم انبیٹھہ، سنبھل اور شاہ جہاں پور والے جہلا اور عوام ہیں۔ آپ خود نہیں لڑا کرتے صرف
ہمیں لڑوا دیا کرتے ہیں۔ تب مہاتما گاندھی نے فرمایا کہ گنگا نہ سہی ان فسادات کی
گنگوتری تو لاہور ہی ہے۔

اس وقت تک سارے ہندوستان میں وہ زہر پھیل چکا ہے جس کا سریت
ستا تم نے کوکناڈا کانگریس کی سبجکٹس کمیٹی میں ذکر کیا تھا اور لاہور کی گنگوتری سے
نکلی ہوئی گنگا جہاں جہاں گذری وہاں وہاں سیلاب آیا اور بہت سی زمین دریا برد ہو گئی
لیکن ۳ مئی کی رات کو خود گنگوتری میں بھی طوفان آ گیا۔ افسوس ہے کہ لالہ جی کی صحت
نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ سیٹھ برلا کے چند ہی ہفتے بعد یورپ تشریف لے جائیں اور
ممکن ہو تو ۱۹۲۹ء کے اس کمیشن سے جو اب بلا ہماری استدعا کے ۱۹۲۷ء ہی میں
کنزرویٹو پارٹی کی اشد ضرورت سے مقرر ہونے والا ہے اپنی "صحت" کی "اصلاح"
کرائیں۔ اگر وہ آج لاہور میں ہوتے تو میں ان سے عرض کرتا کہ لیجئے اب تو فسادات
کے نور کا ظہور خود جناب کے وطن مالوف سے ہو گیا اور جو نہ انبیٹھہ میں ہوا نہ سنبھل میں

اور سہارن پور میں ہوا، شاہ جہاں گنج میں، وہ لاہور میں ہو گیا اور عین اسی دن جس دن آپ نے سارے ہندوستان میں شواجی مہاراج کی سہ صد سالہ سال گرہ منوائی، جن کی شان میں بڑے زور شور کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ انھیں نے ہندو دھرم اور ہندو دیویوں کی عصمت کو تلوار سے بچایا۔ دھرم کی تلوار باندھنے والے سکھوں نے ہندو جاتی کی شرکت میں مسجد سے نکلنے والے نہتے مسلمانوں پر کرپانیں چلائیں اور تین کو اسی وقت ٹھنڈا کر دیا اور چار پانچ کو زخمی کیا جن میں سے ایک دوسرے دن اس دنیا سے چل بسا۔ اب کہیے کیا ارشاد ہوتا ہے؟

"ہندوستان ٹائمز" جو آپ کی اس قومی تحریک کا "سرکاری آرگن" ہے فسادات کی گنگوتری کے اس طوفان کو مسلمانوں کی ان تقریروں کا نمونہ بتاتا ہے جو ایسٹر کی تعطیلات کے جلسوں میں ہوئی تھیں اور "پرتاپ" تو نام لے کر ..... "نظامی" کے اس ڈھونگ سے جو "نو مسلم مہاراجا" اور "۵ لاکھ نو مسلم راجپوتوں" کے متعلق اس وقت کیا گیا تھا فسادات کا ڈانڈا ملاتا ہے۔ حالانکہ اس کو ان سے کیا واسطہ؟ نہتے مسلمانوں پر اس بزدلانہ بے دردی سے کرپانوں سے حملہ ہونے اور ان کے اس طرح شہید اور زخمی ہو جانے کی خبر ملتے ہی لاہور کے اسی قسم کے بے ایمان ہندو اخبارات کے "خبروں" کے گھڑنے اور "واقعات" کے اختراع اور "اسباب" کے ایجاد اور سرخیوں کے وضع کرنے پر جھک پڑے، گو اس حکومت نے جس کے ساتھ ظفر علی خاں صاحب "سیاسی موالات" کرنے کے لیے بے حد متمنی تھے ان میں سے ایک کو بھی "گمراہ کن" چیزوں کو شائع کرنے پر ضبط نہیں فرمایا اور سب سے پہلے ہاتھ صاف کیا تو "زمیندار" ہی پر اور اس کے بعد "انقلاب" پر۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ دفعہ ۹۹ (الف) ضابطہ فوجداری کی رو سے ضبطی کا وارنٹ جاری کیا گیا حالانکہ وہ دفعہ محض ان کتابوں، اخباروں اور دوسری دستاویزوں

کے متعلق ہے جن میں ایسا مواد ہو جس کا شائع کرنا دفعہ ۲۹۸ (الف) تعزیرات ہند کی رو سے جرم ٹھہرایا گیا ہے۔ البتہ جب رات میں نے لاہور کو ٹیلیفون کر کے چیف سکریٹری صاحب سے دریافت کیا تو مجھے اطلاع دی گئی کہ "انقلاب" نے مسلمان عورتوں کی توہین کے متعلق ایک "گمراہ کن" (Misleading) خبر شائع کر دی تھی۔ اس لئے ۴ مئی کا انقلاب ضبط کر لیا گیا اور جو اخبار کوئی "گمراہ کن" خبر شائع کرے گا اس کو ضبط کر لیا جائے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے فسادات کی جڑ وہ ہندو ذہنیت ہے جس نے اس کا ہر طرف پروپگنڈا کرا لیا ہے کہ ہندو دیویوں پر مسلمان ہاتھ ڈالتے رہتے ہیں اور ان کی عصمت کی حفاظت اسی طرح کی جا سکتی ہے جس طرح ان لوگوں کی "تاریخ دانی" کے مطابق چھترپتی شیواجی مہاراج نے تلوار سے کی تھی حالانکہ یہی ذہنیت تھی جس نے یہ جھوٹی اور "گندی تاریخ" بھی گھڑوائی ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی ایک لڑکی شیواجی کو اپنا دل نذر کر کے ان کے پاس بھاگ گئی تھی اور "شدھ" ہو کر اس نے اپنی عصمت کو بھی ان کی نذر کر دیا تھا۔

۳ مئی کو رات کے وقت ٹھیک ۹ بجے ان چھترپتی مہاراج کی سہ صد سالہ جینتی ...... یا شادی منائی جاتی ہے اور اس یادگار کے ذریعے سے ہندو دیویوں کی عصمت کی حفاظت کا انتظام کیا جاتا ہے اور اسی دن کچہری میں ایک مقدمے کی سماعت ہوتی ہے جس میں ایک نوجوان مسلمان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے ایک سکھ دیوی کی چھاتیاں پکڑی تھیں اور اس کی بانہہ مروڑ کر اس کی چوڑیاں توڑ دی تھیں۔ اور اسی دن ایک سکھ جیون سنگھ نامی ہر گلی کوچے اور سر بازار میں صدا لگاتا پھرتا ہے کہ ایک مسلمان نے "ایک سکھ دیوی کی اس طرح توہین کی اور وہ اس طرح اس کی عصمت دری کے درپے ہوا۔" آج رات کو باؤلی صاحب کے گوردوارے

میں "دیوان" منعقد ہوگا جس میں انتظام کیا جائے گا کہ ہندو اور سکھ دیویوں کی عصمت
کی مسلمانوں سے حفاظت کی جائے اور ان کو ایک سبق سکھایا جائے گا اور اب میرا
نام "جیون سنگھ" نہیں ہے میں "مرن سنگھ" ہوں۔ اور اسی "دیوان" سے سینکڑوں سکھ
اپنا مذہبی ہتھیار "کرپان" باندھے ہوئے نکلتے ہیں اور بہت سے ہندو بھی ان کے
ساتھ ہوتے ہیں۔ اور وزیروں کی ایک مسجد سے نماز عشاء سے فارغ ہو کر اکا دکا نہتے
مسلمان نکلتے ہیں جن میں ۶۰۔۷۰ برس کے بوڑھے بھی ہوتے ہیں، ۴۵ برس کے
ادھیڑ بھی اور ۲۵۔۳۰ برس کے نوجوان بھی اور قریب ہی ایک ۱۲۔۱۴ برس کا ہندو بچہ
بھی دھوتی اور کیپ اور شلوار پہنے ہوئے مسلمان معلوم ہوتا ہے، اور ان پر کرپانوں
کے وار کئے جاتے ہیں اور ان کو شہید کیا جاتا ہے۔ اور اگر ہندو بچہ یہ نہ کہتا کہ میں تو
مسلمان نہیں ہوں تو وہ بھی ۶۰۔۷۰ برس کے بوڑھے مسلمان کے ساتھ اسی وقت راہی
ملک عدم ہوتا، لیکن اس شرمناک واقعے کو اس ذہنیت کے ساتھ منسوب نہیں کیا جاتا
جو اسی دن اور اسی وقت چھترپتی "شیواجی مہاراج" کی "سہ صد سالہ جینتی" یا "تیری
شتابدی" منوانے کا اس غرض سے سبب ہوئی کہ ہندو دیویوں کی عصمت کی تلوار سے
حفاظت کی جائے بلکہ ایک ذہنی مسلمان کے اس ڈھونگ کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے
جس نے مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر اس ناکارہ "مجہول تبلیغ" کے راجہ کو "نشاۃ ثانیہ"
دلوانے کا سامان فراہم کیا تھا اور جس کو اپنی بے وقوفی پر شرمندہ مسلمان جلد سے جلد
دل سے بھلا دینے کی اسی دن سے کوشش کرنے لگے تھے۔ کوئی ہندو نہیں کہہ سکتا
کہ میں نے اس ذہنی کا بھانڈا نہیں پھوڑا۔ لاہور کے ان ہندو اخبارات نے بھی
جو مجھے گالیاں دینے پر اتر آئے ہیں میرے اس مضمون کو اپنے اپنے کالموں میں موٹی
موٹی سرخیاں دے کر شائع کیا جس میں میں نے اسی ذہنی کا دوسری بار بھانڈا
پھوڑا تھا لیکن جس طرح وہ انصاف کا خون تھا کہ اس شخص کو اس کی تحریری

تبلیغ کے باعث سوامی شردھانند کے قتل کی مصنوعی سازش میں شامل سمجھا جائے۔
اسی طرح یہ انصاف کا خون ہے کہ اس کو اس کے تازہ ڈھونگ کے باعث ان
...... میں ملوث کیا جائے جن کا تعلق براہ راست اسی ہندو ذہنیت سے ہے
جس نے پنجاب کے ہندوؤں کو مہاراشٹر کے ہیرو کی سہ صد سالہ سالگرہ کے منانے
میں اس قدر نمایاں حصہ لینے پر آمادہ کیا ہے۔

اب میں اپنے سکھ بھائیوں سے چند لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے آج تک
ان کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا اور جو کچھ ان کے متعلق کہا ہے وہ ان کی تعریف
ہی میں آیا۔ ان کے ساتھ ہمدردی ہی ظاہر کرنے کے لئے کہا ہے لیکن آج مجھے
کہنا پڑتا ہے کہ افسوس باوجود مذہب میں ہم سے اس قدر موافقت کے وہ معاشرت
ہی میں نہیں بلکہ سیاست میں بھی ہم سے اس قدر دور پڑ گئے ہیں کہ وہ ہندو جو اتحاد و
اتفاق کے دشمن ہیں انھیں آسانی سے اپنا آلۂ کار بنا لیا کرتے ہیں۔ اکالیوں کی لڑائی
یا حکومت سے تھی یا ہندو ادھیوں سے جو ان کے گوردواروں اور ان کی جاگیروں
پر قابض تھے جن میں سے بہتیروں کے متعلق ہم نے انھی کو ان کی شکایت کرتے
سنا تھا کہ وہ نہایت عیاش اور بُرے اخلاق کے ہیں اور کبھی کبھی ان کی عورتوں کی
عصمت پر ہاتھ ڈال بیٹھتے ہیں یا ان کا اغوا کرتے رہتے ہیں۔ ترک تعاون کی وجہ
سے مسلمانوں نے تو نہ ۱۹۲۰ء کے انتخاب کونسل میں حصہ لیا نہ ۱۹۲۳ء کے اب
اگر ...... حکومت نے اکالی تحریک کی مخالفت میں حکومت کو مدد دی تو یہ ان کا
قصور تھا نہ کہ ہر مسلمان کا۔ کاش ایک مسلمان بھی حکومت کو مدد نہ دیتا اور سب ڈاکٹر کچلو
اور ہماری طرح اکالیوں کے واسطے پر امن خلاف ورزی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے۔
مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہندوؤں نے سکھوں کے ساتھ وہی کیا جو ان کو کرنا چاہیے تھا۔
کیا جب ۱۳ نومبر ۱۹۲۳ء کو امرتسر میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو لالہ جی یا

پنجاب کے اور ہندو کانگریسی ہماری طرح پر اس خلاف ورزی کے لئے تیار تھے، کیا وہی
سب سے زیادہ اس کے مخالف نہ تھے؟ ساری دنیا جانتی ہے کہ جو مسودہ قانون
گوردواروں کے متعلق پنجاب کی کونسل میں پاس ہوا ہے وہ سکھوں کی حقیقی یا کم سے کم
پوری فتح تو نہیں ہے اور جو سکھ بھائی اب تک جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں وہ اس کا
بیّن ثبوت ہیں۔ اس لئے کوئی سکھ نہیں کہہ سکتا کہ مالوی جی نے اگر اس مسودۂ قانون
کے تیار کرانے یا اسے پاس کرانے میں کچھ امداد کی تو امداد ہی امداد تھی معاملہ اور سودا
نہ تھا لیکن جب کبھی مالوی جی اور لالہ جی کو مسلمانوں کے واجبی اور سیاسی مطالبات
نے تنگ کر دیا کیا ہمارے بعض سکھ بھائی فوراً ان کی کمک کو یہ کہہ کر نہ پہنچیں گے کہ
پنجاب میں ہم اقلیت میں ہیں۔ اگر مسلمان سارے ہندوستان میں اقلیت کے حقوق
کی حفاظت سے دست کشی کر لیں تو ہم بھی خاموش ہیں ورنہ ہم پنجاب میں اپنی اقلیت
کے لئے بھی مراعات کے طلب گار رہیں گے تاکہ ان صوبوں میں سے جہاں اصلاحات
جاری ہیں جن دو صوبوں میں مسلمانوں کی ذرا سی اکثریت ہے اور جس ایک صوبے
میں مسلمان تعلیم و ثروت کے لحاظ سے بھی ہندوؤں سے بہت زیادہ پیچھے نہیں ہیں
وہاں بھی وہ سکھوں کو مراعات دے کر مسلمان اقلیت میں رہ جائیں اور باوجود آبادی
کی اکثریت کے کونسل میں ہندو اور سکھ دونوں کے دست نگر رہنے لگیں۔

آج بھی میرے کرم فرما سردار منگل سنگھ، لالہ جی اور مالوی جی کے لئے کمک
لے دوڑے ہیں اور اگر امرت سر کے اخبار "اکالی" کے وہی ایڈیٹر ہیں تو مجھے مجبور
ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ ۹ مئی کے پرچے میں جس طرح نہتے مسلمانوں پر کرپان بند
سکھوں کے حملے کے متعلق انہوں نے خبریں شائع کی ہیں اس سے انہوں نے
نہایت شرمناک تعصب کا ثبوت دیا ہے۔ بدقسمتی سے وہ مذہبی تحریک جس کے بانی
کبیر اور گرو نانک تھے تکمیل کو نہ پہنچ سکی اور اسلامی حکومت اور گرو نانک کے بعد کے

جانشینوں میں تمام عمل پڑی ہیں جانتا ہوں کہ اس المناک خوں ریزی کے باعث گرونانک کی مقدس تحریک ایک ایسے سیاسی راستے پر پڑ گئی کہ سکھ اور مسلمان ایک دوسرے سے الگ پڑ گئے اور آج وہ ہندو بھی جو مذہباً سکھوں سے کوسوں دور ہیں سکھوں کو سیاستاً مسلمانوں کے خلاف آسانی سے ابھار سکتے ہیں۔ میں اپنے مذہب پر الحمد للہ قائم ہوں اور گو تبلیغ اس مذہب کی روح رواں ہے تاہم نہ مجھے اسلام یہ سکھاتا ہے کہ مذہب کے معاملے میں جبر و اکراہ سے کام لوں۔ سکھوں کی شان دار تاریخ بھی اس کی کسی مسلمان کو توقع دلا سکتی ہے کہ جبر و اکراہ کے ذریعے سے سکھوں کو تبدیل مذہب پر آمادہ کیا جا سکتا ہے لیکن میری اپنے سکھ بھائیوں کی خدمت میں عرض ہے (اور یہی اپنے آریہ سماج بھائیوں کی خدمت میں بھی عرض ہے جو مذہباً سناتن دھرمیوں سے کہیں زیادہ ہم سے قریب ہیں) کہ آپ اپنے مذہب پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ شرک و بت پرستی چھوت چھات اور جات پات سے نفرت میں ہم کس قدر آپ سے قریب ہیں اور اگر کسی زمانے میں کسی مسلمان بادشاہ یا حاکم نے آپ کے ساتھ کوئی ناانصافی کی بھی ہو تو اس کا انتقام آج آپ ہم سے لینا کس طرح جائز سمجھتے ہیں۔ ہم آپ کے جذبۂ انتقام سے ہرگز خائف نہیں۔ جب ہم اس حکومت ہی سے خائف نہیں جس نے آپ کو اپنے آغوشِ شفقت میں رکھ کر ایک عرصے تک تربیت دی تو پھر ہم آپ سے کیا خائف ہوں گے۔

لیکن یہ خود اپنے اور گرو نانک پر ظلم ہے کہ آپ ہم سے فقط اس وجہ سے دور ہو جائیں کہ آپ کے نزدیک فلاں مسلمان بادشاہ یا حاکم نے آپ کے آباؤ اجداد پر ظلم کیا تھا۔ دیکھئے قیامت کے دن کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ آپ آج بھی ہم پر اتنا ہی بوجھ ڈالئے جتنا کہ خود ہمارے افعال و اعمال کا ہے۔ محمد علی کو اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے اعمال حسنہ کا ثواب ہرگز نہ ملے گا۔

لیکن اگر اس نے یا فرخ سیر نے کچھ اعمال بیہ بھی کئے ہیں تو ان کا عذاب بھی انھی کو ملے گا۔ ہم پر آپ وہ عذاب آج کیوں نازل کرنا چاہتے ہیں؟ جو ہم سے پہلے ہو گذشے جیسا انھوں نے کیا تھا ویسا وہ بھریں گے۔ آج ہم بھی جیسا کریں گے ویسا بھریں گے۔ آپ دیکھیے کہ ہم آپ کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں جیسا وہ سلوک ہو اگر اس سے اچھا سلوک آپ ہمارے ساتھ نہیں کر سکتے تو ویسا ہی کیجیے۔ یہ کیا کہ جو گذر گئے ان کے اعمال کا آپ ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہیں؟ تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت وہ لوگ آگے گئے ان کو کیا انھی کے آگے آئے گا۔ ان کے اعمال کا نہ ہمیں ثواب مل سکتا ہے اور نہ عذاب ملنا چاہیے۔ اگر جس طرح مرہٹوں نے اورنگ زیب کے بعد اس کی اولاد کی خانہ جنگیوں کے باعث مغربی ہندوستان کے اس حصے کو جسے اورنگ زیب نے اپنے مرنے سے پہلے ہی مرہٹوں کے پنجے سے صاف چھڑا لیا تھا پھر مسلمانوں سے لے لیا اسی طرح آپ نے پنجاب کو اسلامی حکومت سے نکال کر اپنے قبضے میں لیا لیکن نہ آج مرہٹوں کی حکومت ہے نہ سکھوں کی نہ مسلمانوں کی۔ کیا آج ہم سب مل کر ہندوستان کو اجنبیوں کے پنجے سے چھڑا کر پوری ہندوستانی قوم کے ہاتھوں میں دینے کی کوشش کریں تو یہ کسی کے ساتھ ناانصافی ہوگی! یاد رکھیے کہ اگر ہندوستان پھر مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آسکتا تو سکھوں کے قبضے میں بھی نہیں آسکتا اور نہ مرہٹوں یا ان کے مشیروں، وزیروں اور جانشینوں یعنی "مرہٹے" "برہمنوں" کے قبضے میں، نہ آریا سماج کے قبضے میں۔ پھر اس سے کیا حاصل کہ آریہ سماج کے اٹھائے ہوئے فتنے میں مرہٹے بھی شریک ہوں اور آپ بھی۔

دیانند جی کو اپنے وطن میں اپنے مطیع نہ ملے تو اس پنجاب میں ملے جو سب کا مرید بننے کو تیار ہو جاتا ہے۔ وہ ہندو جاتی کی تو اس قدر اصلاح نہ کر سکے کہ اوبت بھی اور جات پات دونوں ابھی تک پوری قوت کے ساتھ موجود ہیں، مگر مسلمانوں کی

طرف سے ان کے دلوں میں ایک "تاریخی" کینہ جم گیا اور وہ روز ترقی پکڑتا جاتا ہے۔ وہ پنجاب میں اس ہندو کی یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں جو بت پرستی اور جات پات دونوں کا قائل تھا اور گو وہ اپنے فوجی تجربات کے باعث جات پات کا زیادہ قائل نہ رہا ہو مگر جن برہمنوں نے اس کی اولاد کے ہاتھوں سے سلطنت چھین لی اور جو خود اس کے جانشین بن بیٹھے۔ ان سے زیادہ تو شاید مدراس ہی کے برہمن جات پات کے قائل ہوں۔ آپ یہ خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں سے دشمنی رکھنے میں ڈاکٹر مونجے ان سے کم نہیں اور اسی لئے وہ انھیں خوشی خوشی ہندو مہا سبھا کا صدر بناتے ہیں اور ڈاکٹر مونجے سے کم جوش و خروش کے ساتھ وہ شیواجی کی سہ صد سالہ جینتی نہیں مناتے۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ آپ کے دلوں میں بھی وہی "تاریخی" کینہ جاگزیں ہو جائے اور وہ خود تو ہمت رکھتے نہیں لیکن آپ کی کرپان کو ایک گندے کام سے گندہ کرانا چاہتے ہیں۔ بس میں آپ سے اسی قدر پوچھتا ہوں کہ کیا گرو نانک اس کام سے خوش ہوتے جو آپ کے چند غلط کار بھائیوں نے سومیٔ کی رات کی تاریکی میں کیا؟

شیواجی اور اورنگ زیب جنوب و مغرب میں لڑے۔ آپ کے آبا و اجداد اور اورنگ زیب یا وہ اور فرخ سیر شمال و مغرب میں لڑے۔ کیا مغربی ہند کے دیانندجی کے مطیع شیواجی کے جانشینوں اور آپ کے درمیان واسطۂ اتحاد بن کر آپ کو آج ہم سے شمال و مغرب میں لڑانا چاہتے ہیں تو ان کا اپنا کوئی مقصد نہیں ہے؟ ذرا غور کیجئے اور اگر آپ لڑنے ہی کی ٹھانتے ہیں تو خدا کی مرضی پھر ہم سے بھی شکایت نہ ہو۔ ہم اندر صاحب اور ریچ کے ڈاکٹر صاحب بہادر کی طرح نہیں کہ ایک فرد کے فعل کو ساری ملت سے منسوب کریں۔ جن سکھوں نے اپنی کرپانوں کا نشانہ مسلمانوں پر استعمال کیا گو وہ سکھ ہی تھے، تو صرف وہی اس گناہ

کے مرتکب ہوئے۔ اور جس مسلمان نے نہتے اور مریض سوامی جی پر اپنا پستول چلایا وہ اگر وہ مسلمان ہی تھا، تو اس گناہ کا بھی صرف وہی مرتکب ہوا۔ لیکن اب آپ کا فرض یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اس گناہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صاف صاف اس سے اپنی برات کر لی اور اپنی بے زاری کا اظہار کر دیا۔ اسی طرح آپ بھی صاف صاف اس سے برات کیجئے اور اپنی بے زاری کا اظہار کر دیجیے۔ مجھ کو سردار سردول سنگھ کویشر اور ان جیسے سکھوں پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ خالصہ جی کو ہرگز گمراہ نہ ہونے دیں گے۔ اور اسی لئے جس طرح میں نے شیخ عبدالقادر صاحب کو باوجود اپنی ناداری کے لاہور کو ٹیلیفون دے کر حالات دریافت کئے اور خوشی کا مقام ہے کہ دونوں صاحبوں نے ایک ہی سے حالات بتائے اور ایک ہی سے خیالات کا اظہار فرمایا۔

اگر واقعی ایک نوجوان مسلمان نے کسی سکھ بہن کے ساتھ غیر شریفانہ سلوک کیا تھا تو وہ سخت سزا اور حقارت و نفرت کا مستحق ہے۔ لیکن جب پنچایت سے بھی اس معاملے کا فیصلہ نہ کیا گیا اور معاملہ انگریزی عدالت تک گیا اور راضی نامہ داخل کرنے پر بالآخر فریقین راضی نہ ہو سکے تو کیا وہی انگریزی عدالت اس کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہ تھی جس نے "رنگیلا رسول" جیسی کتاب کے مصنف کو اسی دن صاف چھوڑ دیا! پھر یہ جیون سنگھ یا مان سنگھ کی شادی کیسی؟ جس جرم کا الزام اس مسلمان نوجوان پر لگایا گیا ہے وہ بے حد شرم ناک ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ع

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

ٹھیک اسی زمانے میں جبکہ آپ کی تحریک زوروں پر تھی بار بار سننے میں آیا کہ سکھ فلاں گاؤں میں فلاں مسلمان عورت کو پکڑ لے گئے، اور اس کی تصدیق سرکاری

طور پر سربیت پانی کار ہمارے "افسر انچارج" نے مجھ سے صدر کانگریس کی حیثیت سے کی۔ اور یہ تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ سکھوں میں عورتوں کی تعداد کم ہے اور پنجاب تو پنجاب سندھ تک سے لوگ سکھوں کے لیے عورتیں پکڑ کر لاتے ہیں۔ بہر حال جب مقدمہ آپ خود عدالت میں لے جا چکے تھے تو پھر یہ دیوان کیا اور یہ کرپانوں سے نہتے نمازیوں پر حملہ......... "کرپان" کو آپ ایک مذہبی ہتھیار سمجھ کر کسی وقت اپنے سے جدا نہیں ہونے دیتے لیکن کیا یہ مذہبی ہتھیار اس لیے ہر وقت آپ کے پاس رہتا ہے کہ نماز پڑھ کر مسجد میں سے نکلتے ہوئے بوڑھوں پر بھی اس کا وار کیا جائے؟ یہ کہنا فضول ہے جیسا کہ "ملاپ" "پرتاپ" اور بعض اور لاہور کے بے ایمان اخباروں نے کہنا شروع کیا ہے کہ مسلمانوں نے سکھوں پر لاٹھیوں اور چھریوں سے حملہ کیا اور سکھوں نے بھی اپنی حفاظت کی۔ ایک سکھ اس رات کو زخمی تک نہیں ہوا اور وہ ہندو لڑکا کس طرح زخمی ہو سکتا تھا جس کی جان اسی وقت بچی جب وہ چیخا کہ میں ہندو ہوں۔ مجھے کیوں مارتے ہو۔ میری انور کیپ اور شلوار پر نہ جائیے! ان گمراہ کن خبروں پر حکومت کی توجہ نہیں ہوتی اور فقط "زمیندار" اور "انقلاب" ہی پر دفعہ ۹۹ (الف)، ضابطہ فوجداری کا بے جا وار ہوتا ہے جو یقیناً "ہندے ماترم" "پرتاپ" "ملاپ" وغیرہ سے ہر حالت میں کہیں بہتر ہیں۔ لیکن شاید ان ہندو اخباروں کی خبریں "گمراہ کن" نہیں ہیں اس لیے کہ وہ صاف اس قدر جھوٹی اور من گھڑت معلوم ہوتی ہیں کہ کسی ہندو کو بھی "گمراہ" نہیں کر سکتیں مگر کیا "اقبال" اب ہندو اخبارات کا اتباع کرے گا؟ "شیر پنجاب" میری نظر سے نہیں گزرا اس لیے کہ وہ میرے پاس نہیں آتا۔ وہ صرف مجھ سے اپنے خاص نمبروں کے واسطے مضامین ہی مانگتا۔ اور مجھے گالیاں ہی دینا جانتا ہے مگر میں تو مسلم، ہندو، سکھ سب اخبارات کی گالیاں کھانے کا عادی ہو گیا ہوں۔ مجھے انکی گالیوں کی پرواہ

نہیں، لیکن خدا کرے کہ سکھ اخبارات اس گندگی میں نہ گریں اور دیکھیں جو پنجاب
کے پریس کو کیا اب تو ہندوستان کے ایک بڑے حصے کے پریس کو متعفن کر چکے ہیں۔
یہ فسادات سکھوں کی آزمائش کر رہے ہیں۔

اب چند لفظ لاہور کے مسلمانوں کی خدمت میں بھی عرض کر دوں۔ میں جانتا
ہوں کہ آپ میں سے کم کی نظر عنایت مجھ پر ہے۔ زیادہ تر تو پنجاب کے روزانہ
اخبارات نے "ہمدرد" سے بے نیاز کر دیا ہے اور وہ جانتے بھی نہیں کہ میں کیا
لکھا کرتا ہوں اور وہ اس چیز سے کس قدر مختلف ہے جو "زمیندار" کے ذریعے سے
ایک عرصے سے مجھ سے منسوب کی جا رہی ہے۔ میں صاف کہہ دوں کہ میں نہ پنجاب
کے مسلمانوں کے صبر و تحمل کا قائل ہوں نہ ان کی قوت برداشت کا، لیکن خدا گواہ
ہے کہ میں ان کو ظالم نہیں سمجھتا رہا ہوں بلکہ ایک حد تک مظلوم ہی سمجھتا رہا ہوں۔
جب پہلے پہل مجھے خبر ملی کہ نہتے اور بے گناہ بلکہ بے خبر مسلمانوں پر کرپانوں سے کس
طرح حملہ کیا گیا اور اتنے شہید ہوئے اور اتنے زخمی تو میں نے جہاں اپنے دل میں
درد محسوس کیا وہیں اتنی خوشی بھی کہ الحمدللہ یہ خون ناحق اب اچھی طرح ثابت کر دیگا
کہ ابتداء کون کیا کرتا ہے اور ظالم کون ہے۔ میں نے جب اخبارات میں پڑھا کہ
کس طرح علامہ اقبال نے مسلمانوں کو ایک بار نہیں بلکہ بار بار اور دن رات صبر و
تحمل کی تلقین فرمائی تو میرے دل سے اس سچے محب وطن کے لیے دعا نکلی بلکہ ہوش
میں اسی وقت اس کی بھی دعا مانگ لیتا کہ لاہور کے مسلمان اس کی نصیحت پر آخر
تک عمل پیرا رہیں، مگر نہ معلوم مجھ جیسے گنہگار کی دعا قبول بھی ہوتی یا نہیں اور شاید جس
وقت میں دعا مانگتا وہ دعا کا وقت بھی نہ ہوتا۔ اس لئے کہ ۴ مئی کی رات کو بھی
بہت سے مسلمان تحمل کے دامن کو اپنے ہاتھوں سے چھوڑ چکے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا
کہ جو ہندو ۴ مئی کی رات کو اس عالم فانی سے سدھارے وہ اسی طرح مسلمانوں

کی لاٹھیوں، چھریوں یا پتھروں کا شکار ہوئے جس طرح کہ ۳ مئی کی رات کو مسلمان سکھوں کی کرپانوں کا شکار ہوئے تھے۔ یا ان پر ہندوؤں نے حملہ کیا اور انھوں نے بھی اس کا جواب دیا اور اپنے حملہ آوروں کو مار ڈالا۔ یہ دوسری چیز قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ کاش "زمیندار" اور "انقلاب" پوری دیانت کے ساتھ اس کی بھی تحقیق کریں اور جس طرح انھوں نے سکھوں اور ہندوؤں کے حملے کا حال نہایت صفائی سے بیان کیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے حملۂ انتقامی کا حال نہایت صفائی سے بیان کریں۔

یہ ہرگز ایک مسلمان کے شایان شان نہیں کہ کتمان شہادت کو روا رکھ کر قلب آثم کا ثبوت دے۔ اگر جس طرح "اہالی" نے ایک حرف بھی سکھوں کے حملے اور نہتے مسلمانوں کے اس بزدلانہ بے دردی کے ساتھ مارے جانے اور زخمی ہونے کے متعلق نہیں لکھا اور "پرتاپ" "ملاپ" "بندے ماترم" وغیرہ یا تو اب اس کی لیپ پوت کر رہے ہیں یا پہلے ہی سے اس کا لحاظ رکھ کر لکھ رہے تھے۔ اسی طرح "زمیندار" اور "انقلاب" بھی دوسری رات کو صرف ایک مسلمان کے ساتھ متعدد ہندوؤں کے مارے جانے اور بہت سے مسلمانوں کے ساتھ اس سے زیادہ ہندوؤں اور سکھوں کے زخمی ہونے کے متعلق صاف صاف نہیں لکھیں گے تو ہم کس طرح اسلام کی فوقیت ثابت کریں گے؟ افسوس کہ بظاہر مسلمانوں نے اپنے شہدا کی تجہیز و تکفین کے بعد بھی اسی صبر و تحمل سے کام نہ لیا جس کا وہ گذشتہ رات اور اس دن وہ برابر ثبوت دیتے آئے تھے اور ڈاکٹر اقبال کی بیش بہا نصیحت پر آخر تک عمل نہ کیا۔ یہی وہ غلطیاں ہیں جن کا مسلمانوں نے ۱۹۲۲ء سے بار بار ثبوت دے کر سنگھٹن اور شدھی کے حامیوں کو کمک پہنچائی ہے اور جس سے ہم خلافت والے ان کو برابر روکتے تھے۔ یہ ہے نتیجہ فقدان نظام کا اور پنجاب کے مسلمان باوجود تنظیم "تنظیم"

کی رٹ لگانے کے اب سر پکڑ کر روئیں گے۔

چند لفظ مجھے حکومت کے متعلق بھی عرض کرنا ہیں اور جامع مسجد دہلی میں کچھ عرض بھی کر چکا ہوں مگر اب یہ مضمون بہت طویل ہو گیا ہے اس لئے اسے کل کے لئے ملتوی کرتا ہوں۔ انشاء اللہ سر مالکم ہیلی کی خدمت میں بھی کل کچھ عرض کروں گا۔

(۱۲) مسلمانوں کی کس مپرسی

ہمدرد ۱۲ دسمبر ۱۹۲۶ء

چودھری بھلا ایک ضعیف العمر مسلمان جو بھینس گائے اور بدھیون کی تجارت موضع کرالی تھانہ فرح تحصیل ماٹھ ضلع متھرا میں کرتے تھے اور ان کے بھتیجے خدا بخش حالی موضع میں وہی تجارت کرتے ہیں آج ۱۱ دسمبر ۱۹۲۶ء کو میرے پاس آئے اور بیان کیا کہ گذشتہ موسم کے بعد سے اس گاؤں کے ہندوؤں سے مسجد کے متعلق ہمارا جھگڑا ہے اور گرد و نواح کے ۲۰ مواضع کے ہندو یہاں کے ہنود کی مدد کر رہے ہیں۔ میں نے اس بارے میں کوئی تحقیقات نہیں کی، جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ چودھری بھلا اور خدا بخش کا بیان ہے۔ ان کے بڑے بوڑھوں سے انھوں نے سنا ہے کہ کوئی ساٹھ برس ہوئے کہ یہ مسجد ابتداءً کچی بنی ہوئی تھی۔ اس وقت ہنود نے اذان ہونے کے خلاف جھگڑا کیا اور کہا کہ ہماری گائے، بھینس اور عورتوں کے حمل گر جاتے ہیں، تم اسے بند کرو۔ اس گاؤں میں اب مسلمانوں کے پچاس گھر ہیں اور آبادی ڈیڑھ دو سو آدمیوں کی ہے۔ ہندوؤں کی آبادی کوئی تین ہزار کی ہے۔ پہلے بھی اسی تناسب سے ہندو مسلمانوں کی آبادی تھی۔ ہندوؤں نے اس وقت مسلمانوں کو اذان دینے پر پیٹا تھا۔ اس پر متھرا میں مقدمہ چلا اور ۱۴ ہندو سرغنوں کو دو دو برس کی سزا ہوئی۔ اس کے بعد مسجد پختہ بن گئی۔

اس واقعے کے کوئی پچیس تیس برس بعد چودھری بھلا کے تایا تھوسے اسی موضع کے ہندوؤں کا جھگڑا ہوا تھا اور ان کی طرف سے یہ الزام لگایا

گیا تھا کہ نتھو ہندوؤں کی گایوں کو ذبح کر دیتا ہے۔ اس جھگڑے کو واقع ہوئے کوئی تیس پینتیس برس ہوئے ہوں گے۔ جب مقدمہ چلا تو نتھو بری ہو گئے اس لئے ان لوگوں نے مسجد کے پرانے مقدمے کے کاغذات دکھا کر عدالت پر ثابت کر دیا کہ اصلی جھگڑا مسجد کا چلا آتا ہے اور اس بنا پر ہندو جھوٹے الزام لگا کر سر پر آور دہ مسلمانوں پر مقدمہ چلاتے ہیں اور ان کو خواہ مخواہ ستاتے ہیں؟ اس طرح کا جھگڑا کچھ عرصے کے بعد چودھری بھلا کے چچا نتوا کے ساتھ ہوا اور ان پر بھی مقدمہ چلا کہ ہندوؤں کی ایک بدھیا چرا کر بیچ دی۔ نتوا بھی اسی طرح بری ہو گئے۔ اب پچھلے محرم کے بعد سے نیا جھگڑا شروع ہوا ہے اور وہ بھی اسی مسجد کے متعلق ہے۔ بقول چودھری بھلا اور خدا بخش ہندو مسلمانوں کو اذان دینے اور جماعت سے نماز پڑھنے سے روکتے ہیں اور مسجد کے پاس دوکان میں سے بہت سے لوگ جمع ہو کر بجے کا رہے لگاتے ہیں، سنکھ پھونکتے ہیں، ہارمونیم اور ڈھولک بجاتے ہیں اور مسجد میں اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اس پر مسلمانوں نے مار پیٹ کا اندیشہ ظاہر کر کے متھرا میں ڈپٹی کلکٹر کی عدالت میں مقدمہ چلایا ہے جو اب تک چل رہا ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ پچیس دن تک نماز اور اذان بند رہی تھی۔ اب پولیس کی مدد سے نماز اور اذان ہونے لگی ہے۔ اس موضع کی مسجد میں آنے کے لئے ایک راستہ بازار کی طرف سے ہے جس میں بڑا دروازہ لگا ہے۔ دوسرا راستہ سرائے کی طرف سے ہے جس میں ایک کھڑکی مسجد میں آنے کے لئے بنا دی گئی ہے۔ محرم سے پیشتر اس کھڑکی کے راستے سے اس گاؤں کے ایک ہندو زمیندار کا لڑکا جوتہ پہنے مسجد کے فرش پر سے چلا گیا جس پر مسجد کے امام نے اس کو ٹوکا۔ اس پر اس نے امام صاحب کو برا بھلا کہا اور دھمکی بھی دی۔ اس واقعے کا بھی مسلمانوں کی طرف سے

استغاثے میں ذکر ہے۔

اسی عرصے میں یعنی مسلمانوں کی طرف سے مقدمہ دائر ہونے کے بعد ہندوؤں نے ۲۳ مسلمانوں پر دعویٰ کر دیا کہ رامائن پڑھنے کے وقت مسلمانوں نے ہڈی اور ڈھیلے پھینکے اور برا بھلا کہا اور ہندوؤں سے کہا کہ رامائن پڑھنا بند کر دو۔ وہ سو تین سو آدمیوں کو جمع کر کے رامائن پڑھنا مسلمانوں کے مقدمہ دائر کرنے کے بعد سے شروع ہوا ہے اور پھر اس کے علاوہ ایک اور مقدمہ چلایا گیا ہے اور وہ اس بنا پر کہ ہندو کہتے ہیں کہ چودھری بھلا کے بیٹے بھتیجے اور دو اور مسلمانوں نے ایک ہندو کی گائے کی ٹانگ پر گنڈاسا مارا اور اس کو زخمی کر دیا۔ چودھری بھلا کا بیان ہے کہ میرے بڑے بھائی قلن نے اس مقدمہ کے چلانے سے ایک دن پہلے ہی تھانہ ٹریہ میں رپورٹ لکھوا دی تھی کہ ہم لوگوں کے خلاف اس قسم کے جھوٹے مقدمے چلائے جائیں گے۔ اس آخری مقدمہ میں ۹ دسمبر کو حکم سنا دیا گیا اور چاروں مسلمانوں کو پچاس پچاس روپے جرمانہ اور ایک دن کی قید محض ہو گئی۔ اب چودھری بھلا اور ان کے بھتیجے مسلمانوں سے مدد چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ اس معاملے میں پہلے اپنے تھانے تحصیل اور ضلع کے مسلمانوں سے مدد مانگو کہ وہ تم کو زیادہ جانتے ہیں اور تمہاری مدد اگر واجبی اور ضروری ہے تو پہلے ان پر فرض ہے۔

کنور عبدالوہاب صاحب سے مجھے سال گذشتہ میں معلوم ہوا تھا کہ متھرا کے ضلع میں ایک اور مقام پر بھی یعنی موضع اکھیڑا میں جو راپہ کے ریلوے اسٹیشن سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے اور جس میں ڈیڑھ سو مسلمان رہتے ہیں اور باقی تقریباً دو ہزار ہندو اور آریہ ہیں نماز باجماعت پڑھنے اور ایک قبر کے بنانے کے متعلق جھگڑا ہو گیا ہے اور ایک چھوڑ تین تین مقدمے دیوانی اور

فوجداری کے چل رہے ہیں۔ اس موضع میں کنور صاحب نے مصالحت کی
پوری کوشش کی مگر نہ ہو سکی اس لئے کہ بقول ان کے ہندو زمینداروں نے
اذان اور نماز با جماعت کی مخالفت نہ چھوڑی۔ دوران مقدمے میں مقدمے
کے متعلق میں کوئی رائے نہیں دے سکتا نہ میرے لئے یہ ممکن ہے کہ اس قسم کے
ہر مقدمے میں خود کوئی تحقیقات کر سکوں۔ جو بیان کہ چودھری عبداللہ نے دیا ہے
اگر وہ صحیح ہے اور واقعی اس موضع کے مسلمانوں کو امداد کی ضرورت ہے تو
سر برآوردہ مسلمانان متھرا کو ان کی مدد کرنی چاہئے۔ اہل دہلی اور دوسرے مقامات
کے مسلمانوں کے ساتھ ان کے اپنے جھگڑے لگے ہوتے ہیں۔ انھیں کا چکانا
کچھ آسان کام نہیں ہے۔ میں نے اس درخواست کو اس لئے تشہیر دی ہے
کہ ہر ضلع کے مسلمان اپنے لیے یہ اصول قرار دے لیں کہ اپنے ضلع کے ایسے
جھگڑے خود ہی چکالیں۔ اگر کوئی واقعہ ایسا عظیم الشان ہو جائے کہ کسی ضلع کی
مصیبت کا دفعیہ اس ضلع کی قدرت اور استطاعت کے باہر ہو تب البتہ
دوسرے اضلاع کے مسلمانوں سے مدد لی جائے۔

افسوس یہ ہے کہ باوجود "تنظیم" "تنظیم" کی پکار کے کوئی تنظیم اضلاع کی
اب تک نہیں ہوئی ہے اور چھوٹے سے چھوٹے گانوں کا چھوٹے سے چھوٹا
جھگڑا ابھی دہلی جیسے مقامات کی طرف رجوع کر دیا جاتا ہے جہاں نہ کسی کو
ہر گانوں کی تحقیقات کی فرصت ہے نہ کسی کے پاس ہر گانوں کی امداد کے
واسطے سرمایہ موجود ہے۔ مسلمانان متھرا عرصے سے قومی کاموں میں کوئی حصہ
نہیں لے رہے ہیں گو گذشتہ گرمیوں کے موسم میں وہاں تبلیغ کے سلسلے میں
ایک جلسہ ہوا تھا۔ میں بالخصوص مسلمانان متھرا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے
ضلع کے مسلمانوں کی کیا مدد کر رہے ہیں اور دوسرے اضلاع کے مسلمانوں

سے کیوں اس کی توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنا وقت ان کے مواضع کی تحقیقات میں دیں گے اور اپنا روپیہ ان جھگڑوں کے انفصال میں صرف کریں گے۔ میرا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ جہاں ہندوؤں کی کثرت آبادی مسلمانوں کی اقلیت پر جور و ستم روا رکھے وہاں مسلمانوں کی مدد نہ کی جائے مگر تنظیم اسی کا نام ہے کہ پہلے ان کے گرد و نواح کے مسلمان ان کی مدد کریں نہ یہ کہ ملک بھر میں سے چار پانچ مسلمان اور ایک دو مقام تاک لئے جائیں اور سارا بوجھ انھیں پر ڈال دیا جائے۔ یہ تنظیم نہیں بلکہ عدم تنظیم ہے۔ مجھے امید ہے کہ آیندہ ہر ضلع کے مسلمان خود اپنی مدد کریں گے اور اپنے تساہل کا الزام دوسرے سربرآوردہ مسلمانوں کے سر خواہ مخواہ نہ تھوپیں گے جیسا کہ اس وقت کیا جا رہا ہے۔

صرف اس معاملے کے متعلق مجھے آج جبکہ میں ایک منٹ بھی "کرٹیڈ" کے نکالنے سے نہیں بچا سکتا تھا کم از کم تین گھنٹے صرف کرنا پڑے اور یقین جانئے کہ اسی قسم کے معاملات اگر ہر روز نہیں تو ہر ہفتے پیش آتے رہتے ہیں۔ میرا وقت میرے ذاتی کاموں میں بہت کم صرف ہوتا ہے اور جو کچھ بھی قومی کام کر رہا ہوں اس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ میرے مرض ذیابطیس میں باوجود انسولین کی پانچ پچکاریوں کے قارورے میں شکر آج تک نہیں گھٹی بلکہ الٹی بڑھ گئی ہے اور سچ ہے کہ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ڈاکٹر انصاری صاحب کا بیان ہے کہ اور مریضوں کو افاقہ ہو رہا ہے مگر باوجود علاج اور پرہیز کے تمھارے مرض میں افاقہ نہ ہونا بلکہ اس میں زیادتی ہو جانا محض دماغی محنت، تفکرات اور ہوا خوری نہ ہونے کے باعث ہے۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں سے پوچھتا ہوں کہ وہ مجھے بتا دیں کہ میں کیا کروں۔ کہاں سے

وقت لاؤں کہ ہر وہ کام جسے اور مسلمان چھوڑے بیٹھے ہیں خود کرنے لگوں۔ میرے اخبارات کی مالی حالت یہ ہے کہ ہر مہینے ایک ہزار روپے کا خسارہ ہوتا ہے۔ اس میں کچھ کمی ہو گئی تھی مگر گذشتہ دو ماہ میں "کامریڈ" کے پھر چار بار نہ نکلنے اور وقت پر تو کبھی بھی نہ نکلنے کے باعث دوبارہ زیادتی ہو گئی ہے۔ اس کے علاج کی سوائے دو چار احباب کے کسی نے بھی فکر نہ کی مگر ہر شخص کا تقاضا ہے کہ یہ کرو اور وہ کرو اور بالخصوص ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں میں نہ پڑوں تو ہندو پرستی کا الزام الگ لگایا جاتا ہے۔

میں اب اپنی قوم سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جتنا بوجھ میں اٹھا رہا ہوں اس سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی مجھ میں سکت نہیں۔ اگر ہر تعلیم یافتہ مسلمان اس کا پچاسواں حصہ بھی اٹھانے لگے تو مجھے ہر قومی کام سے سبکدوشی حاصل ہو سکتی ہے اور ہر قومی کام اب سے دس گنا اچھا ہو سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں ہزار دو ہزار مسلمان بھی اس کا پچاسواں حصہ اٹھانے لگیں تب بھی مجھے بہت کافی آرام مل سکتا ہے اور قومی کام بھی اب سے بہت بہتر ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں تو کم از کم سو دو سو مسلمان بھی میرا ہاتھ بٹانے لگیں تو میری صحت اس قابل ہو جائے کہ تمام قومی کام جو میں آج کر رہا ہوں بغیر کسی خطرے کے کئے جاؤں۔ اس وقت قومی کام کرنا کام کرنا نہیں ہے بلکہ جان مارنا ہے اور نہ تندرستی ہی قائم رہ سکتی ہے نہ کام ہی انجام پا سکتا ہے۔ آج تھک کر اور ایک حد تک مسلمانوں سے مایوس ہو کر یہ حرف شکایت زبان پر لایا ہوں۔ مواخذۂ حشر سے ہر وقت ڈرتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے کہیں زائد اس وقت مسلمانوں کے مواخذہ سے ڈر لگتا ہے۔ چند اللہ کے بندوں کے سوا کسی سے مدد نہیں مل رہی ہے مگر اعتراضات کے لئے ہر ایک تیار اور مستعد ہے۔ میں نے ہزاروں لاکھوں

اپنی وہ تعریفیں سنی ہیں جن کا میں کبھی مستحق نہ تھا۔ اگر آج شکوۂ بے جا سن رہا ہوں تو اس کی بھی شکایت نہیں ہے مگر اظہار خیالات ضروری ہو چکا تھا اس لئے کیا گیا۔ ع

کجا دانند حال ما سبکباران ساحل ہا!

مجھے اپنے متعلق اپنے بھائیوں سے اتنا شکوہ کرنا نہیں ہے جتنا تمام قومی کام کرنے والوں کی طرف سے قوم سے شکوہ کرنا ہے۔ بظاہر قوم نے سمجھ لیا ہے کہ اس کا حق ہے کہ چند اس کے خادم ہر وقت قومی خدمت کئے جائیں اور باقی کچھ نہ کرے۔ یہ ایک مہلک غلطی ہے اور اس طرح کوئی بھی دیر تک قومی خدمت نہیں کر سکتا۔ قوم کی حالت اسی وقت درست ہوگی جبکہ قوم کے اکثر افراد کچھ نہ کچھ قومی خدمت کرتے رہیں لیکن آج تو صرف چند افراد کو قومی خدمت کا ٹھیکہ دار سمجھ لیا گیا ہے اور یہی نہیں کہ ان کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا اور ہر شخص ان سے خدمت لینے کو اپنا حق سمجھتا ہے اور اگر وہ اس کی خدمت کرنے کی اپنے میں استطاعت نہیں پاتے تو ان سے دست و گریباں ہونے کو تیار رہے۔ جو قوم کے سچے خادم ہیں وہ تو ہر حال میں قوم کی خدمت کیے جائیں گے مگر قوم کو خود انھیں غلط اصولوں پر کار بند چھوڑ دینا ویسی ہی غلطی ہے جیسی غیر مستحقین کو بھیک دینا۔ اسی لئے آج میں نے اس چھوٹے سے جھگڑے کے سلسلے میں یہ اصولی بحث چھیڑ دی۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

(۱۳) بمبئی کے خوں ریز واقعات

ہمدرد ۱۱ فروری ۱۹۲۹ء

مولانا محمد علی صاحب مدظلہ بمبئی سے آج صبح واپس دہلی تشریف لے آئے۔ واقعات بمبئی کے متعلق مولانا نے بمبئی میں ایک مفصل بیان شائع کیا تھا جس میں "ٹائمز آف انڈیا" اور بعض دیگر اخبارات کے نمائندوں کی غلط بیانیوں کا جواب ہے اور وہاں کے صحیح واقعات ہیں۔ چونکہ یہ بیان بمبئی کے خوں چکاں واقعات کی وجہ سے نہایت اہم ہے اسی لئے آج اسی کو مقالۂ افتتاحیہ کی جگہ دی جاتی ہے۔ یہ بیان اخبار "خلافت" کے خاص ضمیمے میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کا تتمہ انشاء اللہ کل کی اشاعت میں دیا جائے گا۔ یہ ابھی کسی اخبار میں شائع نہیں ہوا ہے۔ مولانا اپنے بیان میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

میں نے آج صبح "ٹائمز آف انڈیا" میں وہ بیان پڑھا جو "ہندو مسلمانوں میں خون کا تنازعہ" اور "بین الملل جنگ" کے عنوانوں سے شائع ہوا ہے، جس میں درج ہے کہ "فساد کا مرکز بھنڈی بازار اور ڈونگری تھے جو بمبئی کی مسلم آبادی کے محلے ہیں۔ یہاں یہ معلوم ہوا تھا کہ پٹھان اور مقامی مسلمانوں میں "کوئی دوستانہ سمجھوتہ" ہو گیا۔ اس تحریک میں بعض مقامی مسلمان "لیڈروں" نے بھی مدد کا ہاتھ بڑھایا ہے اور مسٹر ...... شوکت علی ان "مقامات میں تمام موٹر کار میں پھرتے دیکھے گئے"۔ یہی وہ اخبار ہے جو دل سے چاہتا تھا کہ "ہندو مسلمانوں میں خون کا تنازعہ" اور "بین الملل جنگ" چھڑے اور اسی کے دو نامہ نگاروں نے مجھ کو اور شوکت صاحب کو پٹیل کے ہسپتال پر ایک دن پیشتر

گھیرا تھا اور نہایت سختی کے ساتھ اصرار کر رہے تھے کہ ہم اس "ہندوستان مشرق اور آزادی کے دشمن" کے شائع کرنے کے لیے کوئی بیان دیں۔ میں نے قطعی انکار کیا تاہم جو کچھ گفتگو اس وقت ہوئی اُسے اپنی رنگ آمیزی کے ساتھ اس نے بلا اجازت شائع کر دیا۔ انھوں نے ہم سے ایک سوال کیا تھا کہ کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ یہ تنازعہ آگے چل کر بین الملل ہو جائے اور شوکت صاحب نے فرمایا تھا کہ ہاں اس کا امکان ضرور ہے۔ مگر میں نے اسی وقت ان نامہ نگاروں کو اس کے شائع کرنے سے روکا اور کہا کہ اگر یہ فساد آگے چل کر بین الملل نہ بھی بنتا ہو تو ممکن ہے کہ شوکت صاحب کے اس جواب کے بعد کوئی غلط فہمی پیدا ہو یا عمداً پیدا کی جائے اور اسے بین الملل جنگ بنا دیا جائے۔

افسوس ہے کہ ان نامہ نگاروں نے میرا کہنا نہ مانا اور شوکت صاحب کے اس جواب کو شائع کر دیا اور اب خود شوکت صاحب پر نہایت بے ایمانی کے ساتھ یہی اخبار الزام لگا رہا ہے کہ وہ مقامی مسلمانوں کو بھی بین الملل جنگ پر ابھار رہے ہیں۔ مجھے ڈاکٹر پرولکر نے قندھار یا کابل جانے سے اس بنا پر قطعاً منع کر دیا تھا کہ میری ذیابیطی نیورٹس افغانستان کی سردی میں یقیناً گینگرین کی شکل اختیار کرے گی، پاؤں میں خون کی حرکت جو اب بھی بے حد کم ہے بالکل مسدود ہو جائے گی، ہڈی مرنے لگے گی اور پاؤں کاٹنے پڑیں گے۔ انھیں کے حکم سے میں پریل کے ہسپتال میں بطور مریض کے بھیج دیا گیا تاکہ وہاں کچھ سکون نصیب ہو، پبلک کے کام سے فرصت ملے اور ایک پبلک کام کرنے والے کی روزانہ زندگی کے افکار و حوادث سے کسی حد تک نجات ملے لیکن ع

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا است

کسے معلوم تھا کہ بیسیوں ناکردہ گناہ زخم خوردہ پٹھان اسی ہسپتال میں لاکر

ڈالے جائیں گے اور ان میں سے کتنے ہی جاں بحق تسلیم کریں گے اور ان کی میتوں کو شناخت کرنے والے اور وہاں سے قبرستان لوائے جانے کا کام مجھے کرنا پڑے گا اور خود میں ہی نہیں بلکہ میرے بال بچے بھی جو مجھے دیکھنے کے لئے اس ہسپتال میں آ گئے دو پٹھانوں کو اور مسٹر بریشیلے ڈپٹی انسپکٹر پولیس کو اپنی آنکھوں کے سامنے چاقوں کی ماریں قدم پر مارے جاتے ہوئے اور ایک ہندو کسان کو ادھ موا چھوڑ جاتے ہوئے دیکھیں گے اور اس عجیب نامردی کا بھی نظارہ کریں گے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں مل کے مزدور پٹھانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کو آ کر گھیر لیں گے اور ان کا شکار کرنا چاہیں گے۔ میں ہر روز دو یا تین پچکاریاں اس ہسپتال میں لگوا رہا تھا اور قارورہ اور خون کی شکر شوگر کا امتحان کرا رہا تھا کہ رمضان شریف آنے سے پہلے کسی قدر بہتر حالت میں دہلی اور پھر وہاں سے رنگون مسلمانان برما کی دعوت پر جا سکوں اور وہاں کچھ آرام کر سکوں مگر یہاں کی شورش کا انداز دیکھ کر مجھے مجبوراً ہسپتال چھوڑنا پڑا اور صلح وامان کی کوشش میں اسی وقت سے مشغول ہوں اور شوکت صاحب کا ہاتھ بٹا رہا ہوں، ان بے چارے کو تو اخبار پڑھنے تک کی فرصت نہیں۔ اخبارات کے غلط بیانوں کی تردید کی انھیں بھلا کہاں فرصت ہے۔ میں نے نہایت حیرت سے اپنے ہسپتال میں پڑے پڑے اخبارات کے ذریعے سے اور خود ہسپتال کے واقعات کو دیکھ کر اس کا اندازہ کیا کہ بمبئی کے رہنما بھی بمبئی کے حکام کی طرح اس فساد کے روکنے اور مظلوموں کی حفاظت کرنے میں تاخیر کر رہے ہیں۔

جب تک فقط غریب الوطن اور ایک مختصری جماعت والے پٹھانوں کا شکار ہوتا تھا بہت کچھ جو کیا جا سکتا تھا بجا ہرگز نہیں کیا گیا لیکن جوں ہی پٹھانوں اور بعض مسلمانوں نے بھی دست درازی شروع کی تو ہر طرف سے شانتی شانتی کی آوازیں اٹھنا شروع ہوئیں اور گو مجھے معرکۃ الآرا تقاریر کرنے والوں پر کچھ

اس سے زیادہ اعتماد نہیں ہے جو کسی اسکول ڈبیٹنگ سوسائٹی پر ہو تاکہ وہ اس ہنگامے کو فرو کر سکیں گے تاہم شوکت صاحب کے اصرار پر میں بھی دو جلسوں میں کل اور آج شریک ہوا۔ آج کا جلسہ کارپوریشن ہال میں ہو رہا تھا کہ کماٹی پورہ میں فساد ہونے کی خبر آنے پر شوکت صاحب اور مسٹر نریمان اور چند اعلیٰ کی طرح کام کرنے والے مجھے جلسے میں بیٹھنے کے لئے کہہ کر خود کماٹی پورہ چلے گئے۔ جب جلسہ ختم ہوا تو میں نے صدر جلسہ مسٹر دیش مکھ سے علیحدہ لے جا کر عرض کیا کہ تقریریں تو ہو چکیں اور کاغذی تجاویز بھی منظور ہو گئیں لیکن کچھ کام بھی کیا جائے گا یا نہیں؟ ان مظلوم پٹھانوں کو جو اب تک چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں مختلف مقامات پر محصور ہیں محاصرے سے نکالا جائے گا یا نہیں۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ ہر مقرر کو جو تقریر پر تلا بیٹھا تھا ہنگاموں میں بھیجا جائے تاکہ بے فائدہ بکواس بند کر کے یہ حضرات کچھ بھی کام کریں۔ اس کے بعد میں "ٹائمز آف انڈیا" کے دفتر میں گیا تاکہ مسٹر سٹیپر ڈ سے جو اس کے اڈیٹر ہیں اور کسی زمانے میں میرے بڑے دوست تھے پھر نیاز حاصل کروں اور انھیں اس بیہودگی پر شرماؤں جو ان کے اخبارات چند اور اخبارات کی طرح کر رہے ہیں۔ میں نے اس وقت تک ناشتہ بھی نہیں کیا تھا مگر وہ لنچ تناول فرمانے تشریف لے جا چکے تھے البتہ مسٹر نو موجود تھے جنھیں میں نے شوکت صاحب اور کارکنان خلافت اور خلافت والنٹیروں وغیرہ کے کام کی حقیقت سنائی تو انھوں نے فرمایا کہ میں آپ کو ایک رپورٹر دیتا ہوں سب کچھ لکھوا دیا جائے تاکہ اخبار میں شائع کر دیا جائے۔

میں نے جو بیان دیا تھا اس کا ایک نہایت ہی مختصر حصہ دوسرے دن کے "ٹائمز" کے ایک گوشے میں شائع کیا گیا ہے باقی حذف کر دیا گیا (محمد علی) میں نے انھیں بتایا کہ کسی طرح ابتداءً بچوں کے پکڑنے کی افواہ کا تعلق پٹھانوں سے

نہیں تھا اور جیسے وہ ہندو مارواڑی مارے گئے تھے پھر کس طرح بونڈی بازار میں دو مصری عیسائی جہاز رانوں اور ایک یونانی انجینیر پر حملہ ہوا تھا جس میں خود حماقت سے وہاں کے مسلمان بھی شریک تھے لیکن پھر کس طرح یکایک اس فساد نے رخ بدلا اور ملوں کے ہندو مزدوروں نے پٹھانوں کا شکار کرنا شروع کیا اور باوجود ان تمام دعاوی کے جو ڈانگے صاحب نے کارپوریشن ہال میں "اپنی منظم جماعت رہنمایان" کی طرف سے پیش فرمائے تھے اور باوجود پولیس کی اس کارگردگی کی تعریف میں قصیدوں کے جو ابھی جلسے میں سنائے گئے تھے کوئی بھی پٹھانوں کو اس مصیبت سے نہ بچا سکا۔

اس وقت شوکت صاحب اور یہ خلافت والے ہی تھے جنھوں نے ان کی حفاظت کی تنظیم کی جس کی طرف شوکت صاحب نے اشارہ کیا تھا۔ کیسی شرم کی بات ہے کہ وہ لوگ جو آج گھروں میں بیٹھے رہے اور کچھ نہ کر سکے وہی شوکت صاحب اور ہم خلافت والوں پر آج ایسے بہتان عظیم لگا رہے ہیں اُن حضرات میں سے کوئی بتائے کہ انھوں نے کتنے ناکردہ گناہ پٹھانوں کو جان سے مارے جانے یا پٹنے سے بچایا اور کتنوں کے بال بچوں اور گھروں کی حفاظت کی۔ کتنے پٹھان مُردوں کی شناخت کرائی، کتنی میتوں کو ان کے وارثوں تک پہنچایا اور کتنوں کی تجہیز و تکفین کرائی۔ ڈانگے صاحب کو تو کارپوریشن کے صدر ڈاکٹر دیش مکھ نے آڑے وقت میں بچا لیا اور وہ میرے اس سوال کا جواب دینے سے چھٹ گئے کہ ان کی "منظم جماعت رہنمایان" نے جو فوج کے آجانے کے بعد ملیں کھلوانے میں کامیاب ہوئی اس سے پیشتر ملیں کیوں نہ کھلوا سکی۔

اب ذرا خلافت والوں کی داستان سنئے کہ وہ اس عرصے میں کیا کرتے رہے۔ جب سے فساد شروع ہوا ہے اور جہاں فساد کا اندیشہ ہے اور بابحت مسلمان اور سٹر زریان جیسے شریف اور نیک دل اور بہادر غیر مسلم فتنہ کو فرو کرنے صلح و امن قائم

کرنے اور مصیبت زدوں کی امداد کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ آج تو مجھے خود اس کا تجربہ ہوا
کہ غیر مسلم ٹیکسی والے کسی ہنگامے کی طرف ہمیں لے جانے تک سے احتراز کرتے ہیں
مگر مسلمان ٹیکسی والے اور پرائیویٹ موٹروں کے شوفر بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ
ہر جگہ کام کرنے والوں کو لے جاتے رہتے ہیں جب سے مسلمانوں نے بھی مل والوں
اور دوسرے مجنوں اور نامرد غیر مسلموں کی تقلید کر کے ہندوؤں کو مارنا شروع کیا ہے
یہ لوگ برابر ان مقامات پر پہنچتے ہیں اور ان کو اس خلاف شریعت تقلید سے روکتے
ہیں۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ بھنڈی بازار میں شوکت صاحب نے ایک ہندو کو مرنے
سے بچایا اور خلافت کی گاڑی میں بٹھا کر جے جے ہسپتال میں پہنچایا۔ مسلمان خود ان پر
حملہ آور ہونے کے لئے تیار تھے اور انھوں نے کہا کہ اگر تمہارا جی اسی سے خوش ہوگا
تو آؤ مجھ پر حملہ کرو۔ جب یہ لوگ خلافت کی گاڑی پر لاٹھیاں برسانی چاہتے تھے تو انھوں
نے کہا کہ اگر اس گاڑی کو توڑ ڈالوگے تو تمہیں کو اس کے عوض دوسری گاڑی کے دام
دینے ہوں گے۔ یہ میری ملک نہیں ہے تمہارے ہی پیسے سے دوسری موٹر خریدی
کی جائے گی۔ اس کے بعد وہ مسلمان شرمائے اور شوکت صاحب نے اس غریب
ہندو کو اسپتال پہنچایا اور پولیس والوں نے اور اسپتال والوں نے ان کی خدمات کا
اعتراف کیا۔ آج "ٹائمز آف انڈیا" کے سب اڈیٹر سے ملاقات کرتے اور اس کے
رپورٹر کو اپنا بیان دینے کے بعد میں خود کماٹی پورہ میں گیا اور مسلمانوں کی ہر گلی
میں جا کر خدا اور رسول کا ان کو واسطہ دیا اور ان کو مل والوں کے ظلم کی تقلید سے روکا
اور شرم دلائی۔ میں وہاں سے نکل ہی رہا تھا کہ ہندوؤں کی ایک جماعت مسلمانوں
کی طرف بڑھی۔ جب مسلمان بھی اپنی گلیوں سے نکل کر اپنے ہم مذہبوں کی حمایت کے
لئے آئے تو فوج کی طرف سے گولی چلنا شروع ہوئی۔ گولی چل ہی رہی تھی کہ سامنے
سے ایک کپڑے کی گاڑی والا اپنی گاڑی ہانکتا ہوا نکلا۔ اس پر چند مسلمانوں نے

حملہ کیا تو میں فوراً ٹیکسی میں سے کود پڑا اور ان حملہ آوروں کے پیچھے بھاگا اور ان کو خدا
اور رسول کا واسطہ دے کر منع کیا اور اس نا کردہ گناہ کو مارے جانے سے بچایا۔ آگے
جا کر دیکھا تو پولیس اور فوج کا پکٹ کھڑا ہوا تھا اور بظاہر مجھے ان مسلمانوں کو روکتے
ہوئے دیکھ کر انھوں نے گولی چلانے سے احتراز کیا تھا اور سب نے اس کا اعتراف
کیا کہ میں نے اس غریب کی جان بچائی۔ کاش میری صحت کی حالت بہتر ہوتی اور میں
بھی ہر ہنگامے میں گھستا اور اس فتنے کو فرو کرتا مگر بقول غالب ؎

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے

ہر ہنگامے میں جا کر دوڑ دھوپ کرنے کی طاقت نہیں اور گھر میں بیٹھ کر
مضامین لکھنے یا مصنوعہ جلسوں میں جا کر تقریر کرنے سے شرماتا ہوں ع

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے

جب اسپتال میں تھا تو وہاں ناظر خاں کی دوشیزہ بیوہ اور مرحوم کے بھائی کو دیکھا
وہ میت کے لینے کے لئے اترسوں سے اسپتال میں آئے ہوئے تھے اس وقت
تک نہ کارونر نے میت کے دفن کرنے کی اجازت دی تھی اور نہ میرے بار بار کہنے پر
بھی پولیس ان پس ماندوں کو ان کے گھر تک پہنچانے کے لئے تیار تھی۔ بالآخر
شوکت صاحب مجھے دیکھنے کے لئے آئے تو ان کے ہمراہ میں نے ان بیچاروں
کو ان کے گھر تک پہنچایا۔ پرسوں صبح سے وہ پھر میت لینے کے لئے آئے ہوئے
تھے مگر کارونر کی اجازت نہیں آ چکی تھی۔ اسپتال کے ڈاکٹروں کے اصرار سے
میں نے مسٹر   کو بار بار ٹیلیفون کیا اور بالآخر تدفین کی اجازت ملی۔ اب میت
لے جانے کے لئے پولیس کی امداد درکار تھی مگر اس کا ملنا ناممکن ہو رہا تھا۔ میں نے خود
مقامی پولیس کو دیکھا تھا کہ وہ مل والوں سے : تو کلہاڑیاں چھینتے تھے : تیغ : حالانکہ

پولیس کی لاریاں اور پولیس کے افسر اسی جماعت میں سے گذر رہے تھے۔ میرا قیاس ہے کہ وہ اس بزدل جماعت کو اگر ذرا بھی ڈانٹتے تو ان کے ان دقیانوسی ہتھیاروں کو ذراسی دیر میں رکھوا لیتے۔ ارون اسپتال کے ایک ڈاکٹر صاحب نے خود مجھ سے فرمایا کہ دو پولیس والوں نے ایک ایسی ہی بڑی جماعت کو للکارا تھا اور ان سے تیر اور لاٹھیاں ڈال دینے کو کہا ہی تھا کہ سب کے سب ہتھیاروں کو زمین پر ڈال کر فوراً بھاگ گئے۔ یہ واقعہ خود ان کی والدہ کا چشم دید ہے۔ ارون اسپتال میں نظر خاں کے علاوہ بھی چار پٹھان جن میں سے بڑی مشکل سے تین کے نام پولیس والوں کو مل سکے تھے برف خانے میں پڑے ہوئے تھے اور اب ان کی تدفین کے لئے بھی کارونر کی اجازت آگئی ہے۔ پرسوں دوپہر سے میں پولیس کمشنر، ہوم سکریٹری اور گورنر صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری تک کو ٹیلیفون پر ٹیلیفون دیا تھا کہ ان لاشوں کو ان کے ورثاء تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا جائے لیکن جو مایوس کن جوابات مجھے ان حضرات سے ملے وہ خود نہایت حیرت انگیز ہیں۔ پولیس کمشنر اور ڈپٹی کمشنر تو پٹھانوں کے اس وفد سے گفت وشنید میں مصروف تھے جو کسی نہ کسی طرح ان کے دفتر تک پہنچ پایا تھا اور ان سے کہہ رہا تھا کہ آپ ہماری کیا حفاظت کر رہے ہیں۔ اگر آپ ہماری حفاظت نہیں کر سکتے تو پھر ہم سے جو کچھ ہو سکے گا ہم خود ہی کر لیں گے۔ ہوم سکریٹری صاحب نے فرمایا کہ حکام کو ابھی زندوں کی حفاظت سے فرصت نہیں ابھی مردوں کا سوال پیش نہیں کیا جا سکتا حالانکہ جیسی کچھ زندوں کی حفاظت ہو رہی تھی وہ سب جانتے ہیں۔

مجبور ہو کر میں نے گورنر صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری کو ٹیلیفون دیا انھوں نے فرمایا کہ میں پولیس کو کوئی احکام نہیں دے سکتا جس کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ پرائیویٹ سکریٹری کا کام احکام جاری کرنے

کا نہیں ہے مگر وہ اور جن کے وہ پرائیویٹ سکریٹری ہیں پولیس سے کم از کم پوچھ سکتے
ہیں کہ وہ ان لاشوں اور ان کے ورثا کی حفاظت کے متعلق کیا کر رہے ہیں ان
کا آخری جواب یہی تھا کہ ہم پولیس کے معاملے میں کوئی دست اندازی کرنا نہیں
چاہتے۔ اگر تم چاہو تو مقامی پولیس کو ٹیلیفون کر سکتے ہو۔ میں نے لاکھ عرض کیا کہ پولیس
کے حکام میری کیا سنیں گے مگر انھوں نے اس کام کو میرے ہی سر تھوپا۔ میں نے
پوئی باؤڈی کے تھانے کو ٹیلیفون دیا تو معلوم ہوا کہ سب حکام تھانے کے باہر
انتظام کر رہے ہیں اور مجھ کو ہدایت دی گئی کہ تم ان سے جاکر کہہ دو میں ہسپتال
میں مقید تھا کیا کر سکتا تھا لیکن جب کچھ دیر بعد شوکت صاحب آئے تو میں نے انھیں
اور عزیزی زاہد علی کو اسی ہنگامے میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بھیجا اور ہم
ان کے مشکور ہیں کہ انھوں نے ایک لاری اور کچھ پولیس والوں کے دینے کا
وعدہ فرمایا۔ میں نے ہوم سکریٹری صاحب اور گورنر صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری
صاحب سے یہ بھی ٹیلیفون پر عرض کر دیا تھا کہ اگر خلافت کے والنٹیر میتوں اور
ان کے ورثا کو ہسپتال سے لے کر باہر نکلے اور ان پر حملہ ہوا تو پھر یقیناً یہ ہنگامہ
ایک بین الملل جنگ کی شکل اختیار کرے گا ورنہ ہم جیسے نان کوآپریٹروں کو پولیس
کی امداد حاصل کرنے سے کیا واسطہ۔ انھوں نے میرے اس خیال کی تو تائید
فرمائی لیکن اس کے علاوہ کچھ نہ کر سکے بلکہ ہوم سکریٹری صاحب تو اس کا بھی وعدہ
فرماتے تھے کہ وہ کچھ ہونے کے بعد پولیس کمشنر یا کسی اور حاکم سے سوال کرنے کے
بعد اس کا جواب بھی مجھ تک پہنچا سکیں گے۔ جب میں نے ان سے عرض کیا کہ
کیا آپ مجھے اس کی بھی اطلاع نہیں دے سکتے کہ وہ حضرات کچھ نہ کر سکیں گے
تو بہت تامل کے بعد فرمایا کہ ہاں اس کی اطلاع کر دوں گا اور میں اسی کا شکریہ
ادا کرتا ہوں کہ ہوم سکریٹری صاحب نے پولیس کے کچھ نہ کر سکنے کی مجھے ٹیلیفون

۱۲۹

پہنچا کر اطلاع دے دی۔ ڈاکٹر جیوراج مہتا اسپتال کے افسر اعلیٰ نے شوکت صاحب کو مشورہ دیا کہ بہتر ہو کہ لاشیں شب کو نکال دی جائیں اور ہم نے اسے قبول کیا مگر شب کو بھی لاری وغیرہ کچھ نہ مل سکی اور گو شوکت صاحب ایک لاری لائے تھے مگر پولیس کی حفاظت نہ ملنے کے باعث اسے واپس کرنا پڑا۔ میں نے جب ہوم سکریٹری صاحب اور گورنر صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری سے یہ سنا کہ پولیس ناکافی ہے تو عرض کیا کہ آخر وہ فوج کیا کر رہی ہے جس پر جواب ملا کہ "ہاں اب فوج بھیجی جانے والی ہے"۔ جب ہماری آنکھوں کے سامنے دو پٹھانوں کے علاوہ مسٹر پیٹلے بھی مارے جا چکے تو فوج بالآخر بلائی گئی اور اس کے بعد وہاں گونہ سکون پیدا ہو گیا تب جا کر کل دوپہر کو پولیس اور لاری ہسپتال لائی گئی اور نافر خاں کی لاش اور مرحوم کی بیوہ اور اس کا چھوٹا بھائی اور ایک چچازاد بھائی اس کے ساتھ روانہ ہوئے اور ہم بھی ان کے اطمینان قلب کی خاطر ڈاکٹر صاحب اور پولیس کے کہنے سے میت کے ساتھ خلافت کی موٹر میں سیون گئے اور دھاراوی کے قبرستان میں جا کر میت کو وہاں کے پٹھانوں کی مختصر سی جماعت اور دوسرے مسلمانوں کے سپرد کیا اور اس کے بعد میں ڈاکٹر مہتا سے اجازت لے کر مع اپنے سامان کے دفتر خلافت اور سیوری میں خلافت کی سائٹ میں پہنچا جہاں تقریباً سارے گھر کو شدید بخار یا چیچک یا نمونیا میں مبتلا پایا۔ اسی شب کو اس کی بھی اطلاع ملی کہ کچھ مل والے دار الخلافت اور خلافت کی سائٹ کو آگ لگانے کا خیال ظاہر کر رہے ہیں۔ میں نے سنا کہ مسٹر زیبان کے استفسار کرنے پر ڈانگے صاحب وغیرہ نے انھیں اطمینان دلایا ہے کہ یہ افواہ غلط ہے اور کسی کا ایسا خیال نہیں۔ ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم‌ہائے دگر

جہاں ہم خود ملک و ملت کے لیے جان دینے کو تیار رہیں وہاں ہمارے بال بچے

بھی اس کے لیے صادق ہیں سے

چہ بود نصیب دشمن کہ شود شہید تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ایک طرف مختلف ہنگاموں میں جاکر فتنوں کے فرو کرنے کی کوشش ہے،
دوسری طرف مصیبت زدوں کو خوراک وغیرہ پہنچانا اور ان کا محاصرے سے
نکالنا ہے اور ان کی میتوں کی شناخت کرانا اور ان کی تجہیز وتکفین ہے۔ میں پریل
کے شفا خانے سے نکل آیا ہوں اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ باقی چار میتوں کا جو وہاں
تھیں کیا حشر ہوا۔ بمبئی سے چلتے وقت میں پریل اسپتال گیا تھا تو معلوم ہوا کہ ابھی
تک مسلمانوں کی چاروں میتیں وہیں برف خانے میں پڑی ہوئی ہیں۔ اپنے پٹھان
بھائیوں کی اطلاع کے لیے ان چار میتوں میں سے تین کے نام درج کرتا ہوں جو
حسب ذیل ہیں (۱) بلال حسن (۲) عبدالواحد (۳) آغا محمد طلبندیہ۔ پرسول
ڈلاہل روڈ پر شہید ہوئے چوتھے شہید کا اس وقت تک پولیس کو بھی نام نہیں معلوم
ہوا لیکن اس کا ۵ فروری کو سوا دو بجے (بمبئی ٹائم) انتقال ہوا۔ جن بھائیوں
کو ان کے ورثاء کے متعلق کچھ معلوم ہو وہ پریل کے اسپتال میں اطلاع دے دیں اور
ورثاء کو وہیں روانہ کردیں۔ اگر ورثاء کا پتہ نہ چل سکا تو ہمیں مجبوراً ان کی تجہیز وتکفین
کا انتظام کرنا پڑے گا۔ میرے اسپتال کے کمرے میں کفن کے لئے تھان دو دن
تک رکھے رہے اور ناظر خاں کا تو کفن بھی وہیں سے دیا گیا تھا مگر مرحوم کے ورثاء
نے خود ہی تجہیز وتکفین کرنا چاہی اس لیے وہ کفن یوں ہی پڑا رہا۔ یہ ہے وہ کام
جس میں وہ شوکت صاحب اور "خلافت والوں" نے مدد کا ہاتھ بڑھایا اور یہ ہے وہ
کارگذاری جس کے لیے شوکت صاحب مختلف مقامات پر موٹر سے لیے ہوئے گھوم
رہے ہیں۔

میں علی الاعلان کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دل پر بمبئی کے ان واقعات کا
نہایت گہرا اثر پڑا ہے۔ بظاہر اس متمدن اور تعلیم و تہذیب یافتہ شہر میں بھی ہزاروں
لاکھوں اس کے قائل ہیں کہ پل بنانے کے لئے انسانی قربانی ہندوستان میں کی
جاتی ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ اس کا الزام پٹھان جیسے مسلمانوں پر لگایا جائے حالانکہ
پل بن رہا ہے ایک مرہٹہ ریاست میں اور کبھی کسی مسلمان کے ذہن میں بھی یہ خیال
نہ آیا ہوگا کہ پل بنانے کے لئے کسی دیوتا کے آگے کسی آدمی کے بچے کی قربانی
چڑھائی جائے۔ اس سے بڑھ کر کیا نامردی ہوگی کہ ہزاروں ہٹے بند یکہ دو کہ
یہ گنڈوں پر ٹوٹ پڑیں اور ان کو موت کے گھاٹ اتاریں۔ میں کماٹی پورہ میں
جاکر وہاں کے مسلمانوں کی خدمت میں عرض کر آیا ہوں کہ کوئی بھی ایسی نامردی
کا جرم کیوں نہ ہو لیکن یہ ہرگز ایک مسلمان کے شایان شان نہیں اور اسلام اس کی
ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کسی ملزم کی تحقیقات کیے بغیر اس پر حملہ کیا جائے اور
اسے موت کے گھاٹ اتارا جائے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ خواہ ان میں سے
کتنے ہی اس طرح کیوں نہ مارے جائیں وہ انتقام کے طور پر بھی اس ظالمانہ اور
وحشیانہ حرکت کی تقلید سے احتراز کریں ہمیں سنت محمدیہ کی تقلید کرنا ہے نہ کہ کسی
اور سنت کی اور کچھ نہیں تو کم سے کم کفر اور اسلام میں کچھ تو امتیاز رکھنے کی خاطر
اس انتقامانہ تقلید سے احتراز ہر مسلمان پر لازم ہے ورنہ وہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی شفاعت اور خدا کی رحمت سے محروم ہوگا۔

وما علینا الا البلاغ

ہندو مسلم اتحاد

اور

مسلم اقلیت کے تحفظ کی کشمکش

(۱) مسلم اقلیت کے تحفظ کے تین دور

ہمدرد ۱۰؍اپریل ۱۹۲۷ء

۲۰؍مارچ کو رائے سینا میں مسلمان ممبران اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کی انتخاب کردہ سب کمیٹی کا دوبارہ ہندو مسلم تعلقات پر جلسہ ہوا تھا، اور گو حاضرین کی تعداد تین پینتیس سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن جتنے مختلف سیاسی اور مذہبی عقائد کے عناصر سے ہندوستان کی ملت اسلامیہ مرکب ہے ان میں سے ہر ایک کے نمائندے اس مجلس میں موجود تھے۔ اور آج کل جب کہ تحریک ترک تعاون کمزور نظر آتی ہے جو تناسب اعداد ان مختلف عناصر کا عام طور پر مسلمانوں میں ہے بالکل وہی تناسب اعداد اس مختصر سی مجلس میں بھی صاف نمایاں تھا۔ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے طرفدار بھی تھے اور ایک حد تک دونوں کے مخالف اور اس کے خواہاں کہ دو انتخابوں کی میعاد کے لئے دونوں قسم کے حلقہ ہائے انتخاب کو قائم کر کے ان کا امتحان کر لیا جائے۔ اگر مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے سے ہندوؤں کی اکثریت "بس بھرے" محض نام کے مسلمان امیدواروں سے خاص مسلمانوں کے لئے مقرر شدہ نشستوں کو پُر کرے جن کے لئے خود مسلمانوں نے بہت ہی کم رائے دی ہوں یا بالکل نہ دی ہوں، اور جو ہمیشہ ہندو اکثریت ہی کے موافق کونسلوں میں رائے دیا کریں۔ اگر مسلمانوں کی اس سے حق تلفی ہو تو آئندہ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب نہ جاری رکھے جائیں اور آج کل کی طرح صرف مخصوص ملی حلقہ ہائے انتخاب سے مسلمان امیدوار منتخب کئے جائیں اور اگر مخصوص ملی حلقہ ہائے انتخاب سے تنگ نظر، متعصب اور حکومت پرست مسلمان

منتخب ہوں جو مفاد ملک کا لحاظ نہ کریں بلکہ سب کے سب مل کر حکومت ہی کے موافق کونسلوں میں رائے دیا کریں اور ہندوؤں کے واجبی مطالبات کی بھی مخالفت کیا کریں اور ان کی حق تلفی کے خواہاں ہوں تو مخصوص ملی حلقہ ہائے انتخاب نہ جاری رکھے جائیں بلکہ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب ہی جاری رہیں بعض مسلمان ممبران کونسل کی رائیں تاروں کے ذریعے سے مخصوص ملی حلقہ ہائے انتخاب ہی کے موافق اخبارات تک پہنچی ہیں اور بعض مسلم اخبارات نے بھی انھیں حلقہ ہائے انتخاب کی موافقت کی ہے اور یہ ظاہر یہ حضرات اور یہ اخبارات ۲۰ مارچ کی منظور شدہ تجویز کے مخالف ہیں مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات اور ان اخبارات نے صرف ان دو قسم کے حلقہ ہائے انتخاب ہی کے حسن وقبح پر نظر کی ہے' اس کی طرف مطلق توجہ نہ کی ہے کہ مسلمان آج ہر صوبے کی کونسل اور نیز اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ میں اقلیت میں ہیں اور گو ان کی نمایندگی پنجاب اور بنگال کے صوبوں کے سوا ہر جگہ آبادی میں ان کے تناسب اعداد سے زیادہ ہے تاہم کسی صوبے کی کونسل میں بھی مسلم اقلیت کو اکثریت نہیں دی گئی ہے بلکہ بنگال میں تو ان کی آبادی میں اکثریت کو بھی کونسل میں اقلیت کر دیا گیا ہے۔ اگر ہندو اراکین مجالس قانون ساز کی ذہنیت وہی رہی جو آج ہندو سبھا نے کر دی ہے اور ہر ایسی مجلس میں مسلمانوں کی اقلیت اور اس کی ذہنیت والے ہندوؤں کی اکثریت ہے تو اس سے کیا حاصل کہ ان مجالس کے اراکین وہی ہوں گے جو ہندوؤں کے مقابلہ کرنے کا بیڑا اٹھا کر میدان انتخاب میں گئے ہوں؟ یہ کوئی لڑائی کا میدان تو ہے نہیں کہ ع

یکے مرد جنگی بہ از صد ہزار

جب قسمتوں کا فیصلہ سر کاٹنے سے کیا جاتا تھا تو مسلمانوں کو اپنی اقلیت کی پرواہ نہ تھی۔ جن مٹھی بھر مسلمانوں نے سارے ہندوستان کو فتح کر ڈالا تھا اور پھر

صدیوں اس پر حکمراں رہے تھے ان کو آج بھی ایسے ہی مسلمانوں کی اقلیت پر اعتماد
ہو سکتا تھا جو اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کا بیڑا اٹھا کر میدان جنگ میں آتے ہوں
لیکن جب رزم کی جگہ بزم نے لے لی ہو اور مجالس قانون ساز میں قسمتوں کا فیصلہ
سر کاٹنے سے نہ کیا جاتا ہو بلکہ سر گننے سے تو پھر مسلم اقلیت کا کیا حشر ہوگا۔ اگر ہندو
کی ذہنیت وہی رہی جو ہندو سبھا والے ہندو اور جمعیت خلافت کے مخالف مسلمانوں
نے اپنے تعصبات اور تنگ نظری سے کردی ہو تو اقلیت کی تعداد میں تھوڑا سا
اضافہ کرنا بھی بے سود ہے۔ "آب چو از سر گذشت چہ یک نیزہ و چہ یک دست"
دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ ڈوبتے ہوئے آدمی کے لئے آدمی ڈباؤ پانی ہی کافی
ہے ہاتھی ڈباؤ پانی ہونے سے اس کی حالت بدتر نہیں ہو سکتی۔ ۲۰ مارچ کے جلسے میں اس
مہلک اقلیت کی خرابیوں پر بھی توجہ ہوئی اور جو فیصلہ کیا گیا وہ یہ خیال کر کے نہیں
کیا گیا کہ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب میں کچھ عیب نہیں یا مخصوص حلقہ ہائے انتخاب
میں کوئی خوبی نہیں۔ بلکہ یہ خیال کر کے کیا گیا کہ اھون بلیتین یعنی دو بلاؤں میں کم
کونسی ہے۔ اگر میرے وہ برادران ملت جو آج اس فیصلے سے اختلاف رکھتے ہیں،
ٹھنڈے دل سے غور کریں تو جس طرح مسلمانوں کے سب مختلف عناصر ۲۰ مارچ
کو رائے سینا کے جلسے میں ایک ہی فیصلے پر ایک حیرت انگیز طریقے پر متفق ہو گئے
تھے وہ بھی اس فیصلے پر متفق ہو جائیں گے۔ قیامت تو یہ ہے کہ اس مشکل کی طرف
توجہ نہیں فرماتے جس کا ہمیں حل کرنا ہے اور فروعی امور پر اس طرح متوجہ ہوتے
ہیں کہ گویا وہی اصولی امور ہیں۔ اصل مشکل جس کا ہمیں حل سوچنا ہے یہ نہیں ہے
کہ مسلمان امیدواروں کو کون منتخب کرے فقط مسلمان رائے دینے والے یا
ہندو مسلمان مل کر۔ یہ اصل مشکل ہرگز نہیں ہے۔ اصل مشکل یہ ہے کہ جس ملک
میں مسلمان اقلیت میں ہوں اور ہندو اکثریت میں اور دونوں ملتوں کی ذہنیت

ایسی ہو کہ ایک دوسرے کو دشمن سمجھے اور ہندو اکثریت کے انصاف اور رواداری پر مسلمان اقلیت کو بالکل بھروسہ نہ ہو مگر فیصلہ ہر امر میں اکثریت ہی کے موافق کیا جائے تو مسلم اقلیت کے حقوق کا تحفظ کیوں کر کیا جائے؟ میری اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں عرض ہے کہ خدارا اپنے عقدے کی حقیقت کو سمجھیے پھر اس کے حل کرنے کی طرف متوجہ ہوجیے۔ اگر آپ نے حقیقی عقدے ہی کو اب تک نہیں سمجھا ہے تو آپ قیامت تک اس کو حل نہ کر سکیں گے۔ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقی عقدہ وہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے تو آگے بڑھیے ورنہ اس پرچے کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیجیے اور جس کسی کو آپ نے سچا خادم ملت "ہندو پرستی" سے پاک صاف، سیاسیات کا ماہر اور ملت اسلامیہ کا بہترین راہ نما سمجھا ہو اس سے ہدایت حاصل فرمایئے۔ میں آپ کے لیے بالکل بے کار ہوں۔

ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ حقیقی عقدہ جسے ہم کو اور آپ کو حل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہر امر کا فیصلہ اکثریت ہی کے موافق کیا جائے تو مسلم اقلیت کے حقوق کا تحفظ کیوں کر ہو۔ مسلمانوں کو اس عقدے کو سوائے چین کے جہاں ان کی آبادی ہمیشہ سے کم تھی اور جہاں ان کی حکومت نہ تھی صرف انھیں ممالک میں حل کرنا پڑا ہے جہاں پہلے ان کی حکومت تھی مگر بعد میں اپنی بداعمالی سے وہ اس حکومت کو کھو بیٹھے۔ اسپین میں انھیں اس عقدے کے حل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا اور عیسائی اکثریت نے پھر حکومت حاصل کرتے ہی انھیں یا تو بالجبر عیسائی بنالیا یا دیس نکالا دیا۔ یورپ کے اور ممالک سے وہ اس سے پہلے ہی نکالے جاچکے تھے اور فرانس، جنوبی اطالیہ اور سسلی سے اسلامی حکومت کے ساتھ ہی اسلامی اقلیت بھی نکل گئی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ یورپ کے جنوب و مغرب سے ان کی حکومت رخصت ہو خداوند کریم نے یورپ کے جنوب مشرق میں ان کو محمد فاتح کے ذریعے

سے اسپین کا نعم البدل عطا فرما دیا تھا۔ جوں جوں ترکوں کے عمل صالح میں کمی ہوتی گئی، ان کی حکومت یورپ کے اس حصے میں بھی رخصت ہوتی گئی اور پولینڈ، روس، رومانیہ، سرویا، البانیا، بلغاریہ اور یونان وغیرہ میں مسلمانوں کی حق تلفی ہونے لگی۔ عدل و انصاف کو جانے دیجئے، رواداری کا نام نہ لیجیے۔ یہ صفتیں انسانوں کی قوموں میں تقریباً عنقا کا حکم رکھتی ہیں بالخصوص ان قوموں میں جنھوں نے اسلام کی ہدایت کو قبول نہیں کیا اور بقول حالی مرحوم کے ؂

حق ہے غالب کا کہ رگڑے اور کچلے مغلوب کو
ہے یہی مغلوب ہونے کا مآل انجام کار

جب ان ترکوں کا سیلاب فتح جو سترھویں صدی عیسوی میں اسٹریا کے دارالسلطنت ویانا کے دروازے سے ٹکرا کر پولینڈ کے عیسائیوں کی مقاومت کے بعد کم ہوا اور چڑھی ہوئی ندی اترتے اترتے خود ہماری آنکھوں کے سامنے اس طرح خشک ہوگئی کہ یورپ کے نصاریٰ نے دارالسلطنت قسطنطنیہ تک پر قبضہ کرلیا۔ خلیفہ کو باسفورس کا قیدی بنالیا اور یورپ میں سے اسلامی حکومت کو نکال باہر کرنے کا تہیہ نہ کرلیا بلکہ ایشیا میں بھی ولایت آرمینیا کو جہاں عیسائیوں کی اقلیت ہی تھی پوری وسعت دے کر ساحل بحر ابیض تک بڑھا دیا اور نصاریٰ کو وہاں کی حکومت سپرد کردی اور ترکوں کے آبائی وطن کی سرزمین تک کو جو ایشیائے کوچک کے نام سے مشہور تھی برطانیہ کے پٹھو یونان کے حوالے کردیا تو ہندوستان کے مسلمان بھی چونکے اور اسلام کی قوت بازو کے اس خاتمے کو انھوں نے گوارا نہ کیا جو ایک عہدنامے کی شکل میں ایک غدار ترکی سلطان اور اس کے غدار وزرا اور نمایندوں سے پیرس کے پاس سیور کے مقام پر قبول کرایا گیا تھا اور ترکوں نے بھی مصطفےٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں اپنی حب وطن، مردانہ شجاعت، جفاکشی

اور فوجی نظم و ترتیب کا حیرت انگیز ثبوت دیا اور سوئٹزرلینڈ کے شہر لوزان میں سیورے کے شرمناک معاہدے کو چاک کر کے ایک نئے صلح نامے پر یورپ کی نصاریٰ کی دول کے دستخط کرائے. آپ اس سے اچھی طرح واقف ہیں. مگر آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ ترکوں نے یونان میں اپنی اقلیت کے تحفظ کی کیا صورت نکالی؟ انھیں سوائے اس تقریباً ناقابل عمل تجویز کے کوئی صورت نظر نہ آئی کہ جس طرح جنگ بلقان کے بعد اس غارت شدہ مقدونیہ سے جسے بلقان کے نصرانی اتحادیوں نے "خالی انڈے کا چھلکا" بنا کر چھوڑ دیا تھا بچے کھچے اور تباہ حال مسلمانوں کی اقلیت کو یورپ سے ایشیاء کو چک میں بلا لیا تھا. اسی طرح یونان میں بچی کھچی اور تباہ حال مسلم اقلیت کو بھی یورپ سے ایشیائے کوچک میں بلا لیں اور یونان سے کہہ دیں کہ تو بھی اپنے ہم قوموں کو جو ہماری غدار اور فتنہ انگیز رعایا ہیں یونان بلا لے.

مسلمان ہمیشہ ہندوستان میں اقلیت ہی میں رہے اور یا تو ہمارے انصاف اور رواداری کے باعث (جیسا کہ میں سمجھتا ہوں) وہ یہاں صدیوں تک باوجود اس کے حکمراں رہے کہ ہندوؤں میں بھی شجاعت اور ہمت تھی اور راجپوتوں سے زیادہ شجاع جماعت شاید دنیا بھر میں ڈھونڈھے نہ ملے یا پھر ہندو نہایت ہی بزدل اور کم ہمت تھے کہ انھوں نے ان مسلمانوں کی اتنی صدیوں تک حکومت برداشت کی جو (بقول ڈاکٹر مُنجے صدر ہندو سبھا اور ہندو سبھائی اور آریہ سماجی حضرات کے) ان کو بالجبر مسلمان اور ان کی خواتین کو اپنی بدفعلیوں کا شکار بناتے تھے. اگر یورپ کی طرح ہندوستان کی حکومت بھی اس کے مسلمان فاتحین کے ہاتھوں سے نکل کر اس کی اس غیر مسلم رعایا کے ہاتھوں میں جاتی جو یورپ کے نصاریٰ کی طرح جذبۂ انتقام سے سرشار تھی تو وہی عقدہ ہمیں بھی حل کرنا پڑتا جسے آج ترکوں کو یونان میں حل کرنا پڑا ہے لیکن ہندوستان میں صورت حالات وہ نہیں جو یورپ میں مسلمانوں کے لئے

بار بار پیدا ہوئی۔ ان پر یہاں آج ہندو اکثریت حکمراں نہیں ہے بلکہ جس طرح ہندوستان کو فتح کرتے وقت خود وہ ایک نہایت ہی مختصر اقلیت میں تھے اسی طرح کی ایک اقلیت یورپ سے آکر ان کی اقلیت اور ہنود کی اکثریت دونوں پر حکمراں ہو گئی ہے۔ ہم دونوں اس اقلیت کی حکومت سے نالاں ہیں اس لئے کہ ہم دونوں کی روز بروز حق تلفی ہو رہی ہے مگر افسوس ہے کہ ہم میں اتحاد و اتفاق عنقا ہے۔ اس لئے یہ یورپ کی اقلیت آج تک دونوں پر حکمراں ہے اور دونوں کو باری باری سے دباتی رہتی ہے۔

اس نے پہلے تو ہنود کو یہ کہہ کر اپنا مطیع بنایا کہ اسے مسلمانوں کی اقلیت کی حکومت سے یہ انگریزی اقلیت کی حکومت نجات دلانے آئی ہے اور چونکہ اس ہندو اکثریت کو تاریخ سے اس قدر کم دلچسپی تھی اور فلسفے کی بھول بھلیوں میں یہ اس طرح گرفتار تھی کہ آج تک اس میں ہزاروں برس سے ایک مورخ بھی پیدا نہیں ہوا اور اس نے ایک تاریخ بھی نہیں لکھی۔ اس لئے اس انگریزی حکومت نے اس کے بچوں کی ذہنیت بدلنے کے لئے مدارس میں وہ جھوٹی تاریخ پڑھانی شروع کی جس نے اس اکثریت میں مسلمان اقلیت کے خلاف ایک عجیب جذبۂ انتقام پیدا کر دیا۔ باوجودیکہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے بعد سلطنت مغلیہ کے دور انحطاط و انتشار میں مرہٹے اور ان کے کارفرما "مرہٹہ برہمن" مغربی ہندوستان میں حکمراں ہو بیٹھے تھے اور بھونسلے ناگپور میں، گائیکوار بڑودہ میں، ہلکر اندور میں اور سندھیا گوالیار میں حکمراں ہو چکے تھے بلکہ سندھیا کا اثر و نفوذ دہلی کے مغلیہ دربار تک تھا اور صوبجات متحدہ کے بعض مقامات تک پھیلا ہوا تھا اور سکھ پنجاب پر حکومت کر رہے تھے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی حکومت مسلمانوں کی حکومت ہی کی جانشین تھی اور اس لئے اس نے ہندوؤں

اور سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھار کر اپنا وفادار بنانا چاہا اور غدر کے بعد جو انتقام لیا گیا اس کے لیے ایک مسلمان بادشاہ اور مسلمان امرا ہی پر انگریزی حکومت کی نگہ انتخاب پڑی جس طرح اکبر نے بیرم خاں کی اتالیقی سے چھوٹ کر ان افغانوں کے خلاف جنھوں نے اس کے باپ ہمایوں کو ہندوستان چھوڑنے اور ایران میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا ہندوؤں ہی کو اپنی مذہبی بدعات و خرافات سے پرچانا شروع کیا تھا اور خود اپنی فاتح قوم پر بھی ان افغانوں کے خلاف پوری طرح اعتماد نہ کر سکتا تھا اس لیے کہ بہت سے مغل بیرم خاں کے ساتھ تھے۔ اسی طرح انگریزی حکومت نے ہندوؤں ہی کو مناصب و مراتب دے کر پرچانا شروع کر دیا اور جب مسلمان پہلے کی طرح نہ اس کے ملکی دفاتر میں، نہ اس کی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز و سرفراز ہوتے تھے، نہ اس کے مدارس ہی میں اپنے بچوں کو بھیج کر اس کی تعلیم و تہذیب کو اپنی تعلیم و تہذیب کے مقابلے میں منع سمجھ کر اس سے مستفید ہوتے تھے۔ ہندوؤں نے اس کے ملکی دفاتر میں بھی ان متوسط درجوں کے عہدوں پر بھی جو اس تنگ دل حکومت کے عہد میں ہندوستانیوں کو دیے جا سکتے تھے قبضہ جمانا شروع کر دیا اور جس طرح پہلے وہ مسلمانوں کی تعلیم و تہذیب سے مستفید ہوتے تھے اسی طرح اب وہ بلا تامل انگریزی تعلیم و تہذیب سے مستفید ہونے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اقلیت اقلیت ہی نہیں رہی بلکہ روز بروز ہندو اکثریت اور انگریزی حکومت دونوں کے ہاتھوں ایک مغلوب کی طرح رگڑی، اور دلی جانے لگی۔

یہ جو کچھ ہوا کیا کرایا اسی انگریزی حکومت کا تھا یا مسلمانوں کے اپنے زعم ہی کا کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف بالکل اعتنا نہ کیا نہ اپنی ہی تعلیم کی اصلاح و توسیع کی لیکن انگریزوں کے آلۂ کار ہندو ضرور تھے۔ ایسے موقعوں پر اکثر یہی

ہوا کرتا ہے کہ ایک جرم کے اصل محرک کو نہیں پکڑا جاتا سارا غصہ اس کے آلۂ کار ہی
پر آجاتا ہے۔ انگریزی عمال حکومت نے مسلمانوں کے اس غصے سے اس وقت
بھی پورا فائدہ اٹھایا اور آج بھی پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس وقت انھوں
نے محسوس کیا کہ انگریزی مدارس کی تعلیم اور بالخصوص ان کی جھوٹی تاریخ ہندوستان
کی تعلیم کا یہ اثر تو ہندوؤں پر ضرور ہوا کہ وہ مسلمانوں کو اپنا تاریخی دشمن سمجھنے لگے؛
لیکن تاریخ انگلستان اور انگریزی ادب کی تعلیم کا بھی یہ اثر ہوا کہ ہندو انگریزوں سے
اپنے حقوق طلب کرنے لگے۔ انگریزی حکومت یہی چاہتی تھی کہ ہندو اکثریت مسلم
اقلیت کو دبا لے۔ وہ یہ کب چاہتی تھی کہ یہ ہندو اکثریت انگریزی اقلیت پر
بھی غلبہ پاسکے؟ چنانچہ اس نے ایک نئی چال چلی۔ اس نے مسلم اقلیت سے کہا
کہ اگر ہندوؤں کے مطالبات منظور کر لیے گئے اور یورپ کی دستوری مملکتوں کی طرح
ہندوستان میں بھی دستوری مملکت قائم کی گئی جس میں جمہور کو مجلس قانون ساز کے لئے
نمائندوں کا حق انتخاب دیا گیا اور کثرت رائے سے فیصلہ ہوا تو مسلم اقلیت کا کیا
حشر ہوگا؟ بہتر یہی ہے کہ ہندوؤں کے مطالبات کو منظور نہ کیا جائے، تم ہماری
حکومت پر بھروسہ کرو، ہم تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ مسلمانوں نے اسے
قبول کیا۔ زیادہ تر تو محض حماقت سے اور انگریزی حکومت کی مسلمانوں کے ساتھ
مخاصمانہ روش کو بالکل بھلا کر لیکن کم از کم سر سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیکھ کر
کہ مسلمان اس وقت کانگریس کے مطالبات کے منظور ہو جانے سے ہرگز مستفید نہ
ہو سکیں گے بلکہ اپنے جہل اور سینہ زوری سے ملک کی سیاست کو بھی فتنہ و فساد
میں مبتلا کر دیں گے۔ مسلمانوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ پہلے تعلیم کی طرف توجہ کریں
اور پھر میدان سیاست میں قدم رکھیں اور ہندوؤں کے ساتھ اس میں گام زن ہوں؛
۱۸۸۵ء سے جبکہ کانگریس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا ۱۹۰۶ء تک جبکہ

انگلستان میں لبرل پارٹی کو تقریباً بیس برس کے بعد کنسرویٹو پارٹی پر ایک نہایت شان دار فتح حاصل ہوئی اور اس نے لارڈ مارلے کو وزیر ہند بنایا اور ہندوستانیوں کے مطالبات کی طرف توجہ کرنے کا وعدہ کیا۔ مسلم اقلیت کے تحفظ کا اسی پر دارومدار تھا کہ وہ انگریزی حکومت پر بھروسہ کرتی رہے لیکن باوجود اس کے کہ مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ نے اپنے آغاز سے ۳۰ برس کے اندر مسلمانوں کی ایک نئی تعلیم یافتہ نسل تیار کر دی تھی مسلمانوں کو کونسلوں کے انتخابات میں اور بعض صوبوں میں میونسپل اور لوکل بورڈوں میں بھی اور بعض صوبوں میں سرکاری ملازمتوں میں اتنا حصہ بھی نہ ملا تھا جس کے وہ اپنی اقلیت کے تناسب اور اپنی قابلیت و استعداد کے مطابق بھی حق دار تھے۔ بہرحال انگریزی عمال حکومت نے محسوس کر لیا تھا کہ کانگریس کے مطالبات کچھ نہ کچھ ضرور منظور ہوں گے، مجالس قانون ساز کے ارکان کی تعداد ضرور بڑھا دی جائے گی اور ان میں عمال حکومت کی تعداد ضرور کم اور رعایا کے نمائندوں کی تعداد ضرور زیادہ کی جائے گی اور ایسی حالت میں مسلمانوں کے سامنے یہ سوال پیش تھا کہ وہ اب بھی انگریزی عمال حکومت ہی پر بھروسہ کیے رہیں یا ہندو اکثریت پر بھروسہ کریں یا کسی اور طرح اپنی اقلیت کے حقوق کا تحفظ کریں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ انگریزی عمال حکومت کی طرف سے اشارہ ضرور تھا مگر اب تعلیم یافتہ مسلمان بھی موجود تھے اور خود انھوں نے بھی جان لیا تھا کہ اب انگریزی عمال حکومت اگر ہمارے حقوق کا تحفظ بھی کرنا چاہیں تو پہلے کی طرح نہ کر سکیں گے اور ہندو اکثریت باوجود انگریزی عمال حکومت کے استبداد کے اب بھی ایک مشترکہ ہندوستانی قومیت کی ذہنیت نہیں رکھتی اور ہماری اقلیت کے حقوق کا تحفظ نہ کرے گی۔ اس لیے رشملہ جا کر یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ ہمیں بطور افراد کے حقوق نہ دیے جائیں اس لیے کہ ہمارے افراد کی اقلیت کو ہندو افراد

کی اکثریت ہمیشہ مغلوب کرتی رہے گی اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب میں ہم صرف وہی
چند نشستیں جیت سکیں گے جہاں ہماری اکثریت ہوگی۔ باقی ہر جگہ ہم اپنے نمائندوں
کے انتخاب میں شکست کھایا کریں گے۔ بہتر یہ ہے کہ عام اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب
کے علاوہ ہمارے لئے چند مخصوص ملی حلقہ ہائے انتخاب بھی قائم کر دئے جائیں جن
کے ذریعے سے ہم اپنے نمائندوں کو مجلس قانون ساز میں پہنچا سکیں اور چونکہ ملک
کی آبادی میں اور ہمارے افلاس کے سبب اس سے بھی زیادہ رائے دہندوں کی
فہرست میں ہماری اقلیت ہے اور جو ملت صدیوں سے تھوڑی ہی مدت پہلے تک
ہندوستان پر حکمراں رہ چکی ہے اس کو اپنی سابق رعایا کی اکثریت سے بالکل مغلوب
کرا دینا سخت ظلم ہوگا۔ اس لئے ہم کو تناسب آبادی سے کچھ زیادہ ہی نمائندگی
دی جائے۔

میں ان دونوں مطالبات کو اس وقت بھی جائز سمجھتا تھا اور آج بھی جائز
سمجھتا ہوں اور سر علی امام صاحب اور "ٹائمز آف انڈیا" کے سابق ایڈیٹر مسٹر اسٹنلی ریڈ
اور موجودہ ایڈیٹر مسٹر شیپرڈ بھی جانتے ہیں کہ ان مطالبات کی تائید میں باوجود بڑودہ
میں ملازم ہونے اور بعض اوقات اپنے افسر اعلیٰ مسٹر رمیش چندر دت کی مخالفت کے،
میں نے کیا حصہ لیا تھا۔ لیکن یاد رہے کہ نہ سر علی امام اس کے موافق تھے نہ میں
اس کے موافق تھا کہ مخصوص مسلم حلقہ ہائے انتخاب کے علاوہ باقی عام حلقوں میں
مسلمانوں کو رائے دینے کا حق نہ دیا جائے، اور وہ حلقہ ہائے انتخاب آج کل کی
طرح "غیر مسلم حلقہ ہائے انتخاب" بنا دئے جائیں۔ البتہ یہ رائے رائٹ آنریبل
سید امیر علی، مہاراجہ صاحب محمود آباد اور مسٹر جسٹس وزیر حسین کی تھی اس لئے کہ وہ
یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ مسلمانوں کو چند نشستیں عام حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے
سے جہاں ان کی آبادی کی کثرت تھی ملا کریں اور چند نشستیں اس طرح ملا کریں کہ ایک

انتخاب میں تو ہندو زمیندار اور تعلقہ دار منتخب ہوا کریں اور دوسرے میں مسلمان، بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ان کی تمام نشستیں خواہ وہ کم ہی کیوں نہ کر دی جائیں خالص اسلامی حلقہ ہائے انتخاب سے طاکریں۔ میں نے سر علی امام اور حکومت ہند کی تجویز کی تائید کی تھی اور "ٹائمز آف انڈیا" "پایونیر" اور دیگر انگریزی اخبارات میں ایک طول طویل مضمون شائع کرایا تھا جس میں لکھا تھا کہ "ہمیں دونوں باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے" آج کی ضرورت ملی کا بھی اور کل کے توقعات اور آرزوہائے قومی کا بھی۔ آج مسلمانوں کی اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم پر بھی نہیں چھوڑا جا سکتا لیکن کل کو ذہنیت قومی کے نشوونما کا راستہ بھی بند نہ کرنا چاہیے۔ مسلمان اپنے نظام ملی کی خوبیوں کے باعث ہندوستان میں انشاء اللہ اس سے کہیں زیادہ حصہ لینے والے ہیں جو آبادی میں ان کا تناسب اور ان کی وہ "سیاسی اہمیت" بھی جسے حکومت نے قبول کر لیا ہے، آج انھیں دیتے ہیں۔ بہر حال یہی تجویز لارڈ مارلے نے منظور کی اور ان جیسے لبرل وزیر ہند کا مسلمانان ہند کے دونوں مطالبوں کو قبول کر لینا اور قبول کرتے وقت ان کی تائید میں دلائل اور براہین پیش کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ مطالبات پھر مسلمانوں کے مذہبی تعصبات، سیاسی تنگ نظری اور مشترکہ قومیت کی مخالفت پر مبنی نہ تھے جیسا کہ آج مسٹر گوکھلے اور لوکمانیہ تلک دونوں کے ہندو متبعین ہندو سبھا میں فرمایا کرتے ہیں۔ ہندو سبھا کے روح رواں پنڈت مدن موہن مالوی نے ان مطالبات کے منظور ہو جانے اور مارلے منٹو اصلاحات کے جاری ہو جانے پر بھی کلکتے میں نئی امپیریل کونسل کے جلسے میں ۱۹۱۱ء میں ان کی مخالفت میں ریزولیوشن پیش کیا مگر خود مسٹر گوکھلے نے ان کی تائید نہ کی اور مسلمانوں کی اقلیت کو آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دیئے جانے کی تائید میں کہا کہ مانا کہ آج حکومت مسلمانوں کی نہیں ہے لیکن "سیاسی اہمیت" کے لئے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ صدیوں تک یہاں مسلمانوں کی حکومت رہی۔ یہ سیاسی اہمیت

کی حیثیت اسی قدر تھی اور ہے کہ اگر مسلمان آبادی میں اپنے تناسب اعداد کے مطابق ہی نمایندگی پا سکتے ہیں اور اکثریت ان کی ہو جو پہلے ان کی رعایا تھے اور اب ان سے انتقام لینے کے جذبے سے سرشار ہیں تو یہ سراسر ظلم ہوگا۔ اسی لیے ان کی تشفی اور ان کا اطمینان کرنے کے لیے لوکمانیہ تلک نے "لکھنؤ پیکٹ" کی منظوری کے وقت بھی اپنے ایک مہاراشٹری چیلے کے اعتراض پر کہ مسلمانوں کو ضرورت سے (یا ان کے حق سے) زیادہ دیا جا رہا ہے کہا تھا کہ تم مسلمانوں کو ضرورت سے (یا ان کے حق سے) زیادہ دے ہی نہیں سکتے یعنی ہندو اکثریت مسلمان اقلیت کو مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ بھی دے گی وہ کم ہے ہرگز زیادہ نہیں۔ مگر آج اسی گوکھلے اور اسی تلک کے جانشین سبھی سیاست کو بھول کر ہندو سبھائی اور مالوی جی کے پیرو بنے ہیں اور افسوس ہے کہ مہاتما جی کے پیرو بھی ان کے خلاف زبان نہیں کھولتے۔

مسلمانوں کی اقلیت کے تحفظ کا پہلا دور یہ تھا کہ سارا اختیار انگریزی عمال حکومت کے اختیار میں تھا اور ہم نے ان پر بھروسا کیا تھا۔ دوسرا دور ۱۹۱۰ء سے شروع ہوا جبکہ مارلے منٹو اصلاحات کا نفاذ ہوا اور اب ہماری اقلیت کا تحفظ اس طرح کیا گیا کہ امپیریل کونسل میں اب بھی اکثریت انگریزی عمال حکومت اور ان کے نامزد کردہ اشخاص ہی کی رہی اور صوبے کی کونسلوں میں ان کی اقلیت اور ہماری اقلیت مل کر ہندو کی اکثریت کو ہر اس امر میں شکست دے سکتی تھی جن میں وہ ہماری حق تلفی کرنا چاہتی تھی لیکن بہت سے امور میں ہمارے نمایندوں نے انگریزی عمال کا ساتھ نہیں دیا اور ہندو اکثریت کا ساتھ دیا۔ یہ اور بات ہے کہ جس طرح ہندو اکثریت میں سب قوم پرور نہ تھے کچھ حکومت پرست بھی تھے، اسی طرح ہماری اقلیت میں بھی سب قوم پرور نہ تھے۔ کچھ اب بھی حکومت کی غلامی میں گرفتار تھے لیکن ایک بڑی حد تک خالص مسلم حلقہ ہائے انتخاب سے آئے ہوئے مسلمانوں نے عام اور

مخلوط حلقہ ہائے انتخاب سے آئے ہوئے ہندوؤں کا ساتھ دیا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ خالص اسلامی حلقہ ہائے انتخاب سے آئے ہوئے مسلمان ممبر ہندوؤں کی یا ہندوستان کی حق تلفی ہی کیا کرتے تھے۔

مسلم اقلیت کے تحفظ کا تیسرا دور اس وقت آیا جبکہ دوران جنگ میں نہ صرف ہندو اکثریت نے بلکہ مسلم اقلیت نے بھی ہوم رول کی تمنا ظاہر کی اور انیس ارکان امپیریل کونسل نے جن میں سب ہندو ہی ہندو نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد تھی انگریزی عمال حکومت سے اصلاحات کا مطالبہ کیا اور لکھنؤ کانگریس کے موقع پر "لکھنؤ پیکٹ" کو کانگریس اور مسلم لیگ نے منظور کیا۔ مسٹر مانٹیگو نے اگست ۱۹۱۷ء میں دار العوام میں ہندوستانیوں کو ذمہ دار حکومت دینے کا اعلان کیا اور بالآخر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ نے لارڈ مارلے اور لارڈ منٹو کی اصلاحات کے نفاذ کے دس برس بعد ۱۹۲۰ء میں موجودہ اصلاحات دیں۔ اب ہر مجلس میں انگریزی عمال حکومت اور ان کے نامزد کردگان کی اقلیت ہے اور گو چند مجالس قانون ساز میں آج بھی مسلمانوں کی اقلیت اور عمال حکومت اور ان کے نامزد کردگان کی اقلیت مل کر اس ہندو اکثریت کو شکست دے سکتی ہیں جو مسلمانوں کی حق تلفی کرنا چاہے۔ تاہم نہ سب صوبجات کی مجالس قانون ساز میں یہ ہو سکتا ہے نہ کسی مجلس میں بھی یہ اس وقت تک ہو سکتا ہے جب تک مسلمان اس کمک اور امداد کی قیمت اس طرح نہ ادا کریں کہ انگریزی عمال حکومت کی اقلیت کے استبداد کو بھی ہمیشہ کمک اور امداد پہنچاتے رہیں۔ گذشتہ ۹ سال کا تجربہ ہمارے سامنے ہے اور ہمیں اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہم اپنی اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم پر چھوڑ دیں یا کبھی کبھی اس کے حملوں سے بچنے کے لئے ہمیشہ انگریزی عمال حکومت کے استبداد کے حق میں رائے دیتے رہیں۔

(۲)۔ نئے دور کی داغ بیل

ہمدرد ۱۰ اپریل ۱۹۲۶ء

مجھے نہ پہلی چیز قبول ہے نہ دوسری۔ جو مسلمان اپنی اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم پر چھوڑنے کو تیار رہیں وہ آج اس کی ذہنیت کو دیکھیں اور بتلائیں کہ کس طرح مسلمان اپنی نسلیں ان ہندو بھائیوں کے حوالے کر سکتے ہیں۔ جب ہم نے ترک تعاون کی تحریک شروع کی تھی اس وقت مسز بسینٹ اور لوکمانیہ تلک کی تحریک ہوم رول نے مالوی جیسے "ماڈریٹ" اور "لبرل" ہندو بھائیوں کو دبا دیا تھا اور مہاتما گاندھی کے سیاست ہند میں شریک ہونے اور "ستیاگرہ" کی تحریک کا آغاز کرنے سے تو ہندو سبھا کی کوئی ہستی ہی نہ رہی تھی۔ باوجودیکہ مسلم لیگ اس وقت بھی زندہ تھا لیکن ۱۹۱۵ء سے جبکہ اس کے اجلاس کانگریس کے ساتھ ساتھ ہونے لگے اور بمبئی کے جلسے میں لارڈ سنہا کی گمراہ کن "رہبری" کے مقابلے میں مولانا مظہر الحق کی رہنمائی ہی نے سارے ہندوستان کے لئے شمع ہدایت کا کام کیا مسلم لیگ کانگریس کا حامی اور کسی قدر اس کے آگے ہی آگے تھا۔ اس وقت لوی جی ع

اکیلے پھر رہے تھے یوسف بے کارواں ہو کر

اس وقت ہم نے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت کے لئے آمادہ کیا اور ہندو اکثریت کے ساتھ مسلمان اقلیت کا اتحاد کرایا اور انھیں اس پر راضی کیا کہ ۱۸۸۸ء میں جو سیاسی پالیسی مسلمانوں کی اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے سرسید احمد خاں رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ہندو اکثریت کی ذہنیت سے مجبور ہو کر اختیار کی تھی اس کو بدل دیا جائے اور ہندو اور مسلمان اکثریت اور اقلیت دونوں مل کر انگریزی

اقلیت کے استبداد کا خاتمہ کرے۔ حکام پرست مسلمان بے شک ہمارے ساتھ نہ تھے لیکن حکام پرست ہندو بھی مہاتما گاندھی کے ساتھ نہ تھے اور مسلمانوں نے اپنی سیاسی اہلیت اور استعداد سے ثابت کر دیا کہ ہندوستان کی قومی سیاست میں ان کا حصہ ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ رہے گا اور ان کی قربانیوں نے بھی ثابت کر دیا کہ قوم پروری میں وہ ہندوؤں سے کم نہیں کچھ زیادہ ہی ہیں۔ لیکن جب ہم مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو اور دیش بندھو داس جیل خانوں میں بھر دیئے گئے تب مالوی جی جیسے ہندو سبھائی اور حکومت پرست رہے اور انھوں نے مسلمانوں کی اور مہاتما جی کی ساکھوں کو ملک میں بگاڑنا شروع کیا اور حکومت پرست مسلمانوں کو بھی جو خلافت کی تحریک کے خلاف تھے اور جو مسلمانوں میں اپنی لیڈری اسی طرح خلافت والوں کی بدولت کھو چکے تھے جس طرح مالوی جی اپنی لیڈری مہاتما جی کی بدولت کھو چکے تھے، اب موقع مل گیا کہ وہ ہم خلافت والوں کی ساکھ کو بھی بگاڑ دیں۔ وہ مخصوص ملی حلقہ ہائے انتخاب جنھوں نے نہ سنہ ۱۹۱۰ء میں نہ سنہ ۱۹۲۰ء میں ہندو مسلمانوں کو لڑایا تھا اور جن پر یہ الزام کہ وہ ہندو مسلم کشیدگی کا باعث ہوتے ہیں سراسر بہتان اور جھوٹ ہے۔ اب البتہ ہندو سبھا اور حکومت پرست مسلمانوں کی پیدا کردہ کشیدگی کو بڑھانے میں ضرور کامیاب ہوتے۔ ہر کونسل کے امیدوار کا اب فرض ہو گیا کہ اگر وہ ہندو ہو تو کہے کہ میں گاندھی کی طرح مسلمانوں کے غیر واجبی مطالبات کو منظور کرنے والا اور مسلمانوں کی خلافت اور ان کے مقدس مقامات کے احترام کے لئے انگریزی حکومت سے بگاڑ کرنے والا نہیں ہوں میں مسلمانوں کی شدھی کروں گا اور ہندوؤں کا ان کے خلاف سنگھٹن کروں گا۔ مجھے کونسل کے لئے منتخب کرو اور مجھے اپنا لیڈر بناؤ اور چاہے "مہاتما گاندھی کی جے" اب بھی بولو لیکن ووٹ مالوی جی ہی کو دو اور

اگر وہ مسلمان ہے تو کہے کہ میں علی برادران اور خلافت والوں کی طرح گاندھی پرست نہیں ہوں اور ہندو راج قائم کرانے کے لئے انگریزی حکومت سے بگاڑ کرنے والا نہیں ہوں۔ خلافت والے چندہ کھا جاتے ہیں۔ دیکھو چھوٹانی سیٹھ سوا سولہ لاکھ اپنے کاروبار میں لگا بیٹھے اور علی برادران کی بے ایمانی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ یہ ہندوؤں میں تبلیغ نہیں کرتے، ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی تنظیم نہیں کرتے اور گو نہ خود تبلیغ کے لئے چندہ دیا، نہ ایک محلے ہی کی تنظیم کی مگر گلا پھاڑ پھاڑ کر پکارنا شروع کیا کہ مجھے کونسل کے لئے منتخب کرو اور مجھے اپنا لیڈر بناؤ اور خلافت والوں کو ہرگز چندہ نہ دو چاہے کسی اور اسلامی جمعیت یا مدرسے کو بھی کچھ نہ دو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاتما گاندھی تو ہندوؤں کو ہندو سبھا کے ہاتھ میں چھوڑ کے بیٹھ گئے اور صرف "چرخہ سنگھ" کی نہایت ضروری تنظیم کو ہاتھ میں لیا، گو ہندو جاتی کی رہنمائی اس سے کہیں زیادہ ان کی توجہ کی مستحق تھی مگر ہم مسلمانوں کو غلط "تنظیم" سے بچا کر صحیح تنظیم کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ہی کرتے رہے اور مہاتما گاندھی ہندوؤں میں جتنے غیر ہردل عزیز نہ ہوئے تھے اتنے ہم مسلمانوں میں غیر ہردل عزیز ہو گئے۔

باوجودیکہ ہم نہیں کہتے کہ آج بھی مسلمان ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کی طرح ہندو اکثریت کے شریک و سہیم رہیں اور اپنے حقوق ملی کے تحفظ کے لئے نہ گھبرائیں، پہلے ہندوؤں کے ساتھ مل کر سوراج حاصل کرلیں۔ جب سوراج مل جائے گا تو مہاتما گاندھی کے تبیع ہندو خود ان کا واجبی حصہ ان کو دیدیں گے اس لئے کہ آج ہندو سبھائی سوراج چاہتے ہی نہیں، ہندو راج کی تمنا میں انگریزی راج پر قانع ہیں اور مہاتما جی کے متبعین نہیں بلکہ مالوی جی اور لالہ لاجپت رائے جیسے متعصب اور تنگ دل تنگ نظروں کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں اور سناتن دھرمی بھی آریہ سماجیوں کی طرح مسلمانوں کی دل آزاری اور حق تلفی پر تلے بیٹھے ہیں لیکن

حکومت پرست مسلمان ہیں آج بھی ہندو پرست کہہ کر ہماری ملت کو ہم سے جدا رکھنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ جس طرح ہم مسلمانوں کی اقلیت کو ہندوؤں کی اکثریت کے رحم پر چھوڑنے کے روادار نہیں ہیں اسی طرح ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ وہ اس حکومت ہی پر بھروسہ کئے رہیں جو جب چاہتی ہے ان کی حق تلفی کر دیتی ہے یا انھیں ہندوؤں سے لڑا دیتی ہے جیسے ایک سال ہوئے دہلی میں پہاڑی دھیرج پر کی تھی اور اب بھی پانی پت میں کر رہی ہے اور ابھی پونا، بلیا اور اندور میں کر چکی ہے اور جس نے آج تک صوبہ سرحدی اور بلوچستان میں اصلاحات جاری نہیں کیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ مسلمان ہندو کی ناانصاف اکثریت کے خلاف سرکاری رائیں کبھی کبھی حاصل کرنے کی امید پر ہمیشہ ان کے استبداد کی تائید میں کونسلوں میں ووٹ دیا کریں۔ اس لئے نہ تو یہ سودا ایسا ہے کہ "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے"۔ نہ قیمت ہی مناسب ہے۔ حقیقتاً ایسا سودا کرنا مسلمانوں کے لئے حرام ہے اور ان کو نہ اب اس کی ضرورت ہے کہ نہ تو وہ ہندو اکثریت ہی کے رحم پر اپنے تئیں چھوڑیں نہ انگریزی عمال حکومت اور ان کے نامزد کردگان کی گھٹنے والی اقلیت ہی کے رحم پر بلکہ وہ ایک ایسی تدبیر سوچ کر نکالیں کہ انگریزوں کی اقلیت کی کمک اور امداد پر بھی ان کا دارومدار نہ رہے اور اگر کہیں ہندو کی اکثریت کے انصاف اور رواداری پر ان کا دارومدار رہے تو کہیں مسلمانوں کی اکثریت کے انصاف اور رواداری پر بھی ہندو کا دارومدار رہے اور بعض اہم امور کا فیصلہ کسی کی اکثریت پر بھی نہ چھوڑا جائے اور جو حقوق آج اقلیتوں کو حاصل ہیں انھیں اکثریتیں سلب کرنے کی مجاز نہ ہوں۔ آج مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے موافق اور مخصوص ملی حلقہ ہائے انتخاب کے مخالف نہیں ہیں بلکہ ۱۹۲۶ء سے ہندو سبھا نے اور اسی طرح مسلمانوں کی حکومت پرست جماعت نے ہندوستانیوں کی

۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کی ذہنیت کو بالکل بدل کر غیر مسلم حلقہ ہائے انتخاب کے کامیاب ہندو امیدواروں کی جو ذہنیت پیدا کر دی ہے اس کو دیکھتے ہوئے اور نیز ان امور پر غور کرتے ہوئے کہ آج تقریباً ہر مجلس قانون ساز میں اسی ذہنیت والے ہندوؤں کی کثرت رائے ہے اور ہر امر کا فیصلہ کثرت رائے سے ہوتا ہے اور اگر ۱۹۲۹ء کے کمیشن نے اصلاحات میں توسیع کی سفارش کی تو وہ سفارش غالباً یہی ہوگی کہ انگریزی عمال حکومت اور ان کے نامزد کردگان کی تعداد گھٹ جائے اور انتخاب شدہ ہندوستانیوں کی تعداد بڑھائی جائے اور حکومت کے اختیارات کم کیے جائیں اور ان مجالس قانون ساز کے اختیارات زیادہ کیے جائیں جن میں متعصب، تنگ دل، تنگ نظر ہندوؤں کی اکثریت ہے اور مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ اس لئے اگر اصلاحات میں توسیع ہوئی تو مسلمانوں کی اقلیت اور بھی ایسی ذہنیت والے ہنود کی کثرت رائے کے رحم پر چھوڑ دی جائے گی۔ ہم مجبور ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کی اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے کوئی تدبیر اس تدبیر سے زیادہ کارگر نکالیں جس سے تیسرے دور کا آغاز "لکھنؤ پیکٹ" کے ذریعے سے ہوا تھا اور جو اس وقت بھی آخری دور نہیں سمجھا گیا تھا نہ آج آخری دور سمجھا گیا ہے۔

۲۰ مارچ کو گھنٹوں سوچنے کے بعد الحمدللہ ہمیں ایسی تدبیر سوجھ گئی جس سے مسلمانوں کی اقلیت کے حقوق کا پہلے سے بہتر تحفظ ہو سکتا ہے جس پر کوئی سچا قوم پرور ہندو بھی اعتراض نہیں کر سکتا جس کے بعد انگریزی عمال حکومت کے استبداد کو ہم مسلمانوں کی اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے ان کی کمک اور امداد حاصل کرنے کی قیمت کے طور پر کمک اور امداد پہنچانا بھی نہیں پڑتی۔ یہ تدبیر کسی ایک شخص کے ذہن کی آفریدہ نہیں ہے بلکہ متفرق اشخاص کے ذہنوں کی رہین منت

ہے۔ یہ خلافت اور کانگریس والوں کی ایجاد کردہ نہیں ہے کہ مسلم لیگ والوں پر
اس کی مخالفت فرض ہو۔ یہ صوبہ جات متحدہ کے باشندوں کی ایجاد کردہ بھی نہیں
ہے کہ پنجاب والوں پر اس کی موافقت حرام ہو۔ اس کے تین اجزا ہیں؛ ایک یہ کہ
ہر ملت کی مذہبی فرائض کی ادائگی اور اس کی مذہبی آزادی اور اس کے مذہبی حقوق
عام اتفاق سے نہ کہ صرف ایک ملت کی کثرت رائے سے طے کرا کے محفوظ کر دیئے
جائیں اور کوئی قانون ساز مجلس ایک ملت کی کثرت رائے سے نہ ان کو منسوخ کر سکے
نہ ان میں ترمیم کر سکے۔ دوسرا جزو یہ ہے کہ سب امور ایک ملت کی کثرت رائے سے
طے نہ پایا کریں۔ اگر ایک اقلیت کی بڑی اکثریت بھی کسی مسودہ قانون یا تحریک کے
خلاف ہو اور ظاہر کرے کہ اس کی ملت کا اس سے نقصان ہوگا تو وہ اکثریت حاصل
ہونے کے بعد بھی منظور نہ ہو سکے اور تیسرا اور آخری جزو یہ ہے کہ اگر ہندو چاہتے ہیں
کہ ہماری چھوٹی سی اقلیت چند بڑے بڑے صوبوں میں ان کی بڑی اکثریت کے رحم
پر چھوڑ دی جائے تو وہ بھی اس پر راضی ہو جائیں کہ دو بڑے بڑے صوبوں میں
ان کی بڑی اقلیت بھی ہماری چھوٹی سی اکثریت کے اور تین چھوٹے چھوٹے سے
صوبوں میں ان کی چھوٹی سی اقلیت ہماری بڑی اکثریت کے رحم پر چھوڑ دی جائے۔
اگر ان کی اکثریت ہماری اقلیت کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کرے گی
تو ہماری اکثریت بھی ان کی اقلیت کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرے گی یعنی "جو
تم ہم سے سیدھم سادھم سودھم تو ہم بھی تم سے سیدھم سادھم اور سودھم اور جو تم ہم سے
ٹیکرڈ، ٹاکرڈ، ٹونکرڈ تو ہم بھی تم سے ......" تم تو آج تک مسلم اقلیت کے حقوق
کے تحفظ کے لئے مراعات کو حرام کہتے رہے ہو۔

مگر جب صوبہ سرحدی کو جس مختصر سے صوبے میں مسلمانوں کی اتنی ہی بڑی
اکثریت ہے جتنی مدراس کے بڑے صوبے میں تمہاری اور اس سے کم ہے جو

ڈاکٹر مونجے صدر ہندو سبھا کے صوبے میں تمھاری ہے۔ جب انتخاب اور اختیارات دینے
کا سوال درپیش ہوا تو اس خوف سے کہ اب انھیں مراعات تم کو بھی طلب کرنا پڑیگا
بلکہ تمھاری بھوک ہم سے بھی زیادہ ثابت ہوگی۔ تم نے یہ صریح ناانصافی کی کہ اس
صوبے میں توسیع اصلاحات کی سخت مخالفت کی اور اسی پر راضی ہو سکتے تھے کہ
اس صوبے کو پنجاب میں پھر ملحق کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کی وہ اکثریت تقریباً نابود
ہو جائے۔ خیر اب ہم صوبہ سرحدی اور بلوچستان کے لیے اصلاحات کے طالب ہیں اور
صوبہ سندھ کو کانگریس کے اجتماع میں جس میں یاد رہے کہ تمھاری ہی اکثریت ہے تم کو
ہماری بمبئی سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد اگر تمھیں اپنی اقلیت کے لیے
مراعات درکار ہوں جن کو تم ہماری اقلیت کے لیے حرام بتلاتے ہو تو ہم انھیں
حرام کہہ کر نامنظور نہ کریں گے بلکہ ہم تمھارے مطالبات کی تائید کریں گے اور
بالکل وہی مراعات اور صوبوں کی مسلم اقلیت کے لیے بھی لے لیں گے۔ اگر تمھارے
نزدیک وہ اب بھی حرام رہیں گی تو خیر ہم بھی ان کے لیے اصرار نہ کریں گے۔
کہاں ہے تمھاری قوم پروری؟ اور کہاں ہے تمھاری انگریزی استبداد کی مخالفت
کا دعویٰ؟ آؤ ان کا ثبوت دو۔ اب تک تم نے بارِ ثبوت ہمیں پر ڈال رکھا ہے۔
لیکن خدا نے ہمیں شمع ہدایت دکھادی اور ہم نے ۲۰ مارچ کو ایک تجویز حاضرین کے
کامل اتفاق رائے سے پیش کر دی۔ اب بارِ ثبوت تم پر ہے۔ دیکھیں تم قوم پرور
ثابت ہوئے یا اس پُر تفریق و انتشار کی ذہنیت والے جو دنیا بھر میں انوکھی،
ساری دنیا سے نرالی تمھاری چھوت چھات سے ظاہر ہوتی رہی ہے اور جس کا
نمونہ ہر اسٹیشن پر ریل گاڑی رکتے ہی یہ عجیب صدائے بے ہنگام ہوتی ہے کہ
"ہندو چائے"۔ دہلی میں ہندو سبھا کے روح رواں پنڈت مدن موہن مالوی کی
صدارت میں تمھارے خواص کا جلسہ ہوا اور ہمارے سوال کا کوئی جواب نہ

دے سکا۔ اب پٹنے میں تمہارے عوام کا جلسہ تمہارے چھ لاکھ کے کنبہ کے میلے کے بعد ہوتا ہے اور بہ ظاہر آج بھی تم سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا اور تمہارے سب سے زیادہ دریدہ دہن رہنما ڈنڈا گھمانے والے ڈاکٹر موبجے ایک صدارتی ایڈریس شائع کرتے ہیں اور پھر اسے رد کر کے ایک دوسرا زبانی دیتے ہیں۔ کیا یہ بھی ہمارے اس فیصلہ کا نتیجہ نہیں ہے جو ۲۰ مارچ کو راے سینا میں ہوا؟ انشاء اللہ کل میں آپ کے "فیصلہ" پر تبصرہ کروں گا اور آپ کی "قوم پروری" کا بھانڈا پھوڑوں گا۔ ابھی انتظار کیجیے۔

(۳) مسلم اقلیت کی کافی اور موثر حفاظت کی تدابیر

ہمدرد ۲۰ر اپریل ۱۹۲۶ء

کل کے "ہمدرد" میں گو مقالۂ افتتاحیہ کی سرخی یہی تھی جو آج ہے، میں نے ہندو مہا سبھا کے اجلاس منعقدہ پٹنہ اور ڈاکٹر مونجے کے خطبۂ صدارت کے متعلق ایک دو کالم سے کسی قدر زیادہ ہی کے مضمون میں برادران وطن کو خطاب کر کے صرف اسی قدر لکھا تھا کہ "دہلی میں ہندو سبھا کے روح رواں پنڈت مدن موہن مالوی کی صدارت میں تمہارے خواص کا جلسہ ہوا اور ہمارے سوال کا کوئی جواب نہ بن سکا۔ اب پٹنہ میں تمہارے عوام کا جلسہ تمہارے ۷۰ لاکھ کے کنبھ کے میلے کے بعد ہوتا ہے اور بظاہر آج بھی تم سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا اور تمہارے سب سے زیادہ دریدہ دہن رہنما ڈنڈا گھمانے والے ڈاکٹر مونجے ایک صدارتی ایڈریس شائع کرتے ہیں اور پھر اسے رد کر کے ایک دوسرا زبانی دیتے ہیں۔ کیا یہی ہمارے اس فیصلہ کا نتیجہ نہیں ہے جو ۲۰ر مارچ کو رائے سینا میں ہوا؟ انشاء اللہ کل میں آپ کے فیصلہ پر تبصرہ کروں گا اور آپ کی قوم پروری کا بھانڈا پھوڑوں گا۔ ابھی انتظار کیجئے۔"

انشاء اللہ میں آج ثابت کر دوں گا کہ ہمارے ۲۰ر مارچ کے فیصلے نے جو سوال پنڈت مدن موہن مالوی، لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر مونجے اور اسی طرح کے ہندو سبھائی نام نہاد "قوم پرور" ہندو نیتاؤں سے کیا تھا۔ وہ اس قدر سکت تھا کہ تقریباً ایک مہینہ ہو گیا مگر آج تک کسی سے بھی اس کا جواب بن نہ آیا۔ پٹنے کی ہندو مہا سبھا تمام ایسی کانفرنسوں کی طرح متعدد رزولیوشن پاس کرے گی مگر حقیقتاً سارے ملک کی اور اس ملک کی سیاست سے تعلق رکھنے والوں میں سے

ہر ایک کی نگاہ اس بحث و مباحثہ اور فیصلہ پر لگی ہوئی ہے جو ہمارے مارچ والے فیصلے کا جواب ہو گا اور سندھ جاتی کی "قوم پروری" کی آج اس قدر سخت آزمائش ہے کہ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں آج تک کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ خود ہمارے ہم مذہب بھائی چند دن بھی صبر نہ کر سکے اور باوجودیکہ "ہمدرد" میں تین طول طویل مضامین ہمارے ۲۰ مارچ کے فیصلے پر نکل چکے تھے اور پوری وضاحت وصراحت سے اس اہم ترین فیصلہ کی حقیقت سے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔

اب تک بعض مسلم حلقوں میں اس کی مخالفت کی گئی یا سخت بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا اور ان حضرات اور ان اخبارات سے اتنا نہ ہو سکا کہ ذرا انتظار کرتے اور دیکھتے کہ سندھ جاتی اس فیصلہ کا کیا جواب دیتی ہے۔ اس لئے سندھ بھائیوں کی "قوم پروری" کا بھانڈا پھوڑتے وقت میں مجبور ہو گیا کہ پہلے ان بھائیوں پر ایک بار اور واضح کر دوں کہ حقیقتاً وہ عقدہ کیا ہے جس کا حل کرنا ہمارا فرض تھا اور بالآخر ہم نے ایک حیرت انگیز اتفاق کے ساتھ لسے اس طرح حل کیا کہ صبح کے ۹، ۱۰ بجے سے لے کر تقریباً ساڑھے چھ بجے تک میں کل کا مضمون لکھتا رہا اور اس تک کو گوارا کیا کہ چند سمتوں کی ڈاک نکل جائے مگر مضمون ایک ہی پرچے میں نکل جائے تاکہ قارئین کرام پورا مضمون ایک ہی نشست میں پڑھ لیں اور یہ نہ ہو کہ کوئی ایک پرچے میں ایک ہی حصہ پڑھے کوئی دوسرے پرچے میں دوسرا ہی حصہ پڑھے۔ آج میری اپنے ہم پیشہ حضرات سے استدعا ہے کہ وہ اپنے اخبارات میں میرے کل کے مضمون کو اور آج کے مضمون کو بھی نقل کر دیں اور خواہ انھیں مجھ سے اتفاق ہو یا اختلاف ایک بار اس تمام بحث پر اچھی طرح غور فرما کر وہ اپنی رائے کا بھی اظہار فرما دیں۔ وہ اگر ان مضامین کا مطالعہ فرمائیں گے تو اچھی طرح سمجھ جائیں گے کہ ہمارا فیصلہ کس قدر اہم اور "لاجواب" ہے اور ہمارے

ہندو سبھائی نیتاؤں کو اس نے کس طرح ساکت کر دیا ہے۔ حقیقتاً ہمارے بعض مسلمان بھائیوں سے کہیں زیادہ یہ ہندو سبھائی ہمارے فیصلے کی حقیقت کو سمجھے ہیں اور ان کا سکوت ہمارے مسلمان بھائیوں کے اظہار اختلاف سے کہیں زیادہ آج اس فیصلے کی قدر افزائی کر رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کہیں ان کے اظہار اختلاف سے یہ ہندو سبھائی "قوم پرور" فائدہ اٹھائیں اور کہہ دیں کہ ابھی اس پر غور کرنے اور اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ خود مسلمان بھی اس سے متفق نہیں ہیں۔

کئی بار لکھ چکا ہوں اور اب پھر لکھتا ہوں کہ وہ عقدہ جسے ہمیں حل کرنا ہے یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی قومی نمائندگی کا بہترین طریقہ مخصوص ملی حلقہ ہائے انتخاب کا قیام ہے یا مخلوط اور عام ملکی حلقہ ہائے انتخاب بلکہ حقیقی عقدہ یہ ہے کہ مسلمانان ہند اقلیت میں ہیں ہندو اکثریت میں، ان کی ذہنیت آج پہلے سے کہیں زیادہ قزاقانہ اور مخاصمانہ ہے۔ مجلس قانون ساز کے تمام فیصلے اکثریت ہی کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔ اس حالت میں مسلم اقلیت کے حقوق کا تحفظ کیوں کر ہو؟ میں نے اس مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کی تمام تدابیر کی تاریخ کل "ہمدرد" میں دے دی اور بتا دیا کہ پہلا دور کانگریس کے آغاز سے شروع ہو کر مسلم لیگ کے آغاز تک تقریباً بیس برس رہا جس میں یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ مسلمان سیاست میں حصہ نہ لیں کانگریس میں شریک نہ ہوں، اپنی تمامتر توجہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کر دیں اور انگریزی عمال الحکومت پر بھروسہ کریں۔ انھیں کو سیاسی اختیارات حاصل ہیں وہی مسلم اقلیت کے حقوق کا تحفظ کریں گے۔ یہ دور اول سر سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی پالیسی کے اتباع کا تھا۔ ۱۸۸۵ء سے لے کر ۱۹۰۶ء تک رہا۔ دوسرا دور شملہ کے وفد اور مسلم لیگ کے آغاز سے شروع ہوا اور یہ دیکھ کر کہ لبرل وزیر ہند لارڈ مارلے اپنی پارٹی کی عظیم الشان فتح پر ہندوستانیوں کو سیاسی حقوق دینے والے ہیں۔ خود انگریز

عمال حکومت نے بھی مسلمانوں کو آگاہ کر دیا کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے کوشاں ہوں اور مسلمان بھی تیس برس تک سر سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمی پالیسی سے مستفید ہو کر اب سیاست میں شرکت کی اہلیت اور استعداد پیدا کر چکے تھے۔ انھوں نے بھی سمجھ لیا کہ اب ان کے حقوق کے تحفظ کا دوسرا دور شروع ہونا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے ملت کی نمائندگی بحیثیت ایک ملت کے نہ بحیثیت چند افراد ملک کے طلب کی اور جب اختیارات کسی حد تک ہندوستانی اکثریت کو ملنے والے تھے اور ان کی اقلیت اس حد تک ہندو اکثریت کے رحم پر چھوڑی جانے والی تھی۔ انھوں نے اپنی اقلیت کی نمائندگی میں اضافے کا بھی مطالبہ کیا اور اپنی آبادی کے اعداد کے تناسب کے علاوہ اپنی "سیاسی اہمیت" کے لحاظ رکھے جانے کی بھی درخواست کی اور یہ دونوں مطالبات ایک ایسے انگریزی مدبر نے منظور کئے جو خود آزاد خیال ہی نہ تھا بلکہ کسی قدر ہمارے مذہب اور ہماری ملت کے خلاف بھی تھا۔

سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا اور بالآخر سنہ ۱۹۱۰ء میں مارلے منٹو اصلاحات میں ہماری اقلیت کے حقوق کے تحفظ کا یہ طریقہ طے پایا کہ (۱) ہم مخلوط اور عام حلقہ ہائے انتخاب میں حصہ لے کر چند نشستیں ان صوبوں میں جیتیں جہاں ہماری اکثریت آبادی تھی یا ان جماعتوں میں جن کے نمائندے ایک انتخاب میں ہندوؤں میں سے چنے جانے والے تھے اور دوسرے انتخاب میں مسلمانوں میں سے (۲)، لیکن زیادہ تر نشستیں ہمارے لئے اس طرح مقرر کر دی گئیں کہ خالص مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب سے انھیں پر کرایا گیا اور (۳) نمائندگی ہماری آبادی کے اعداد کے تناسب سے زیادہ رکھی گئی۔ تیسرا دور انتخاب ان کے دس برس بعد آیا اور دوران جنگ میں ۱۹ ہندو مسلم اراکین امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے مطالبے پر مسٹر مانٹیگو نے ہندوستان کو آگے چل کر اور بہ تدریج ذمہ دار حکومت

سپرد کرنے کا اگست ۱۹۱۷ء میں اعلان کیا اور لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اتفاق سے جو "پیکٹ" منظور ہوا تھا تقریباً اس کی تمام تفصیلات کو قبول کر کے ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کر دیا گیا اور ۱۹۲۰ء میں ان کے مطابق انتخابات ہوئے۔ اس تیسرے دور میں (۱) مسلمان مخلوط اور عام ملکی حلقہ ہائے انتخاب سے خارج کر دیے گئے اور وہ "غیر مسلم" قرار پائے اور اس طرح ہندو اکثریت کے ہاتھ آ گئے۔ (۲) مسلمانوں کی تمام کششیں خالص مسلم حلقہ ہائے انتخاب سے ٹکرائی جانے لگیں۔ (۳) ان دو صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی میں تھوڑی سی اکثریت تھی مسلم نمائندگی آبادی کے اعداد کے تناسب سے کم کر دی گئی اور بنگال میں تو مسلم نمائندوں کی صاف اور صریح اقلیت ہو گئی اور پنجاب میں برائے نام ۵۰ فی صدی نمائندگی مسلمانوں کو دی گئی گو درحقیقت وہ اس سے کم ہے۔
(۴) باقی صوبوں میں مسلم اقلیت کی نمائندگی مسلم آبادی کے اعداد کے تناسب سے زیادہ کر دی گئی مگر مسلم اقلیت ہر صوبے میں اقلیت ہی رہی اور پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت بھی اقلیت بنا دی گئی۔ میں نے کل عرض کیا تھا کہ میں اس کا ہرگز قائل نہیں ہوں کہ ۱۹۱۰ء کی اصلاحات کے بعد یا ۱۹۲۰ء کی اصلاحات کے بعد مسلم حلقہ ہائے انتخاب ہندو مسلم کشیدگی کا سبب بنے بلکہ میں نے ظاہر کیا تھا کہ ہندو مسلم نمائندے جو عام ملکی اور خاص مسلم حلقہ ہائے انتخاب سے یا "غیر مسلم" اور مسلم حلقہ ہائے انتخاب سے منتخب ہو کر مجالس قانون ساز میں داخل ہوئے تھے اکثر حکومت کے استبداد کے خلاف دوش بدوش لڑے تھے مگر جس طرح ہنود میں بھی بہت سے حکومت پرست تھے اسی طرح مسلمانوں میں بھی تھے اور جس طرح نہ سب ہندو ممبر قوم پرور تھے اسی طرح نہ سب مسلمان قوم پرور تھے۔ ۱۹۲۳ء تک ان غیر مخلوط حلقہ ہائے انتخاب سے ہندو مسلم تعلقات کو ہرگز نہیں بگاڑا۔ البتہ جب

ہم لوگ اور مہاتما گاندھی اور کانگریس کے اور بڑے بڑے ہندو لیڈر قید کر دیے گئے
اور مالوی جی اور سوامی شردھانند اور حکومت پرست ہندو مسلمان مخالفینِ کانگریس
و جمعیت خلافت کے باعث ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی اور بڑھتے
بڑھتے آج اس درجے تک پہنچ گئی ہے الامان والحفیظ۔ اب البتہ غیر مخلوط حلقہ ہائے
انتخاب اس کشیدگی کو ضرور بڑھا رہے ہیں اور اب اکثر ہندو اور مسلم امیدواران انتخاب
رائے دہندگان سے یہی کہہ کر اپنے لیے رائے طلب کرتے ہیں کہ ہم تمہاری ملت کے
مخالفین کو کونسل میں جا کر نیچا دکھائیں گے اور جو تقریریں اور تحریریں حال ہی کے
انتخاب میں ان امیدواروں کی زبان و قلم سے نکلیں انھوں نے یقیناً ہندو مسلم تعلقات
کو بد سے بدتر بنا دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب ہندوؤں کی ذہنیت اس طرح بگڑ گئی ہو تو وہ
مسلمان سوراجی کونسلوں میں جا کر کیا کر سکیں گے جو ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کا بیڑا
اٹھا کر چلے تھے جبکہ ہر صوبے کی کونسل میں اور نیز اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ میں
اقلیت مسلمانوں کی ہے اور اکثریت ہنود کی اور فیصلہ اکثریت سے ہوا کرتا ہے؟ کیا ہنود
کی اکثریت پر ایسی حالت میں اعتماد کیا جائے؟ افسوس ہے کہ جو جواب میں سنہ ۱۹۲۰ء
اور سنہ ۱۹۲۱ء میں دے سکتا تھا جبکہ ہنود، مالوی جی اور ہندو مہا سبھا کو چھوڑ کر مہاتما گاندھی اور
کانگریس سے جا ملے تھے وہ میں آج نہیں دے سکتا جبکہ مہاتما جی گوشہ نشین ہیں اور
نہ ہنود پر پہلا سا اثر رکھتے ہیں اور نہ ان کی بدلی ہوئی ذہنیت پر ان کو اس طرح ملامت
کرتے ہیں جس طرح ہم مسلمانوں کو ان کی بدلی ہوئی ذہنیت پر قید سے چھوٹنے کے
وقت سے برابر آج تک ملامت کرتے رہے ہیں۔ اور آج اکثر ہندو کانگریس، مہاتما جی،
یا سوراجی لیڈروں کے متبع نہیں ہیں بلکہ ہندو سبھا اور مالوی جی، لالہ لاجپت رائے،
ڈاکٹر مونجے، مسٹر جینت کیلکر اور مسٹر جیت گھامکے کے متبع ہیں اور سناتن دھرمی بھی آریہ سماج

کی طرح مذہبی تعصبات اور سیاسی تنگ نظری کا شکار ہو رہے ہیں پھر کیا انگریزی عمال حکومت اور ان کے نامزدگان پر اعتماد کیا جائے؟ یہ بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اول تو ہر کونسل میں ان کی تعداد اتنی نہیں کہ مسلم اقلیت اور یہ اقلیت مل کر بھی ہندو اکثریت کو شکست دے سکے دوسرے جو قیمت یہ اقلیت ہماری ملی اقلیت کو کبھی کبھی کمک پہنچانے کی مانگتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلم اقلیت انگریزی عمال حکومت کے استبداد کی موافقت ہی میں ہمیشہ رائے دیا کرے اور یہ ہمارے لئے قطعاً حرام ہے۔ اگر یہ قیمت ایسی گراں اور حرام نہ بھی ہوتی تب بھی مشکل یہ ہے کہ یہ اقلیت ۱۹۲۹ء کے کمیشن کی رپورٹ پر غالباً بڑھنے والی نہیں بلکہ گھٹنے والی ہے اور خود ہمیں اسے گھٹوانا چاہیئے۔ پھر اگر ہم نے اس کی غلامی کی، تب بھی یہ ہمیں ہندو اکثریت کے تعصب اور اس کی تنگ دلی اور تنگ نظری سے نہ بچا سکے گی۔

قارئین کرام معاف کیجئے کہ میں نے پھر کل ہی کا مضمون دہرایا ہے۔ مگر کیا کروں چاہتا ہوں کہ ایک بار آپ ہماری حقیقی مشکل سے آگاہ ہو جائیں۔ پھر اگر آپ ہمارے اس فیصلے کو منظور نہ بھی کریں جسے ہم نے اپنے ملی عقیدے کا بہترین حل سمجھا ہے تب بھی یہ تو نہ ہو گا کہ آپ دھوکے میں گرفتار رہیں اور سمجھتے رہیں کہ غیر مخلوط اور مسلم حلقہ ہائے انتخاب اگر قائم رہے تو بیڑا پار ہے۔ ہمیں کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔

موجودہ صورت حالات کی اصلاح کے لئے ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ کے جلسہ منعقدہ لاہور میں چند تجاویز پیش کی گئی تھیں اور جو تجاویز لاہور میں منظور ہوئی تھیں وہی علی گڑھ کے جلسے میں ۱۹۲۵ء میں منظور ہوئیں اور غالباً وہی دہلی کے جلسے میں ۱۹۲۶ء میں منظور ہوئیں اور جہاں تک میرا خیال ہے وہی راجہ غضنفر علی صاحب نے مسٹر بی۔ داس کی تحریک دربارہ قومی مطالبے کی ترمیم کے طور پر اسمبلی میں

پیش کرنے کی اطلاع دے دی جس کے بعد تحریک واپس لے لی گئی۔ وہ تجاویز کیا تھیں؟ وہ یہ تھیں کہ (۱) جب تک مسلمان خود راضی نہ ہوں ان کی نمائندگی خالص مسلم حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعے سے ہوا کرے۔ (۲) پنجاب اور بنگال میں آبادی کے اعداد میں ان کی اکثریت ہے۔ ان صوبوں میں نمائندگی میں ان کا تناسب ایسا رکھ دیا جائے کہ ان کی اکثریت نہ اقلیت ہو جائے نہ مساوات یعنی ۵۰ فی صدی نمائندگی رکھ دی جائے۔ (۳) جن صوبوں میں آبادی کے اعداد میں ان کی اقلیت ہے وہاں ان کی کافی اور موثر طریقے پر حفاظت کی جائے جس کے غالباً یہی معنی تھے کہ جو اضافہ ان کی نمائندگی میں "لکھنؤ پیکٹ" میں کر دیا گیا ہے وہی قائم رکھا جائے۔ (۴) ہندوستان کی کبھی دوبارہ اس انداز سے تقسیم نہ کی جائے کہ جن صوبوں میں ان کی آبادی کے اعداد میں اکثریت ہے یعنی پنجاب، بنگال اور صوبہ سرحدی، ان میں وہ اکثریت باقی رہے۔ (۵) اگر تین چوتھائی مسلمان ممبر کسی مسودۂ قانون یا تحریک کی اس بنا پر مخالفت کریں کہ یہ ہماری ملت کے لئے مضر ہے تو اس کو منظور نہ کیا جائے۔ ان تجاویز سے مسلم اقلیت کے حقوق کا ہرگز تحفظ نہیں ہوتا اس لئے کہ پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت تک کو گھٹا کر ۵۰ فی صدی کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا گیا ہے حالانکہ ۵۵ فی صدی اکثریت جو آبادی کے اعداد میں مسلمانوں کو ان دو صوبوں میں حاصل ہے وہ خود اسی قدر کم ہے کہ نہیں کی برابر ہے بالخصوص جب کہ خود پنجابی مسلمان کہتے ہیں کہ ہم ہندو بقالوں اور وکیلوں کے پنجے میں گرفتار ہیں اور بنگال میں تو مسلمانوں کا افلاس اور ان کا جہل ان کو اور بھی کمزور کئے ہوئے ہیں۔ رہے وہ صوبجات جن میں آبادی کے اعداد میں ان کی اقلیت ہے تو وہاں ان کی ۵ فی صدی یا ۰ فی صدی آبادی کو اگر ۱۵ فی صدی، اور ۱۲ فی صدی آبادی کو ۲۵ فی صدی، اور ۱۵ یا ۲۰ فی صدی آبادی کو ۳۰ فی صدی

نمائندگی دے بھی دی گئی تو جس حالت میں کہ تمام امور کے فیصلے اکثریت ہی کے مطابق
ہوا کریں گے موجودہ ذہنیت کے ہندو اکثریت کے مقابلے میں وہ شکست فاش
کھانے اور مغلوب ہونے سے کس طرح بچ سکے گی؟ آب جو از سرگذشت چہ
یک نیزہ وچہ یک دست۔ یہ "حفاظت" نہ "کافی" ہوگی نہ "موثر"۔ ضرورت اس
کی ہے کہ یا تو اقلیت کو اکثریت کر دیا جائے یا فیصلے اکثریت کے مطابق نہ ہوا کریں۔
(یاد رکھو کہ انگریزی عمال حکومت نے اپنے حقوق کا تحفظ اسی طرح کیا تھا۔)

پہلے دور میں انھوں نے چند ہندوستانیوں کو کونسلوں میں شریک کر لیا تھا
مگر اکثریت اپنی ہی رکھی تھی، حالانکہ ہندوستان کی کروڑہا کی آبادی میں ان کی ساری
ملت کی آبادی لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ پھر جب انھوں نے دوسرے دور
میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھائی تب بھی امپیریل کونسل میں اپنی ہی تعداد زیادہ
رکھی۔ ہندوستانیوں کی اکثریت اب بھی نمائندگی میں نہ ہوئی اور صوبے کی کونسلوں
میں گو اس کا خفیف سا امکان رکھا گیا کہ اکثریت ہندوستانیوں کو نصیب ہو جائے تب
بھی ان کے ایسے فیصلے جو حکومت کو ناپسند ہوں بالکل بے اثر رکھے گئے، اور تیسرے
دور میں جو ابھی جاری ہے ہم روز دیکھا کرتے ہیں کہ حکومت کو کونسلوں اور اسمبلی بلکہ
کونسل آف اسٹیٹ تک میں "شکست فاش" دی جاتی ہے مگر ہوتا ہواتا کچھ نہیں،
نہ فوجی مطالبات منظور ہوتے ہیں نہ بنگال کے ناکردہ گناہ قیدی آزاد کیے جاتے ہیں،
نہ نمک کا محصول ہی منسوخ ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ایک تحریک حکومت کی خدمت
میں ایک استدعا یا "سفارش" سے زیادہ نہیں اور کوئی مسودۂ قانون، خواہ ہر مجلس
قانون ساز میں منظور ہی کیوں نہ ہو جائے قانون نہیں بن سکتا جب تک کہ گورنر اور
گورنر جنرل بھی اسے منظور نہ کریں۔ رہیں وہ تحریکیں اور وہ مسودات قانون جنھیں عمال
حکومت منظور کرانا چاہیں اگر وہ کسی مجلس قانون ساز میں بھی منظور نہ ہوں تب بھی

غیر مخلوط اور خالص ملی مسلم اور غیر مسلم حلقہ ہائے انتخاب اس ذہنیت کو درست نہیں کر سکتے۔ البتہ اس کو اور بھی بگاڑ سکتے ہیں اگر ان کی جگہ عام ملکی اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قائم کئے گئے تو اکثریت تو یہ کر سکتی ہے کہ اگر چند نشستیں بھی اقلیت کی نمائندگی کے لئے مخصوص نہ کی جائیں تو اقلیت کی نمائندگی ہی نہ ہونے دے اور اگر چند نشستیں اقلیت کے لئے مخصوص کر دی جائیں تو ان کو اپنے کثیر التعداد ووٹوں کے ذریعے سے ایسے مسلمان امیدواروں سے پُر کر دے جو ان کے آوردے ہوں اور محض "بھس بھرے مسلمان" ہوں۔ ان کا نام مسلمانوں کا سا ہو اور کسی مسلمان کے گھر پیدا ہوئے ہوں مگر سیاست میں ہرگز مسلمان نہ ہوں اور ہندو اکثریت ہی کے مطیع و منقاد اور ہمیشہ اسی کے مقلد اور تبیع ہوں، خواہ اس سے مسلمانوں کی کتنی ہی صریح حق تلفی کیوں نہ ہوتی ہو لیکن اقلیت بھی اتنا تو کر سکتی ہے کہ جب دو ہندو امیدوار مقابلے میں آئیں (اور یہ تقریباً ناگزیر ہو گا) اپنی رائے اس ہندو امیدوار کو دے جو مسلمانوں کے ساتھ زیادہ منصفانہ طریقے پر سلوک کرتا رہا ہو اور زیادہ رواداری کا ثبوت دیتا رہا ہو۔

اگر ہندوؤں کی اکثریت صوبجات متوسط کی طرح ۹۵ فی صدی ہو اور مسلمانوں کی اقلیت ۵ فی صدی یا دونوں کا تناسب مدراس کی طرح ۹۳ فی صدی اور ۷ فی صدی ہو یا بہار اور اڑیسہ کی طرح ۸۷ فی صدی اور ۱۳ فیصدی یا صوبجات متحدہ کی طرح ۸۵ فیصدی اور ۱۵ فی صدی بھی ہو تو صاف ظاہر ہے کہ اسی تناسب سے ہندو اکثریت مسلمانوں کی نشستوں کے لئے امیدواروں کو کامیاب بنانے پر اثر ڈال سکتی ہے اور مسلمانوں کی اقلیت ہندوؤں کی نشستوں کے لئے امیدواروں کو کامیاب بنانے پر۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمان بہت ہی خفیف سا اثر ڈال سکیں گے اور ہندوؤں کا اثر ایک سیلاب کی طرح ہو گا جو مسلمان اقلیت کے ووٹوں کو بڑی آسانی سے بہائے جایا کرے گا۔ گو یہ امر یقینی ہے کہ مسلمانوں کی حقیر سے حقیر اقلیت بھی ہندوؤں کی بڑی

سے بڑی اکثریت پر اتنا اثر تو ضرور ڈال سکے گی کہ ڈاکٹر مونجے کی طرح دریدہ دہن امیدوار بھی ڈرنے لگیں گے کہ کہیں سری جت انجینئر مسلمانوں کے چند ووٹوں کی مدد سے منتخب نہ ہو جائیں اور لالہ لاجپت رائے بھی جن کی گوشت خواری مشہور زمانہ ہے یہ نہ کہہ سکیں گے کہ کسی ہندو سبھائی کے خلاف اور کسی سوراجی ہندو کے لئے ووٹ دینا گئو ہتیا کرانا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہو سکے گا دگو ہر گز یقینی نہیں) کہ اقلیت اپنا ایک بھی صحیح نمائندہ نہ منتخب کرا سکے اور جو اس کے نمائندے بن کر جائیں وہ کبھی بھی اس کے موافق لب کشائی نہ کر سکیں۔

اس لئے یہ تدبیر کافی نہیں ہے کہ خالص ملی حلقہ ہائے انتخاب کی جگہ عام ملکی اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قائم کر دئے جائیں۔ البتہ یہ تدبیر مسلم اقلیت کی کافی اور موثر حفاظت ہو سکے گی کہ مسلم اقلیت کو اکثریت کر دیا جائے۔ یہ اس طرح تو نہیں ہو سکتا جس طرح انگریزی عمال حکومت نے اپنی اقلیت کے "حقوق" کی "کافی اور موثر حفاظت" کے لئے کیا تھا کہ ہر جگہ اپنی اقلیت کو اکثریت کر دیا تھا۔ مگر یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ چند صوبوں میں مسلمانوں کی بھی اکثریت کر دی جائے۔ آج بھی پنجاب اور بنگال میں ان کی خفیف سی اکثریت ہے۔ اس کو مسلم لیگ کی تجاویز کے مطابق خفیف تر کرنا ہرگز درست نہ ہوگا، نہ "لکھنؤ پیکٹ" کے طریقے پر اس اکثریت کو پنجاب میں برائے نام مساوات اور حقیقی اقلیت کر دینا اور بنگال میں صاف اور صریح اقلیت کر دینا۔ اس کا تحفظ اس طرح کیا جائے کہ خواہ رائے دہندگی کے لئے آمدنی کی کوئی شرط بھی کیوں نہ رکھی جائے پنجاب اور بنگال کے اتنے مسلمانوں کو حق انتخاب ضرور دے دیا جائے کہ ہندو حق انتخاب رکھنے والوں کے مقابلے میں ان کا تناسب بالکل وہی ہے جو آبادی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب ہے۔ اس کے علاوہ دو چھوٹے چھوٹے صوبے اور ہیں جہاں ہماری اکثریت ہے صوبہ سرحدی

اور بلوچستان حقیقتاً یہ تو ہندوستان کے اجزا بھی نہیں ہیں۔ برما کی طرح انگریزی استعماری
فتوحات نے انھیں ہندوستان میں ملا دیا ہے لیکن جب تک یہ ہندوستان میں شامل ہیں
(اور اگر ہم نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو غالباً یہ ہندوستان ہی کے اجزا بنے
رہنا پسند کریں) ان کے ساتھ اسی طرح برتاؤ کرنا چاہیے جس طرح ہندوستان کے
دیگر اجزا کے ساتھ کیا جاتا ہے اور ان کو اصلاحات دے دی جائیں۔ ہندوستان کا
ایک اور جزو بھی ہے جہاں ہماری صاف اور صریح اکثریت ہے گو انگریزوں نے
اسے چند اور اجزائے متفرق سے ملا کر صوبۂ بمبئی کا ایک جزو بنا دیا ہے۔

کانگریس ۱۹۲۰ء ہی میں باتفاق رائے تمام ہنود کے اسے ایک علیحدہ صوبہ
بنا چکی ہے۔ اس کو بمبئی سے علیحدہ کر دیا جائے تو ان تین چھوٹے چھوٹے صوبوں
میں مسلمانوں کی اکثریت اسی طرح زبردست ہوگی جس طرح ہندوؤں کی اکثریت پنجاب
اور بنگال کے سوا ہر صوبے میں ہے۔ اس تقسیم کے خلاف یوں بھی کوئی عذر نہیں پیش
کیا جا سکتا۔ لیکن جس طرح صوبہ سرحد کو اصلاحات دینے کے خلاف مالوی جی اور تقریباً
تمام سوراجی ہندو بھی یہاں تک کہ پنڈت موتی لال اور لالہ لاجپت رائے کو مالوی جی
سے علیحدہ رکھنے کے لئے مجتمع ہو گئے تھے اور سر سیوا سوامی آئیر اور مسٹر رنگا چاریہ نے
اپنے تعصب اور اپنی تنگ نظری کو ہزاروں ادھر اُدھر کے عذرات میں ڈھانکا تھا
اور صوبہ سرحدی کو اصلاحات دینے کے لئے ہندو صاحبان صرف اسی طریقے پر تیار
تھے کہ وہ اپنی ذاتی ہیئت کو بالکل کھو دے اور صوبۂ پنجاب میں ملحق ہو جائے اور
جس طرح سارے ہندوستان کے ہندوؤں نے اس تقسیم بنگالہ کے خلاف طوفان اٹھایا
تھا جس نے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو ہندوؤں پر اکثریت دے دی تھی اس طرح
آج بھی متعصب، تنگ دل اور تنگ نظر ہندو سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے خلاف
ادھر اُدھر سے عذرات ڈھونڈھ کر نکال رہے ہیں۔ اور تینوں امور میں اصل وجہ

ایک ہی تھی یعنی وہ کسی صوبے میں بھی مسلمان اکثریت کے ماتحت رہنا نہیں چاہتے۔ ہم نے اسی لئے یہ تدبیر سوچی ہے کہ پانچ صوبوں میں وہ بھی مسلمانوں کی اکثریت کے ماتحت رہیں جس طرح کہ باقی تمام صوبوں میں جو وسعت اور آبادی میں ان سے کئی گنے ہیں مسلمان ان کی اکثریت کے ماتحت رہیں گے۔ ہم کب چاہیں گے کہ مسلمان اقلیتیں صوبجات متحدہ، صوبہ بمبئی، صوبہ مدراس، صوبہ بہار اڑیسہ، صوبجات متوسط، صوبہ آسام، صوبہ دہلی، صوبہ اجمیر میرواڑہ اور صوبہ کرگ میں ہندوؤں کی اکثریت کے ظلم و تعدی کا شکار ہوں؟

اس لئے ہم اپنے ان بھائیوں کو اکثریت کے ظلم و تعدی سے بچانے کے لئے پنجاب، بنگال، سندھ، صوبہ سرحدی اور بلوچستان میں ہرگز ہندو اقلیت پر ظلم و تعدی کو روا نہ رکھیں گے۔ اس سے بڑھ کر کیا ضمانت دی جاسکتی ہے؟ لیکن اگر ہماری اقلیتوں پر ان صوبوں میں ہندو اکثریت نے ظلم و تعدی کو روا رکھا تو اس کی ہندو اقلیتوں کے ذریعے سے اصلاح کرانے کی انہیں بھی پانچ صوبوں میں ضرورت ہوگی۔ ہم ہندوؤں کو کافی ضمانت اپنی نیک چلنی کی دیتے ہیں اور وہی ضمانت ان سے ان کی نیک چلنی کی طلب کرتے ہیں۔ یہ مسلم اقلیت کی کافی اور موثر حفاظت ہے اور اسی باعث دہلی میں مالوی جی سے اور پٹنہ میں ڈاکٹر مونجے سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور جو مباحثہ ہندو مہاسبھا کی سبجکٹ کمیٹی میں ہوا ہے اس پر اب تک پردہ نہیں اٹھایا جاسکا۔ ڈاکٹر مونجے کو اپنا خطبہ صدارت اس کی اشاعت کے بعد بھی بدلنا پڑا اور گو جتنے تار مہاسبھا کے جلسے سے قبل آتے تھے۔ سب ظاہر کرتے تھے کہ اسی امر پر ہر طرف بحث و مباحثہ ہو رہا ہے لیکن آج تک نہ معلوم ہو سکا کہ ڈاکٹر مونجے صاحب نے اپنے صدارتی ایڈریس میں ترمیم کی تو کیا اور سبجکٹ کمیٹی نے فیصلہ کیا تو کیا کیا۔ البتہ ایسوسی ایٹڈ پریس نے نہایت وثوق سے لیڈروں کے

آنے اور مہا سبھا کا جلسہ شروع ہونے سے چند دن پہلے ہی اطلاع دی تھی کہ فیصلہ وہی ہوگا جو دہلی میں ہوا تھا یعنی کوئی فیصلہ نہ ہوگا۔ مسلمان اگر یوں ہی خالص مسلم حلقہ ہائے انتخاب چھوڑ کر اپنی اقلیت کو ہر صوبے میں ہندو اکثریت کے رحم پر چھوڑنے کو تیار ہیں تو "فبہا" ورنہ ہندو "قوم پرور" موجودہ صورت حال ہی پر قانع ہیں۔ وہ ہر صوبے میں مسلمانوں کو اقلیت میں رکھنا چاہتے ہیں اور ایک صوبے میں بھی ہندوؤں کو اقلیت میں رکھنے کے روادار نہیں۔ اس طرح ہمارے ۲۰ مارچ کے فیصلے نے ان "قوم پروروں" کی "قوم پروری" کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ کل انشاء اللہ پھر اسی موضوع پر لکھوں گا اور ثابت کروں گا کہ ہندو جاتی اس امتحان میں جو ہم نے لیا تھا کس بری طرح فیل ہوئی۔

(۴) ہندو جاتی کی قوم پروری کا بھانڈا پھوٹتا ہے

ہمدرد ۲۰ اپریل ۱۹۲۷ء

میری سیاست دانی کی داد دیجئے کہ کل جب وقت میں "ہمدرد" میں اس سرخی کے نیچے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھ رہا تھا کہ حقیقتاً ہمارے بعض مسلمان بھائیوں سے کہیں زیادہ یہ ہندو سبھائی ہمارے (۲۰ مارچ کے) فیصلے کی حقیقت کو سمجھتے ہیں اور ان کا سکوت ہمارے ان مسلمان بھائیوں کے اختلاف سے کہیں زیادہ آج اس فیصلے کی قدر افزائی کر رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کہیں ان کے اظہار اختلاف سے یہ ہندو سبھائی 'قوم پرور' فائدہ اٹھالیں اور کہہ دیں کہ "ابھی اس پر غور کرتے اور اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ خود مسلمان بھی اس سے متفق نہیں ہیں"۔ ٹھیک اسی وقت یہ ہندو سبھائی "قوم پرور" ہمارے ان بے صبر اور (اگر معاف کریں تو کہوں) بے سمجھ بھائیوں کے اظہار اختلاف سے فائدہ اٹھا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ابھی مسلمان لیڈروں کے ۲۰ مارچ کے فیصلے کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے' اس لئے کہ خود مسلمان بھی اس سے متفق نہیں ہیں! فاعتبروا یا اولی الالباب! آج صبح اٹھتے ہی میں نے ایسوسی ایٹڈ پریس کے تار منگائے اور دیکھا کہ ۱۸ اپریل کو سبجکٹ کمیٹی اور اس کی خاص سب کمیٹی کی خلوت سے وہ ریزولیوشن جلوت میں آ گیا جو ہمارے فیصلے کا جواب تھا اور بجائے اس کے کہ ہندو مہاسبھا میں اس پر کوئی بحث و مباحثہ ہوتا یہ "ڈنڈے باز" صدر جناب ڈاکٹر مونجے کرسی صدارت سے پیش فرمائیں گے۔ وہ جواب یہی تھا کہ ابھی جواب دینے کی کچھ ضرورت نہیں۔ کیا اب بھی ہمارے نکتہ چیں بھائی قائل نہیں ہوئے کہ ہمارا فیصلہ "لاجواب" تھا۔

جو ریزولیوشن سبجکٹ کمیٹی کے پردۂ اخفا سے گھنٹوں کی گرما گرم بحث کے بعد نکلا ہے اس کا دیباچہ وہی ہندو جاتی کی پالیسی ہے جس کا اظہار گذشتہ سال کی مہاسبھا منعقدہ دہلی میں کیا گیا تھا۔ میں نے اس ریزولیوشن کو بہت ڈھونڈھا مگر نہ ملا تاہم بلا شک وریب کی ذراسی بھی گنجائش کے یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ یہی ہوگا کہ وہ ہندو جاتی جس میں بقول لالہ لاجپت رائے جی کے (ملاحظہ ہو سال گذشتہ کی مہاسبھا میں چھوت چھات کے ہنگامہ خیز اور شورش انگیز ریزولیوشن پر لالہ جی کی گول مول تقریر) "ایک مالوی دوسرے مالوی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھاسکتا۔ جس میں ۲۲ کروڑ میں سے کم از کم ۵ کروڑ اچھوت ہندو اپنے ہم مذہبوں کے مدارس میں داخل نہیں کئے جاسکتے (البتہ بقول لالہ جی وحاضرین جلسہ کے ایک غیر ہندو حکومت کے مدارس میں سے انھیں کوئی نہیں نکال سکتا) جس میں اسی تناسب سے اچھوت ہندو اپنے ہم مذہبوں کے کنوؤں سے پانی نہیں بھر سکتے (البتہ بقول ایضاً ایک غیر ہندو حکومت کی قائم کردہ میونسپلٹیوں کے کنوؤں سے انھیں پانی بھرنے سے کوئی نہیں روک سکتا) جس میں اسی تناسب سے اچھوت ہندو اپنے ہم مذہبوں کے مندروں میں داخل ہو کر پوجا نہیں کرسکتے (افسوس ہے کہ ایک غیر ہندو حکومت اور اس کی قائم کردہ میونسپلٹیوں نے پوجا پاٹ کے لئے کوئی مندر نہیں بنوائے ورنہ بقول ایضاً ان مندروں سے انھیں کوئی نہیں نکال سکتا۔) وہ ہندو جاتی مسلمانوں کی افتراق پسندی پر خون کے آنسو بہاتی ہے اور ایک مشترکہ قومیت کے قیام کے لئے اس کا دل سخت بے چین ہے اور گو صوبہ سرحدی کو وہ اس لئے اصلاحات دینا پسند نہیں کرتی کہ وہاں اس کی اقلیت ہے اور مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہ تمام ان صوبوں میں جہاں اصلاحات دی جاچکی ہیں اور جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں یا باوجود اکثریت کے اقلیت میں رکھ دئے گئے ہیں، صرف بہ تقاضائے قوم پروری اس کو بھی گوارا نہیں کرسکتی کہ مسلمان اپنے

نمائندوں کا خود ہی انتخاب کر لیا کریں یا ان کی نمائندگی کا تناسب ان کی آبادی کی قلیت اور ان کے افلاس وجہل کی اکثریت سے ذرا بھی زیادہ ہو۔

اس دیباچے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ بنا بریں کہ (الف) مسلمان ہماری طرح سمجھ دار نہیں ہیں کہ دیکھیں کہ ہم کیا کہتے ہیں بلکہ نہایت احمق واقع ہوئے ہیں اور باوجود ادعائے وحدت اسلامیہ اور "تنظیم" کی چیخ و پکار کے اس فیصلے پر بھی متفق نہیں ہیں جس پر ہماری بدبختی سے رلائے سینا کے جلسے کے حاضرین مسلم لیڈر حیرت انگیز طریقے پر متفق ہو گئے تھے بلکہ ہر وہ مسلمان جو لیڈری کا دعوے دار ہے اور اسی لئے جن کو اب تک لیڈر کہا جاتا ہے ان کا جانی دشمن ہے اور جو خود لیڈروں کے اس جلسے میں شریک نہ تھا اور اگر اس میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا تھا تو غیر حاضر ہونے سے شرمندہ نہیں ہے بلکہ اسی باعث اپنے تئیں حاضرین کے فیصلے کے لئے ذمہ دار نہیں سمجھتا اور اس سے اپنی برأت کے اظہار کو فرض سمجھتا ہے۔ اور اگر مدعو نہیں کیا گیا تھا تب تو اپنی اس توہین و تذلیل و تحقیر کو حاضرین جلسے کے خلاف اعلان جنگ کے لئے کافی سبب سمجھتا ہے، اپنا مذہبی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تاریخی، جغرافیائی وغیرہ وغیرہ فرض سمجھتا ہے کہ حاضرین جلسے سے دست و گریباں ہو جائے اور جب تک ساری ملت اسلامیہ کو ان کے خلاف ابھار کر اس فیصلے کو منسوخ نہ کرائے اور اس طرح ان کو دنیا بھر میں ذلیل و خوار نہ کرائے۔ اس پر دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہے اور (ب) رلائے سینا کے جلسے کے حاضرین نے ایمان داری کو کام میں لا کر اور احتیاط کو برت کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ فیصلہ ابھی تمام مسلمانان ہند کا فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ ابھی یہ ہم حاضرین ہی کا فیصلہ ہے (اور ممکن ہے کہ بعض ہم میں سے بھی جا کر ان غیر حاضرین سے جن کا ذکر (الف) میں اوپر کیا جا چکا ہے اور جو ہم سے اپنی عدم شرکت کے باعث ناراض اور اسی لئے ہمارے فیصلے سے بیزار ہیں کہنا شروع کر دیں کہ انا معکم انما نحن مستھزءون (ہم ہیں تو تمہارے

ہی ساتھ مگر کیا کریں مجبور تھے۔ وہاں اوروں کے ساتھ اتفاق ہی کرنا پڑا بلکہ ہم تو یہ بھی کہہ آئے یہ تدبیر درحقیقت ہماری ہی ایجاد ہے۔ ہم نے فلاں سنہ قبل مسیح میں فلاں یادداشت میں یہی تجویز پیش کی تھی مگر تم ذرا پروا نہ کرو۔ اگر تمہیں یہ منظور نہ ہو تو صاف مخالفت کرو۔ ہم کہیں سنجیدگی سے تو رائے دے نہیں آئے ہیں ہم تو فقط سنتے تھے۔

تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا فیصلہ اس وقت ہوگا جبکہ ہماری تمام جمعیت ہائے ملی کے نمائندے اس پر غور کر کے فیصلہ صادر کریں (جس کی ہم ہندو سبھائیوں نے اس طرح تقلید کی کہ ہم نے اپنے دہلی کے جلسے میں ایک سب کمیٹی اس لئے بنادی کہ ۲۲ کروڑ والی ہندو جاتی کے ہر ایک فرد سے پہلے اس کی رائے دریافت کرے اور "جلد سے جلد" یعنی اس کنبھ کے میلے کے بعد دوسرے کنبھ کے میلے تک اپنی رپورٹ پیش کردے جس کے بعد ہم ایک اور سب کمیٹی بنادیں گے کہ وہ اس سب کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرے اور پھر ایک "تیسری سب کمیٹی" بنادیں گے کہ وہ اس دوسری سب کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرے اور یہی سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۹ء کا کمیشن آئے اور چلا جائے) اور (ج) مسٹر جینا نے یہ ایک عجیب و غریب بات کہی ہے کہ مسلمانوں کے فیصلے میں ایک حصہ شرط کا ہے اور دوسرا اس کی جزا کا، اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کی جزا ہم ہندو سبھائی اس وقت تک قبول نہیں کرسکتے جب تک اس انوکھی اور نرالی شرط کو بھی قبول نہ کرلیں کہ پنجاب، بنگال، سندھ، صوبہ سرحدی اور بلوچستان سب میں کونسلیں ہوں اور ان کے لئے نمائندے انتخاب کرنے والوں میں اسی طرح مسلمانوں کی اکثریت ہو جس طرح کہ بمبئی، صوبجات متحدہ، بہار اڑیسہ، متوسط، آسام، دہلی، اجمیر میرواڑہ، کرگ اور مدراس میں، اور اگر سر سنکرن نائر مسلمانوں کے خاص عنایت فرما کا سال گذشتہ کا کونسل آف اسٹیٹ والا یا مدراس کونسل کا امسال والا ریزولیوشن منظور ہو جائے تو مدراس کی جگہ تامل ناڈو، آندھرا اور بقیہ صوبہ مدراس میں ہندوؤں کی اکثریت رہے گی اور اگر

ہیں یہ بیہودہ لغو اور تباہ کن شرط منظور نہیں ہے تو مسلمانوں کو وہ ہماری محبوب یہ ہمیں دل سے مطلوب اور کیا کہیں کس قدر مرغوب جزا بھی منظور نہ ہوگی کہ مسلمان اپنی حقیر اقلیتیں ہماری عظیم الشان اکثریتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اس لئے اس سے مطلق فائدہ نہ ہوگا کہ ہم اس وقت اس فیصلے پر نمردمیت کوئی ایسی رائے دیں جس کو کوئی سمجھ سکے اور ہم پابند ہو جائیں۔

تاہم یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہندو مہاسبھا کا پٹنے میں اجلاس ہو اور یہ قوم پرور ہندو جاتی ایک صاف و صریح رائے اس مردود شرط کے خلاف نہ دے جس میں اس باغیانہ خیال کے اظہار کی جرأت اور جسارت کی گئی ہو کہ اس اچھوت تہذیب والی ہندو جاتی کی اقلیتیں خواہ اسلامی تہذیب والی ملت کی اکثریت پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کے لئے تیار ہو۔ اس لئے ہندو مہاسبھا اس باغیانہ کوشش کے خلاف اظہار نفرت کرتی ہے کہ کسی صوبے میں قانون ساز کونسلیں بالخصوص اس غرض کے لئے بنائی جائیں کہ کسی خاص ملت کو ان میں اکثریت حاصل ہو جائے گو جب ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے تقسیم بنگالہ اس طرح کر دی تھی کہ ایک صوبے میں ہندو جاتی بھی اقلیت میں رہ گئی تھی تو ساری ہندو جاتی نے ایک محشر بپا کر دیا تھا اور اس وقت تک راضی نہ ہوئی جب تک کہ بادشاہ سلامت نے خود دہلی تشریف لا کر اور اپنی تاج پوشی کے ایک عرصے بعد تاج پوشی کا اعلان کرنے کے بہانے سے بہ نفس نفیس انگریزی عمال حکومت کے خلاف ایک دوسرا اور حقیقی اعلان نہ کر دیا کہ تقسیم بنگالہ تو قائم رہے گی مگر اب نئی تقسیم اس طرح ہوگی کہ بجائے ایک ٹکڑے میں بنگالی مسلمانوں کی اکثریت ہونے کے اور دوسرے ٹکڑے میں ہماری ہندو جاتی کی اکثریت ہونے کے دونوں ٹکڑوں میں حقیقتاً ہندوؤں ہی کی اکثریت ہوگی گو ایک ہی آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کی خفیف سی اکثریت ہوگی لیکن افلاس اور جہل

میں بھی ان کی اکثریت ہوگی اور بہت عظیم الشان ہوگی اس لئے اس کا کچھ خوف
نہ کرنا چاہیئے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ ۱۸۸۵ء سے ایک سیاسی انجمن ہندوستان میں موجود ہے
جو باوجود ۷ کروڑ مسلمانوں اور کروڑوں راجپوت اور مرہٹہ ہندوؤں اور سکھوں کی عدم
شرکت کے "ہندی" اور "قومی" کہلائی جاتی تھی "شیر پنجاب" نہیں نہیں اب وہ
پنجاب کے "کیسری" ہیں اور شاید جلد ہی "پانچ جلوں کے کیسری" ہوجائیں اس
لئے کہ نہ "شیر" ہندو جاتی کی بھاشا شبد ہے نہ "پنج" ہے نہ "آب" ہی [illegible]
لالہ جی کے صوبے میں انگریزوں نے ہندو مسلمان، سکھ سب کا خون نہایت
بیدردی سے بہایا۔ سب کو زمین پر سانپ اور بچھو کی طرح پیٹ کے بل چلایا
اس لئے کہ ۱۹۱۲ء کے آخر میں پہلی بار اس سیاسی انجمن میں شریک ہو گئے اور
گو مسلمانوں کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اس میں اکثریت حاصل کرلیں تاہم ان کی
بھی ایک جماعت اس میں شریک ہے اور خدا کے فضل سے سوراجیوں کی بغاوت
کے بعد بھی اس میں کچھ ایسے ہندو اب تک ہیں جو ہندوستان کو فقط ہندوؤں کا ملک
اور ان کی ملک نہیں سمجھتے نہ اس ڈر سے کہ کہیں ڈیڑھ کروڑ افغانی اور ۷ کروڑ
ہندوستانی مسلمان مل کر ۲۲ کروڑ ہندوؤں کو باوجود ان کے نیپالی بھائیوں کے اور
اب تو جاپانی اور چینی بھائیوں کے بھی ہضم نہ کر جائیں انگریزوں کی غلامی پر صابر و
شاکر ہیں۔ ہندو سبھا نے اس سیاسی انجمن اور اس کے سوراجی ارکان کی گذشتہ
انتخابات میں پوری پوری مخالفت کی اور شمالی ہندوستان میں اسے ہرا کر چھوڑا۔ مگر
اس کو کیا کرے کہ مدراس میں جھگڑا ہندو مسلمانوں میں نہیں ہے برہمن اور غیر برہمن
ہندوؤں میں سب ہے اور وہاں ہندو سبھا کا اس قدر زور نہیں اس لئے کہ وہاں ہندو
ہی ہندوؤں کو عام سڑکوں پر راستہ تک نہیں چلنے دیتے۔ پھر سنگھٹن کیا ہو؟ بہرحال

ابھی انڈین نیشنل کانگرس پھر ہندو سبھا نہیں بنی ہے اس لئے ہندو سبھا اسے حکم دیتی ہے کہ جس طرح ہندو مہاسبھا اس وقت تک جبتک کہ ۱۹۲۹ء کے کمیشن کی رپورٹ اور اس پر برطانیہ کی پارلیمنٹ کا فیصلہ نہ ہو ئے مسلمانوں کے فیصلے کو ردی کی ٹوکری ہی میں ڈالے رکھے گی۔ بالکل اسی طرح انڈین نیشنل کانگرس بھی اسے ردی کی ٹوکری ہی میں ڈالے رکھے۔

پہلے دیباچے میں وہی پرانے قوم پروری کے دعاوی کا اعادہ اور گفت وشنید کے لئے آمادگی کا اظہار پھر اس پر بھی مسلمانوں کے لیڈروں کے فیصلے پر رائے دینے سے اس لئے انکار کہ کوئی معقول جواب بن نہیں آتا تاہم اس پر اصرار کہ کہیں بھی ہندو اقلیت میں نہ رکھے جائیں اور مسلمانوں نے خالص مسلم حلقہ ہائے انتخاب کے چھوڑنے کے لئے جو شرط لگا دی اس کے قبول کرنے سے بیزار ہیں۔ لیکن اس پر بھی اصرار کہ وہ کانگرس جس کی ہندو سبھانے اس قدر کھلم کھلا مخالفت کی تھی مسلمانوں سے گفت وشنید کر کے کوئی ایسا فیصلہ نہ کرے جس سے ہندو مسلم کشیدگی دور ہو اور ملک میں اتحاد و اتفاق کی پھر بہار آئے۔ یہ ہے ہندو مہاسبھا کا جواب لیکن اس میں ایک چیز بھی ثبتانہ نہ تھی۔ شروع سے اخیر تک منفیانہ ہی منفیانہ پہلو نظر آرہا تھا۔ اس لئے ان ماہرین سیاست نے جن کی سب کمیٹی کے یہ ریزولیوشن سپرد ہوا تھا یا خود سبجکٹ کمیٹی نے یہ طے فرمایا کہ آخر میں ایک دو لفظ ایسے بھی کہہ دئے جائیں جس سے معلوم ہو کہ ہندو مہاسبھا آخر چاہتی کیا ہے۔ چنانچہ پہلی چار دفعات کے بعد اس ضابطہ سیاسی ہندو مہاسبھا میں ایک آخری پانچویں دفعہ بھی رکھ دی گئی مگر اس میں بھی یہ ارشاد نہ ہوا کہ ہندو مہاسبھا چاہتی کیا ہے بلکہ صرف اسی قدر ارشاد ہوتا ہے کہ "تاہم مہاسبھا حسب ذیل اصولوں کو بطور موضوع بحث کے تجویز کرتی ہے۔" وہ "موضوع بحث" بننے کے قابل اصول کیا ہیں؟ سب سے اول تو وہ جزا ہے جو محبوب مطلوب اور مرغوب

ہے یعنی (الف) تمام صوبجات کے لیے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب۔ نیز مسلمانوں کی رعایت سے اس میں اس قدر اور بڑھا دیا گیا ہے کہ ایک خاص مدت کے لیے جسے مختلف پارٹیاں اتفاق رائے سے متعین کر دیں نشستیں مخصوص کر دی جائیں مگر نمائندگی ایک ہی اصول پر مبنی ہو مثلاً آبادی یا فہرست رائے دہندگان یا ٹیکسوں کی ادائگی کی رقم میں تناسب کے مطابق یعنی اگر مسلمان چاہیں تو جس اقلیت میں وہ تقریباً تمام صوبوں میں بحساب آبادی ہیں اسی کے مطابق ان کے لیے نشستیں بھی مخصوص ہو جائیں۔ "لکھنؤ پیکٹ" کی طرح پنجاب و بنگال میں اس سے کم ہی نہ ہوں گو ان کا اثر کرنا پنجاب و بنگال کے سوا (جہاں ہندو تعلقوں، زمینداروں اور وکیلوں کا اثر ہے) ہر صوبے میں ہندو اکثریت ہی کے ہاتھ میں ہو یا پھر اس سے بھی کم تناسب سے نشستیں مقرر کی جائیں (مفلس و نادار اور جاہل مسلمانوں کو کم نشستیں دی جائیں اور متمول اور تعلیم یافتہ ہندوؤں کو زیادہ دی جائیں۔ (ب) ہر صوبے میں رائے دینے کا حق ہندو مسلمانوں کو یکساں طریقے پر دیا جائے۔ یہ نہ ہو جیسا کہ مارلے منٹو اصلاحات اور مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات دونوں میں مسلمانوں کے افلاس پر نظر رکھ کر کیا گیا تھا کہ خالص مسلم حلقہ ہائے انتخاب میں مقابلتاً کم حیثیت مسلمانوں کو بھی رائے دینے کا حق دیا گیا تھا ورنہ مسلمان رائے دہندگان کی فہرست نہایت ہی مختصر ہوتی۔ (ج) مذہبی حقوق (مناسک) اور مذہبی جیسے رسوم کا آئینی تحفظ۔

حسن خاتمہ یہ ہے کہ اب بھی ہندو جاتی کی رائے معلوم نہیں ہوئی۔ اس کے لیے جس طرح دلی کے خواص کے جلسے نے ایک سب کمیٹی بنا دی تھی کہ جلد سے جلد لیکن بہ ظاہر ۱۹۲۹ء کے کمیشن کے چلے جانے کے بعد رپورٹ پیش کرے اسی طرح ہردوار کے کمبھ میلے اور پٹنے کی مہاسبھا کے بعد بھی مجلس عاملہ ایک کمیٹی بنا دیگی تاکہ یہ خوب چھان بین کر کے ہندوؤں کی رائے دریافت کرے پھر اپنی تجویز کو سامنے

میں ڈھالے، مسلم لیڈروں سے بھی گفت وشنید کرے اور بالآخر "آل انڈیا ہندو مہاسبھا" کی منظوری کے لئے پیش کر دے۔

یہ تو ہندو مہاسبھا کا جواب ہوا لیکن اب ہم کیا کریں؟ ہم دیباچے کا جواب اس طرح دیں کہ صاف کہدیں کہ تمھاری "قوم پروری" کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اب اس راگ کو نہ الاپو اور جو جی چاہے گنگناتے رہو۔ دفعہ (۲) کا یوں جواب دیا جائے کہ شروع مئی ہی میں تمام مسلم جمیعتوں کا جلسہ بمبئی میں منعقد کیا جائے اور ہندو مہاسبھا پر ظاہر کر دیا جائے کہ مسلمانوں کا فیصلہ متفقہ ہے اور نیز یہ کہ جزا بلا شرط کی منظوری کے منظور نہیں ہو سکتی۔ ہمارے فیصلے کے اجزا نہیں ہیں وہ ایک ہی فیصلہ ہے جس میں شرط وجزا دونوں شامل ہیں۔ ہم بنیئے بقال نہیں ہیں کہ مول تول کریں۔ مہاتما گاندھی کی طرح ہم نے "ناقابل تخفیف اقل مطالبہ" پیش کیا ہے اور جیسا کہ خوانچہ والے گوروں سے کہا کرتے ہیں "خوشی ٹیک خوشی نہ ٹیک"۔ دفعہ (۳) کا یہ جواب ہے کہ ہم اپنی اقلیت کو تمھاری اکثریت کے رحم پر اسی حالت میں چھوڑ سکتے ہیں کہ تم بھی کم سے کم ان پانچ پرانے اور نئے صوبوں میں اپنی اقلیت کو ہماری اکثریت کے رحم پر چھوڑ دو۔ ہم بھی زبان یا کسی اور شے کے اختلاف کو بنائے تمیز سمجھ کر ہندوستان کے صوبجات کی تقسیم پر آمادہ ہیں مگر سندھ آج بھی بمبئی سے انتظامی حیثیت سے کسی قدر ممیز ہے۔ بہر حال اس کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ آج ہم زیادہ تر اسی لئے کر رہے ہیں کہ اس صوبے میں ہماری نمایاں اکثریت کو بھی تمھاری اور صوبوں میں اکثریت کو بے قابو اور بے لگام نہ ہونے دینے کی قدرت حاصل ہو جائے۔ دفعہ (۴) کا جواب کانگرس کے سوراجی ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ انھیں اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے ہمارے نہایت منصفانہ، شریفانہ اور معقول فیصلے کی داد دلوائیں ورنہ اس ڈھکوسلے کا خاتمہ کریں اور

سب کے سب ہندو مہا سبھا میں جا کر شریک ہو جائیں اور اسی کا نام "انڈین نیشنل کانگرس" رکھیں۔ رہی دفعہ (۵) اس کے متعلق ہمیں کچھ کہنا نہیں۔ ہندو بھائی اگر اپنی اقلیتوں کے لئے کچھ مراعات طلب کرتے ہوں تو طلب کریں اور گو وہ آج تک ہماری اقلیتوں کے لئے تمام مراعات کو قومی شریعت کے مطابق حرام ہی بتاتے رہے مگر ہم اب انھیں حرام نہ کہیں گے اور جو مراعات وہ اپنی اقلیتوں کے لئے مانگیں گے وہی ہم بھی اپنی اقلیتوں کے لئے قبول کرلیں گے اور اگر وہ ہماری اکثریتوں ہی پر بھروسہ کرنے کی ہمت کرلیں گے تو ہم بھی ان کی اکثریتوں ہی پر بھروسہ کریں گے اور پھر دکھا دیں گے کہ ملت اسلامیہ کس طرح صلح وسلامتی اور امن و آشتی کو عزیز رکھتی ہے اور کس طرح تمام انسانوں کے ساتھ انصاف مساوات اور رواداری کا سلوک کرتی ہے۔ خدا ہمارے ہندوستانیوں کو توفیق دے کہ ہمارے منصفانہ فیصلے کو قبول کریں۔ آمین ثم آمین۔

ہندو مسلم سمجھوتے کی کوشش

دہلی میں سیاسی فرقوں کا شوریٰ[۱]

ے متفقہ دستور اساسی وضع کئے جانے کی توقعات

ہمدرد ۲۲ مارچ ۱۹۳۹ء

نہ معلوم ہمدرد کے قارئین کرام بنی اسرائیل اور بادشاہت پسندی کے بارے
ے متعدد اور خاصے طولانی مضامین پڑھتے پڑھتے تھک تو نہیں گئے۔ ابھی
لے میں ایک یا دو مضامین اور لکھتا ہوں لیکن مجھے خوف ہے کہ باوجود بنی اسرائیل
قدر مذمت پڑھنے کے کہیں وہ بھی انھیں کی طرح نہ کہنے لگیں کہ لن نصبر
ام واحدٍ۔ روح صحافت خود تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہے اس لئے میں نے
جانا کہ آج اس سلسلے کو تھوڑی دیر کے لئے منقطع کر کے ہندوستان کی موجود
کے متعلق کچھ عرض کروں۔ حقیقتاً ایک عرصے سے میں نے اس موضوع
نہیں لکھا ہے اور قارئین ہمدرد کی یہ شکایت ایک حد تک واجبی ہے کہ تم
ملک میں تو مارے مارے پھرتے ہو مگر ہمیں اتنا بھی نہیں بتاتے کہ جہاں گئے
نے کیا کیا؟ اور شکایت اسی تک ختم نہیں ہوتی بلکہ یہاں تک بھی پہنچتی
ہے کہ تم ہمدرد اور دہلی کو چھوڑ کر باہر جاتے ہی کیوں ہو۔ میرے اور "ہمدرد"
ے نہایت عزیز اور بڑے ہمدرد ہے جو ہمیشہ ہی دونوں کی مدد کرتے رہتے
جن کی یاد بھی اگر وہ خود تشریف نہیں لاتے اگر دل کو سرور اور تازگی بخشتی
، اور جن کا وجود گرامی باوجودیکہ وہ ایک کھدر پوش صاحب ہیں جن کی مولیانہ
ظاہر اس سے کوئی مناسبت نہیں مجھے آج کے ہجوم افکار میں بے اختیار

[۱] ے مضامین محمد علی جلد اول

غالب کا یہ شعر یاد دلاتا ہے کہ ؎

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

مجھے حال ہی میں لکھا ہے کہ تمام امور پر غور کر کے اب میں اس نتیجے پر پہنچا
کہ آپ دونوں بھائی کم سے کم ایک سال کے لئے تو دلی اور بمبئی سے کہیں باہر نہ جائیں
اس کا جواب میں انشاء اللہ ضرور دوں گا مگر مجبوراً طولانی ہوگا اور ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء
۲۰ مارچ ۱۹۲۸ء تک کا پورا روزنامچہ پیش کر کے دریافت کیا جائے گا کہ فرمائیے جہا
جہاں میں اس سال بھر میں گیا ہوں ان میں سے کونسا مقام ایسا تھا کہ جہاں میرا
ناگزیر نہ تھا اور جو جو کام میں نے کئے ہیں ان میں سے کونسا کام ایسا تھا جس کو
چھوڑ سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک و ملت کی اصلاح کے لئے صحافت تنہا
ضروری ہے اور اسی لئے ہمدرد کے مالک اور اڈیٹر نے اس فاقہ مستی کا ثبوت
جو جنوں سے کسی طرح کم نہیں اور سہم نقصانات کے باوجود بھی قرض دام لے
اسے تین ساڑھے تین سال تک ٹمٹماتا ہی رہا تا آنکہ اب کوئی قرض بھی نہیں
اور ممکن ہے ہفتے دو ہفتے میں خانہ بدوش ہی نہیں بلکہ مطبع بدوش ہی ہونا
لیکن صرف صحافت ہی سے کام نہیں چلتا کنویں کو پیاسے کے پاس خلے ہی
بلکہ قدمے بھی جانا پڑتا ہے ع

صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں

ہمدرد جاتا کتنوں کے پاس ہے کہ اسی پر قناعت کی جائے۔ جب اہل
ہی اس قدر بے اعتنائی کرتے ہیں تو مجبور ہو کر ہر جمعہ کو مسجد جامع کے ممبر پر
بانگ تکبیر بلند کرتا ہوں جب دلی کے باہر بھی ہر طرف ہنگامہ آرائی ہوتی ہے
ملک و ملت کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا گم کردہ را

گمراہ کن رہنما دونوں کو منزلِ مقصود سے کوسوں دور لیے جاتے ہیں اور صاف دیکھتا ہوں کہ ؎

پیدا ہوئے ہیں یار کے خواہاں نئے نئے
ہندو نئے نئے ہیں مسلماں نئے نئے

تو پھر دہلی کو بھی چھوڑ کر باہر جانا پڑتا ہے اور جو آواز دور سے کوئی نہیں سنتا وہ کان کے پردے کے پاس ہی سے گلا پھاڑ پھاڑ کر سنانا پڑتی ہے اور یہ کام اتنا بڑا ہے اور اس میں اتنا وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور اس میں اتنی جان مارنا پڑتی ہے کہ قارئین ہمدرد کو اس کی اطلاع دینے کی بھی فرصت نہیں ملتی کہ میں کہاں کہاں گیا اور میں نے کیا کیا کیا۔ قارئین کرام مجھے معاف فرمائیں مگر میں ان سے پوچھتا ہوں کہ تاریخ لکھنا اچھا یا تاریخ بنانا۔

یہ میری بدقسمتی ہے کہ تاریخ بنانا بھی مجھی کو پڑتا ہے اور تاریخ لکھنا بھی مجھی کو پڑتی ہے۔ بارہا یہ ہوا ہے کہ دن بھر رفقائے کار کے ساتھ مجلس شوریٰ میں حصہ لیا اور بحث و مباحثے کے بعد بالآخر ان کو قائل کیا اور صحیح راہ عمل تجویز بتائی اور اسی پر انھیں چلوالا اور جب بالآخر وہ تھک کر سو رہے تو تاریخ بنا چکنے کے بعد میں تھکا ہارا تاریخ لکھنے کو بیٹھا اور ساری رات آنکھوں میں گذار دی۔

وہ یہ محنت ہے جس نے صحت سے بھی پورا پورا خراج وصول کر لیا اور اس عمر میں اتنا بوڑھا کر دیا کہ ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

یہ شمع دونوں طرف سے جل رہی ہے جلد جل نہ بجھے تو کیا ہو! اقبال کے ہمنوا تو آج ہزاروں ہیں۔ اگر ان کی جگہ میں ان کے پچھلے کلام کا دلدادہ

ان کا کلام آج دہراؤں تو نامناسب نہ ہوگا۔

من کہ بہرِ دیگراں سوزم چو شمع — بزم خود را گریہ آموزم چو شمع
دل بدوش و دیدہ بر فردا ستم — در میانِ انجمن تنہا ستم
در جہاں یارب ندیم من کجاست — نخلِ سینا یم کلیم من کجاست
ظالم بر خود ستمہا کردہ ام — شعلۂ را در بغل پروردہ ام
شعلۂ غارت گرِ سامانِ ہوش — آتشے افگندہ در دامانِ ہوش
عقل را دیوانگی آموختہ — علم را سامانِ ہستی سوختہ
شمع را سوز عیاں آموختم — خود نہاں از چشم عالم سوختم
شعلہ ہا آخر ز ہر مویم دمید — از رگِ اندیشہ ام آتش چکید
سینۂ عصر من از دل خالی است — می تپد مجنوں کہ محمل خالی است
شمع را تنہا تپیدن سہل نیست — آہ یک پروانۂ من اہل نیست
انتظارے غمگسارے تا کجا — جستجوئے رازدارے تا کجا

من مثالِ لالۂ صحرا ستم
در میانِ محفلِ تنہا ستم

خیر یہ تو پھر وہی فسانۂ غم دل ہے اب کب تک سناؤں۔ اس وقت اس قدر عرض کرتا ہے کہ میں بھی اپنے آکسفورڈ کے کالج لنکن کے مشہور ریاست داں اور مورخ، فلسفی اور ادیب لارڈ مارلے کی طرح اسی کا قائل ہوں کہ ایک ایسی کتاب کے تصنیف کرنے سے جس سے مصنف کا نام ہمیشہ کے لئے زبان زد خلائق ہوجائے یہ بہتر ہے کہ ایک ایسا قانون وضع کردیا جائے جس سے خلق خدا کو امن اور چین نصیب ہوجائے۔ آج ہندوستان کا بھی گوشہ گوشہ دار المصنفین بنا ہوا ہے لیکن باوجود ادعائے ہرفن مولائیت آپ کے اس بھائی نے ایک کتاب

بھی آج تک تصنیف نہیں کی لیکن خدا شاہد ہے کہ جب سے وہ طالب علمی کی زندگی کو خیر باد کہہ کر آیا ہے ملک و ملت کی اصلاح کا کوئی کام ایسا نہیں ہوا ہے جس میں اس نے پورا پورا حصہ نہ لیا ہو اور اس کی کوشش نہ کی ہو کہ خلق خدا کو امن اور چین نصیب ہو جائے۔

مسلمانوں کے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کے تاریخی فیصلے کے بعد سے جو تجاویز دہلی کے نام سے مشہور ہے اس وقت تک یعنی پورے سال بھر اس کی کوشش کی ہے کہ ہندو اور مسلمان، سکھ اور دوسری ملتیں سب اس کو قبول کر لیں اور یہ بین الملل جھگڑے ختم ہو جائیں، سارا ہندوستان متحد اور متفق ہو کر تمام ان وسائل اور ذرائع کو کام میں لائے جن تک آج ہماری دسترس ہے تاکہ اس استبدادی اجنبی حکومت کا خاتمہ ہو اور ہندوستان میں ہندوستانیوں کا راج اور خدا کی بادشاہت قائم ہو اور دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ سات کروڑ مسلمانوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے کم ازکم اس کام میں مجھ سے زیادہ وقت صرف کیا ہو اور مجھ سے زیادہ جان کھپائی ہو۔

جو کانفرنس پورے مہینے بھر تک دہلی میں ہوتی رہی اور جو اب ۱۹ رمئی تک کے لئے ملتوی کر دی گئی ہے اس میں شرکت کے باعث وقت ہی کہاں ملتا تھا جو ہمدرد کی خدمت کر سکتا۔ دوسرے بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کو ظاہر کرنے کا میں مجاز بھی نہ تھا۔ تیسرے یہ کہ قارئین ہمدرد کو اپنی رائے سے بھی مطلع نہ کرنا اس قدر بڑا گناہ نہ تھا جس قدر کہ دوران گفت و شنید میں ایک حرف بھی منہ سے نکال کر ان حضرات کو ناراض کر دیتا جن کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے یہ کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ اب البتہ وقت آیا ہے کہ احتیاط کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں لیکن پھر بھی سخت احتیاط کی ضرورت ہے ؎

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ہم کو تو آزادی کی سخت بھوک لگی ہے اسی نے تو ہمیں یکن گھڑا کر دیا ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں ہر ایک کو راضی کرنا چاہتے ہیں کبھی ٹھنڈی میں ہاتھ ڈالتے ہیں کبھی بے چین اور بے قرار ہو کر چیختے چلاتے ہیں کہ ع

غم درویش بر جان درویش

سے زیادہ اس چیخنے چلانے کی بھی کچھ حیثیت نہیں۔ بھوکے کے لیے ہر شے حلال ہے "ومن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ" لیکن ہمارے بہت کم بھائی آزادی کے اس طرح بھوکے ہیں۔ انھیں موجودہ غلامی میں بھی بہرحال قوت لایموت سے کچھ زیادہ ہی مل جاتا ہے اس لئے جو چیز ہم ان کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ اس پہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اس میں ہزار عیب نکالتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان کھانوں میں کوئی نقص ہی نہیں مگر کریں تو کیا۔ اس وقت اس سے بہتر غذا میسر نہیں اور انگریزی حکومت کی غلامی موہن بھوگ سہی مگر اس میں جو نجاست کی ایک بوند غلاظت کی ایک پھٹک پڑ گئی ہے اس کے بعد جی اسے قبول نہیں کرتا اس لئے آزادی کی بھوک سے تنگ آکر ہم تو پھیکی سیٹھی روکھی سوکھی پر حلال چیز کو قبول کرنے کے لئے آمادہ اور تیار ہیں۔

۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کی تجاویز کو میں ہمیشہ ایک تاریخی فیصلہ کہتا آیا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دن پہلی بار ایک ایسی اسکیم وضع کی گئی ہے جس میں مسلمانوں کے لئے ایک چیز بھی ایسی نہیں مانگی گئی جسے رعایت کہا جا سکے نہ کوئی ایسی چیز ہی طلب کی گئی جو مفاد ملک کے خلاف ہو۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب میں یقیناً وہ تمام خرابیاں نہیں ہیں جو ہمارے ہندو بھائی ۱۹۲۶ء کے انتخابات سے پیشتر ان

میں بتایا کرتے تھے مگر جن کا ذکر اب ہندو مہا سبھا کی سوراج پارٹی کو صوبجات متحدہ اور پنجاب میں شکست دینے کے بعد وہ ذرا دبی زبان ہی سے کیا کرتے ہیں تاہم یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ اگر ہندو مسلمانوں میں ملت اور جاتی کی جنگ چھڑ جائے تو جداگانہ حلقہائے انتخابی کا وجود اس جنگ کو بڑھا سکتا ہے اور بڑھاتا ہے گھٹا نہیں سکتا اور بڑھا نہیں رہا ہے۔ دونوں طرف سے زیادہ تر وہی سورما اور غازی منتخب ہو کر آئیں گے جو دھری ملت یا جاتی کی مخالفت کا بیڑا اٹھا کر آئیں گے۔ کسی صلح جو امیدوار کی کامیابی کی کم امید رہتی ہے تاہم میں کہوں گا کہ مسلمانوں نے صوبجات متحدہ اور پنجاب دونوں میں اپنے جداگانہ حلقہائے انتخاب سے بمقابلہ ہنود کے زیادہ صلح جو امیدواروں کو منتخب کیا۔

دہلی کی تجاویز میں جداگانہ حلقہائے انتخاب سے چند شرائط پر دست برداری کے لیے مسلمانوں نے رضامندی کا اظہار اور اعلان کر دیا تھا اس لیے ان پر کوئی اس کا الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ ایک ایسی چیز پر اڑے ہوئے ہیں جو مفاد ملک کے خلاف ہو۔ منٹو مارلے اسکیم میں ان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے علاوہ مسلمان عام ملکی حلقہائے انتخاب میں بھی شرکت کرتے تھے لیکن سنہ ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ کے میثاق نے اسے بالکل اڑا دیا اور یہی وہ مہلک غلطی تھی جس کے باعث اور وجود سے پھیلتی ہوئی تفریق رک نہ سکی۔ اگر مسلمانوں کو ہندوؤں کے دوش بدوش رائے دینے کا حق بھی حاصل ہوتا جیسا کہ سنہ ۱۹۱۹ء تک انھیں حاصل تھا تو کوئی ہندو امیدوار بھی اس طرح مسلمانوں پر وار نہ کرتا جس طرح ڈاکٹر مونجے اور ان کے ہندو مہا سبھا کے بہت سے ہمنوا آج ان پر وار کر رہے ہیں۔ ناگپور کی طرف سے خود صدر ہندو مہا سبھا مسٹر ابھنکر کے مقابلے میں صرف ۲۵ ووٹ سے جیت کر اسمبلی کے ممبر بنے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو سنہ ۱۹۱۹ء تک کی طرح اب بھی حلقہ ہائے انتخاب میں رائے دینے کا حق ہوتا تو ڈاکٹر مونجے ہرگز

اس صفائی کے ساتھ مسلمانوں کی مخالفت نہ کرتے اور اس طرح خم ٹھونک کر اکھاڑے میں نہ اترتے۔

دوسری مہلک غلطی ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ والے میثاق میں یہ ہوئی کہ چند صوبوں میں چند زیادہ نشستیں لینے کے لئے مسلمانوں نے ہر صوبے میں اپنے تئیں اقلیت میں رکھ دیا۔ اگر دونوں ملتیں مساوی ہوتیں تو مخالفت بڑھ جانے کے وقت جداگانہ حلقہائے انتخاب کا یہ اثر ہوتا کہ دونوں کی تلواریں انتخاب کی سان پر چڑھ جانے کے باعث پہلے سے بھی زیادہ تیز ہوتیں لیکن جب ایک ملت کی اقلیت ہے اور دوسری کی اکثریت تو جداگانہ حلقہائے انتخاب کا صرف یہی اثر ہو سکتا تھا کہ جو ملت اکثریت میں تھی اس کا ڈنڈا اور بھی وزنی ہو جائے اور لوہے سے منڈھ دیا جائے اور جو ملت اقلیت میں تھی اس کا شیشہ اور بھی نازک تر ہو جائے اور ایک ہی وار میں چور ہو جائے۔ لکھنؤ کے میثاق کی ایک ہی غلطی ملک و ملت دونوں کے نقطۂ نظر سے مہلک تھی لیکن اس دوسری غلطی نے تو ملت اسلامیہ کو ہلاک ہی کر ڈالا جب ۱۹۱۹ء کے بعد مانٹیگو چیمسفرڈ اسکیم کے مطابق کونسلوں کے انتخابات ہوئے اور اکثریت کا اقلیت پر زور چلنے لگا تو انھیں مسٹر جناح نے جنھوں نے ہماری نظر بندی کے زمانے میں ہمارے مسلم لیگ سے لکھنؤ کے میثاق کو منظور کرایا تھا وہی اب اس کے خلاف اپنے مسلم لیگ سے لاہور، علی گڈھ اور دہلی سے وہ رزولیوشن منظور کرانے لگے جو میثاق لکھنؤ میں ترمیم و اصلاح کے طالب تھے اب ہر صوبے کی مسلم اکثریت کے لئے کم سے کم ۵۱ فی صدی اکثریت کا مطالبہ شروع ہوا اگر ہر صوبے کی مسلم اقلیت کے لئے اسی تحفظ کا تحفظ کیا جانے لگا جو بنگال اور پنجاب کی مسلم اکثریتوں کو مٹانے کے صلے میں باقی ماندہ صوبوں میں مسلم اقلیت کو عطا ہوا تھا۔

جب ۱۹۱۹ء میں مارلے منٹو اسکیم نے پہلی بار مسلمانوں کو عام حلقہائے

انتخاب میں شرکت کے علاوہ چند نشستوں کے لئے جداگانہ حلقہائے انتخاب بھی دیے تھے تو اسی وقت یہ بھی مسلمانوں پر کرم ہوا تھا کہ ان کی سیاسی اہمیت کا لحاظ کرکے ان کو ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی بھی دی گئی تھی۔ ہنود جداگانہ حلقہائے انتخاب ہی کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان اقلیت بالکل ان کی دست نگرہی چھوڑ دی جائے لیکن جب مسلمانوں کی سیاسی اہمیت کی بنا پر انھیں ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی مرحمت ہوئی تو اس امتیاز کے خلاف ہنود نے سخت شور مچایا۔ حقیقتاً مسلمانوں کی سیاسی اہمیت سیاسی بے وقعتی کے مترادف تھی اس لئے کہ جب امور سلطنت کا فیصلہ اکثریت کے مطابق ہونے لگے تو اقلیت کی خاک اہمیت ہوتی ہے۔ وہ تو اس وقت ذرا بھی وقیع نہیں رہتی۔ سیاسی اہمیت کے اس وقت صرف یہ معنی تھے کہ جس ملت نے باوجود اقلیت میں ہونے کے ہندوستان پر صدیوں تک حکمرانی کی اس کی اتنی اہمیت تو ضرور تسلیم کی جائے کہ اس کی وقعت کو اسے اکثریت کی غلامی میں دے کر خاک میں نہ ملایا جائے۔ Political Importance حقیقتاً Political Impotence کا دوسرا نام تھا۔ لکھنؤ کے میثاق نے بھی اگر مسلمانوں کے چند صوبوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی انھیں عطا کی تو یہ مرحمت خسروانہ نہ تھی بلکہ اس حماقت کی قیمت تھی کہ بنگال اور پنجاب میں اس وقت کی مسلم لیگ نے مسلمانوں کی اکثریت کو ہنود کے ہاتھ بیچ دیا۔ ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ والے میثاق کے بعد کسی ہندو کو ہماری سیاسی اہمیت کی شکایت نہ رہی۔ بہت سے ہنود کی ذہنیت آج تک یہی ہے کہ جہاں جہاں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی ملی ہے وہ ان کے ساتھ رعایت ہے۔

الحمد للہ کہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کی تجاویز میں مسلمانوں کے لئے کوئی رعایت نہیں مانگی گئی اور جو کچھ مانگا گیا وہ یہ تھا کہ اگر صوبہ سرحدی اور سندھ میں جہاں ہندو اقلیت میں ہوں گے ان کو کوئی رعایت درکار ہو تو جہاں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں ان کے ساتھ بھی اسی طرح رعایت کی جائے البتہ مرکزی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کے لئے اتنی رعایت اب بھی طلب کی گئی کہ گو ان کی آبادی ایک چوتھائی ہے ان کو نمایندگی ایک چوتھائی کی دی جائے جس طرح کہ اس وقت بھی انھیں دی گئی ہے۔ یہ تجاویز اتنی معقول تھیں کہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو جس وقت رمضان المبارک میں روزے کے افطار سے چندہی منٹ قبل یہ منظور ہوئیں کہ میرے دل نے گواہی دی کہ اب ہندوستان کا دستور اساسی انشاءاللہ کامل اتفاق کے ساتھ بن سکے گا۔ اور جب ۱۶ مئی کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی ان کو منظور کرلیا تو مجھ فاقہ مست نے سالہائے گذشتہ کے خساروں کی پرواہ نہ کرکے ہمدرد کو ایک سال تک اور قرض دام لے کر نکالنے اور خود بھی تمام سیاسی مجالس میں شرکت کرتے رہنے کا فیصلہ کرلیا اور ہمدرد کی عیدی کی جو رقم عید الفطر سے لے کر عید الضحیٰ تک وصول ہوئی تھی اس کی مقدار کا مطلق لحاظ نہ کیا اور اللہ کا نام لے کر کام کرتا ہی گیا۔

افسوس کہ اگست و ستمبر گذشتہ میں شملہ کی کانفرنس کامیاب نہ ہوئی لیکن اکتوبر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے پھر ہماری تجاویز کو پسند کیا اور دسمبر میں تو مدراس کانگریس نے ایک پوری اسکیم منظور کرلی۔ الحمد للہ کہ مسلم لیگ کے ارکان نے بھی ہمت کی اور باوجود لاہور کے اجتماع کے خوف کے دہلی کی تجاویز سے گریز نہیں کیا۔ اب وہ تجاویز دہلی کی تجاویز ہی نہ تھیں بلکہ کانگریس اور مسلم لیگ کی تجاویز تھیں اور اب پھر امید بندھنے لگی کہ ہندو گی اور جماعتیں بھی ان تجاویز کو منظور

کرلیں گی اور سائمن کمیشن کا مقاطعہ ہی نہ ہوگا بلکہ ہماری گول میز کانفرنس یا ہمارا اپنا سائمن کمیشن متفقہ اور متحدہ طور پر ایک دستور اساسی بنا دے گا جس میں ہر ملت اور ہر طبقے کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا تاکہ اس کو لے کر پوری ہندوستانی قوم اٹھے اور ہندوستان کو غلامی سے نجات دلائے۔

قارئین کرام اس سے تو واقف ہوں گے کہ علاوہ دستور اساسی کی ان پانچ اہم مدات کے جن پر اب تک صرف ایک کمیٹی نے غور کیا ہے کہ (۱) قانون ساز جماعتیں ایک ایوانی ہوں یا دو ایوانی (۲) انتخاب نمائندگان میں رائے دینے کا حق کس کو دیا جائے (۳) شہریوں کے وہ بنیادی حقوق کیا کیا ہوں جن کا لحاظ دستور اساسی میں کیا جائے تاکہ ان کا ہمیشہ ہمیشہ پوری طرح تحفظ کیا جا سکے (۴) مزدوروں اور کاشت کاروں کو جو ایک کمزور طبقہ ہونے کی وجہ سے برابر رگڑے اور دلے جاتے رہے ہیں کیا خاص حقوق دلے جائیں جن سے ان کا تحفظ ہو سکے اور (۵) ہندوستانی ریاستوں سے ہندوستان کی عام حکومت کا کیا تعلق ہو۔ دستور اساسی کی جو مدات کانفرنس میں زیر بحث رہیں وہ زیادہ تر دہلی کی تجاویز تھیں جواب کانگریس اور مسلم لیگ کی منظور شدہ تجاویز ہیں۔ یہ بھی قارئین کرام کو معلوم ہو گا کہ زیادہ تر بحث سندھ کی حلقہ بمبئی سے علیحدگی پر ہی ہوتی رہی یا پھر آخر میں صوبۂ پنجاب میں اکثریت کے لئے بھی نشستوں کے تعین کے متعلق تھی جس کی مخالفت نہ صرف ہندو مہاسبھا کی طرف سے ہوئی بلکہ سکھوں کی طرف سے بھی ہوئی۔

کانفرنس اب دو ماہ بعد انشاء اللہ پھر منعقد ہو گی اور اس عرصے میں دو کمیٹیاں ان دو امور پر غور کر رہی ہیں (۱) سندھ اپنے اخراجات کا بوجھ خود اٹھا رہا ہے یا نہیں اور اگر کم از کم اس وقت وہ اپنا بوجھ خود نہیں اٹھا رہا ہے تو آگے

حل کر بھی اٹھا سکے گا یا نہیں (۲) اکثریتوں کے لیے نشستوں کا تعین نہ بھی کیا جائے تب بھی تناسب نمایندگی کے طریقے (پنجاب وغیرہ) میں مسلمانوں کی حقیقی نمائندگی کا تحفظ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ جب تک ان دونوں کمیٹیوں کی رپورٹیں تیار نہ ہو جائیں آیندہ کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا ایک جوتشی کی پیشین گوئی سے بھی زیادہ ہمت کا کام ہو گا لیکن جو چیزیں اس وقت خود میرے سامنے ہیں اور جن پر میں خود غور کر رہا ہوں ان کو قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا نامناسب نہ ہو گا تاکہ وہ بھی ان پر غور کر سکیں اور مجھے مدد دے سکیں۔ اگر میں صحیح راستے پر جا رہا ہوں تو میری ہمت افزائی کریں اور اگر غلط راستے پر جا رہا ہوں تو مجھے ہدایت فرمائیں۔

امور متنازعہ فیہ میں سے الحمدللہ صوبہ سرحدی تو اب نکل گیا۔ ہندو مہاسبھا کی طرف سے باضابطہ اب تک اس کے متعلق بھی اطمینان بخش جواب نہیں ملا ہے۔ کانفرنس کی ساری جماعتیں اس پر متفق ہیں کہ سرزمین ہندوستان کا ایک چپہ بھی ایسا نہ ہو جہاں کے شہری پوری طرح آزاد اور خود اپنے اوپر حکمراں نہ ہوں۔ اس لیئے نہ صرف صوبہ سرحدی اور بلوچستان کے لئے نئے دستور اساسی میں بالکل وہی جگہ رکھی گئی ہے جو دوسرے صوبجات کے لیے رکھی گئی ہے بلکہ دہلی اجمیر میرواڑ کرگ اور اضلاع مندرجہ جدول اور ان صوبوں کے لئے بھی جو دوسرے صوبوں کو توڑ کر بنائے جائیں بالکل وہی جگہ رکھی گئی ہے۔ البتہ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے اور یوں بھی بارہا سنا گیا ہے کہ ہندو مہاسبھا کی ایک بڑی پرجوش جماعت اب تک صوبۂ سرحدی کو سرزمین بے آئین بنائے رکھنے پر تلی ہوئی ہے اور جبل پور میں ہندو مہاسبھا کا جو سالانہ جلسہ ہونے والا ہے اس میں بھی اسی پر زور دے گی۔ مجھے امید ہے کہ صوبجات متوسط ... کے کانگرسی ہندو خصوصاً اسے مہاسبھا کو جبل پور

میں دعوت دی ہے اس جماعت کو کامیاب نہ ہونے دیں گے اور اپنی حریت پسندی، حب وطن اور بے تعصبی کا پورا ثبوت دیں گے لیکن اگر اس پر بھی ہندو مہا سبھا اسی پر اڑی رہے گی تو یقیناً سارے ہندوستان کو اور سارے برطانوی سامراج کو بلکہ ساری دنیا کو وہ اپنی تنگ نظری، اپنے تعصب اور اپنی نادانی اور عدم تدبر کا ثبوت دے گی اور انسانوں کے نزدیک اور پرماتما کے نزدیک وہ ہندوستان کی مزید غلامی کی ذمہ دار ہوگی۔ جو تقریر لالہ لاجپت رائے نے بجٹ پر بحث کے دوران میں کی ہے اور جس طرح اس پر ڈاکٹر مونجے تک نے سراہا ہے اس سے تو امید کی جاتی ہے کہ اب ہندو مہا سبھا کی وہ پُرجوش اور تنگ خیال جماعت جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہ بھی شاید اس طرز عمل سے تائب ہو جائے اور بہرحال خاسر و ناکام رہے۔

رہا صوبہ سندھ کی حلقہ بمبئی سے علیحدگی کا مسئلہ تو خود سندھ میں ہنود کی ایک ایسی جماعت اپنی آواز بلند کرنے لگی ہے جو اس علیحدگی کی طالب ہے۔ سندھ ہمیشہ ایک علیحدہ صوبہ رہا، اس کی زبان جدا، اس کا موسم جدا، اس کے باشندوں کا لباس اور طرز ماند و بود جدا، اس کی تاریخی روایات جدا۔ صرف اس لئے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے چلتے چلتے ۱۸۴۲ء میں اسے بھی غلام بنا لیا اور چونکہ پنجاب اس وقت تک برطانوی ہند میں شامل نہیں ہوا تھا بلکہ اس پر یہ مصیبت سات برس بعد ۱۸۴۹ء میں آنے والی تھی اس لئے وہ حلقہ بمبئی میں شامل کر دیا گیا ہے اور آج تک شامل ہے حالانکہ ایک طرف سمندر اور دوسری طرف صحرا اسے بمبئی حلقے کے اور ٹکڑوں سے جدا کرتے ہیں۔ صوبہ سندھ کی علیحدگی جن ہنود کو ناگوار ہے وہ زیادہ تر اسی تنگ خیال، متعصب اور تدبیر سے محروم جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جسے یہ گوارا نہیں کہ صوبہ سرحدی، پنجاب سے جدا ہی رہے اور وہ اسی طرح

آزاد صوبہ بھی ہو جس طرح اور صوبجات آزاد ہیں۔ دونوں جگہ ایک ہی چیز سنگ راہ ہے اور وہ یہ کہ ہندوؤں کی ایک متعصب اور تنگ خیال جماعت یہ نہیں چاہتی کہ وہ کسی صوبے میں بھی حقیقی اقلیت میں رہیں۔

بار بار یہ جماعت پوچھتی ہے کہ سندھ کی علیحدگی یا صوبہ سرحدی کی آزادی کو جداگانہ حلقہائے انتخاب سے مسلمانوں کی دست برداری کو کیا تعلق؟ اس تجاہل عارفانہ پر طبیعت کو قابو میں رکھنا بعض وقت مشکل ہو جاتا ہے۔ میں بار بار جواب دے چکا ہوں اور اب پھر دیتا ہوں کہ حقیقت یہ ہے کہ آج تک ہندوستان میں اکثریت کی حکومت نہیں ہوئی نہ اشوک کے وقت میں، نہ بکرماجیت کے عہد میں، نہ محمود غزنوی کے زمانے میں، نہ محمد غوری کے دور میں۔ نہ پرتھوی راج کی سلطنت اکثریت کی تھی، نہ اکبر کی، نہ اورنگ زیب کی، نہ سیواجی کی، نہ رنجیت سنگھ کی، نہ آج لارڈ اروِن کی حکومت ہی جو ابھی اسمبلی کی اکثریت کے سارے فیصلوں کو سرٹیفکیشن کے ذریعے سے رد کر چکی ہے اور سائمن کمیشن کو اکثریت کے مخالفانہ مظاہروں کے باوجود ہر جگہ بھیج رہی ہے اور جو ویٹو کے ذریعے ہماری اکثریت کے منظور کردہ قوانین کو نافذ ہونے سے روک سکتی ہے۔ آج پہلی بار وہ دستور اساسی بنا رہے ہیں جس میں نہ سرٹیفکیشن کا کسی کو اختیار ہوگا نہ ویٹو کا، بلکہ ہر فیصلہ اکثریت ہی کے مطابق ہوگا۔ پھر اس بدعت حسنہ کی ابتدا کے وقت اگر ایک جاتی جسے برطانوی ہند میں بھی ۶۶ فیصدی اکثریت حاصل ہے اسی دستور اساسی پر پوری طرح مطمئن ہو لیکن ایک اور ملت جو باوجود اس سے بھی حقیر تر اقلیت کے ہندوستان پر صدیوں حکومت کر چکی ہو اور جو ۲۵ فی صدی کی اقلیت میں ہو اس پر پوری طرح مطمئن نہ ہو تو تعجب کی کونسی بات ہے؟ صوبہ سرحد کی آزادی یوں بھی واجبی ہے اور اس طرح اس کی علیحدگی بھی۔ لیکن اس کی علیحدگی قائم رکھنے پر اصرار اور پنجاب کے ساتھ اس کے دوبارہ

الحاق سے انکار اور سندھ کی علیحدگی کا مطالبہ مسلمان اس لئے بھی کر رہے ہیں کہ ان پر ثابت ہو کہ ہندو بھی اقلیت میں رہنے پر کہیں پر تو راضی ہیں۔ جب تک یہ نہیں ہوگا ہندو مسلمانوں میں اتفاق ناممکن ہے اور اگر بلا اتفاق کے ہندوستان کی اس غلامی سے نجات بھی ناممکن ہے تو ہندوستان کی آزادی بھی ناممکن ہے۔ کل انشاء اللہ میں پنجاب کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے متعلق بھی کچھ عرض کروں گا۔ قارئین کرام انتظار فرمائیں۔

(۲) سندھ کی علیحدگی

صوبۂ سرحد و بلوچستان کی حکومت خود اختیاری

مہا سبھائی ذہنیت کا مظاہرہ

ہمدرد ۲۰ مارچ ۱۹۲۸ء

ہمدرد مورخہ ۲۲ مارچ میں اس عنوان سے جو مضمون شائع ہوا تھا اس میں چند ان اہم ترین مسائل کی مختصر سی تاریخ بھی دی گئی تھی جو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان متنازعہ فیہ ہیں تاکہ قارئین کرام ان کے متعلق خود بھی صحیح رائے قائم کر سکیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اخبار پڑھنے والا طبقہ مضمون نگاروں کی غلطی سے متاثر ہو کر نہایت پرجوش الفاظ میں ان کی تائید کرنے لگتا ہے اور ان میں بہت جلد سیاسی فرقے بن جاتے ہیں لیکن مسائل متنازعہ فیہ کے من وعن کے نہ یہ مضمون نگار خود ہی واقف ہوتے ہیں، نہ اپنے مضامین کے پڑھنے والوں ہی کو واقف کر سکتے ہیں۔ ع

اوخویشتن گم است کرا رہبری کند

جس طرح ہر شخص چاہتا ہے کہ سارے جہان کو اپنا ہم خیال بنائے اسی طرح میں بھی اس کا متمنی ہوں کہ لوگ مجھ سے اتفاق کریں لیکن میں ہرگز نہیں چاہتا کہ لوگ اندھا دھند میری تقلید کرنے لگیں اور بھیڑ چال میرے ہی پیچھے چلیں۔ میری زندگی کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ لوگ اس طرح میرے پیرو اور مقلد

بن جائیں ۔ اس قسم کی کامیابی درحقیقت میری سب سے بڑی ناکامی اور نامرادی ہوگی۔ میری کامیابی تو اس میں ہے کہ لوگ سمجھ سوچ کر خود ہی فیصلہ کرنے کے خوگر بن جائیں اور اس کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر لیں اور اگر اس کے بعد وہ میرے ہم خیال بھی بن جائیں تو "ذٰلک الفوز العظیم"۔ اپنی رائے کو پرجوش اور متاثر الفاظ میں پیش کرنا مجھے آتا ہے اور میں بھی اس طرح لوگوں کو اپنا پیرو بنا سکتا ہوں لیکن بقولِ غالب ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

میں دلائل و براہین سے نہ کہ صرف پرجوش اور موثر الفاظ سے قارئین کرام کو قائل کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے مضامین میں طوالت ہو جاتی ہے۔ دہلی کی ان تجاویز کی تائید میں جو ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو خداوند کریم نے ہم کو سجھا دیں، میں متعدد طول وطویل مضامین شائع کر چکا ہوں اور ہمدرد کے معاصرین کے پاس بھی انھیں خاص طور پر ارسال کر کے ان کی خدمت میں درخواست کر چکا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو ان کو اپنے کالموں میں بھی جگہ دیں تاکہ ان کے قارئین کرام کو بھی ان تجاویز کے حسن و قبح پر غور کرنے کا موقع ملے اور وہ خود بھی غور و خوض فرما کر ان پر تبصرہ کریں لیکن اب جبکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی منعقدہ بمبئی نے ۱۶ مئی ۱۹۲۷ء کو اور مدراس کی کانگریس اور کلکتہ کی مسلم لیگ نے بھی ان کو منظور کر لیا اور دہلی میں سیاسی فرقوں کے شوریٰ میں ہندو مہاسبھا کے تنگ نظر ارکان کے علاوہ باقی سب نے انھیں یا تو منظور کر لیا یا بہ نظر استحسان دیکھا۔ میں نے پھر اس عنوان والے پہلے مضمون میں ان امور سے بحث کی جنھوں نے ہمیں ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو مجبور کر دیا تھا کہ ہندوستان اور مسلمانان ہندوستان دونوں کے مفاد کے خیال سے ان تجاویز ہی پر متفق ہو جائیں۔

ہندو مہا سبھا کے تنگ نظر ارکان تجاہل عارفانہ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ صوبہ سرحدی اور بلوچستان کو حکومت خود اختیاری دینے اور سندھ کو حلقہ بمبئی سے علیحدہ کرنے کو مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قائم کرنے سے کیا تعلق ہے، اس کا جواب پہلے بھی دے چکا ہوں اور پچھلے مضمون میں بھی میں نے اس کا جواب دے دیا ہے اور وہ یہی ہے کہ آج تک ہندوستان میں امور سیاسی کا فیصلہ کثرت رائے پر منحصر نہ تھا۔ نہ ہندو راجاؤں کی یہ راج نیتی تھی نہ مسلمان بادشاہوں کی، نہ اکبر کی نہ اورنگ زیب کی نہ سیواجی نہ رنجیت سنگھ کی اور نہ آج برٹش گورنمنٹ نے اسے ہندوستان کے دستور اساسی میں شامل کیا ہے۔ اب تک سب کا حافظ کے اس شعر پر عمل رہا ہے کہ؎

امور سلطنت خویش خسرواں دانند
فقیر گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

آج بھی اسمبلی کی کثرت رائے کے مطابق امور سلطنت کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ جس چیز کو اسمبلی منظور کر دے اسے "ویٹو" کے ذریعے سے وائسرائے بیک جنبش قلم مسترد کر دیتا ہے اور جسے اسمبلی مسترد کر دے اسے وائسرائے بیک جنبش قلم منظور کر کے اپنے سرٹیفکیٹ یعنی فرمان واجب الاذعان کے ذریعے سے سارے ہندوستان سے منوا لیتا ہے۔ سوراج کے یہی معنی ہیں کہ نہ ویٹو کا یہ اختیار کسی کو حاصل ہو نہ سرٹیفکیشن کا، بلکہ باشندگان ہندوستان کے نمایندوں کا جو فیصلہ ہو وہی سارے ہندوستان میں جاری و ساری ہو اور آج کل کی دنیا کے دستور کے مطابق۔ اسی کو ہندوستان کا فیصلہ کہا جا سکتا ہے جو باشندگان ہندوستان کے نمایندوں کی اکثریت کا فیصلہ ہو لیکن یہ فیصلہ سب کو اسی وقت قبول ہو سکے گا جبکہ سب کو یقین ہو کہ یہ کل باشندگان ہندوستان کے مفاد کا خیال رکھ کر کیا گیا ہے۔ اگر ملتوں اور جاتیوں کے تعصبات کا دور دورہ ہو اور ایک ملت یا جاتی کی اکثریت ہو اس کے فیصلے پر باقی ملتیں اور جاتیاں کیوں کر

اعتماد کر سکیں گی کہ اس کا یہ فیصلہ تعصبات ملی پر مبنی نہیں بلکہ سب ملتوں اور جاتیوں کے مفاد کا خیال رکھ کر کیا گیا ہے۔

یقیناً ہندو جاتی سارے عالم میں اپنی تنگ نظری میں نمایاں ہے۔ دنیا بھر میں کسی ملت نے خود اس تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ خود اپنے ہی فرقوں کو اچھوت سمجھا ہو۔ صدیوں سے سب ہندو نہ ایک دوسرے کو بیٹی دے سکتے ہیں نہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھا سکتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ سب ہندو ایک مندر تک میں یکجا نہیں ہو سکتے نہ سب جگہ سب کے لئے عام سڑکیں ہی کھلی ہوئی ہیں۔ جو جاتی اس درجے خود غرضی کا شکار ہو اسی پر دوسری ملتیں کس طرح اعتماد کر سکتی ہیں۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اس قدر فرقہ بندی کا سبب نہیں ہے جس قدر کہ ہنود کی فرقہ بندی خود ان کا سبب بنی۔ وہ فرقہ بندی کا سبب بننے سے کہیں زیادہ ہنود فرقہ بندی کا نتیجہ ہیں۔

اب جبکہ گذشتہ چند سالوں کے تلخ تجربے کی بنا پر ہندوستان پر یہ بات روشن ہو گئی کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اس فرقہ بندی کو کم نہیں کرتے بلکہ اسے اور بھی بڑھا رہے ہیں اور پائدار کر رہے ہیں اور مسلمانوں کی اقلیت انھیں اس فرقہ بندی کے ذریعے سے اور بھی تباہ و برباد کر رہی ہے اور مناسب یہی ہے کہ ان کا خاتمہ کیا جائے اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب ان کی جگہ قائم ہوں تو ضرورت اس کی ہے کہ برطانوی حکومت کے پنجے سے نکل کر ہندوستان کی عنان حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں جائے ان پر ہر ملت اور ہر جاتی اعتماد کر سکے کہ یہ تو فرقہ بندی اور ملی تعصبات اور تنگ نظری کے مرض میں مبتلا نہیں ہیں۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے تو وہ خود اپنی بے تعصبی اور فراخدلی کا ثبوت دیں۔ صوبہ سرحدی اور بلوچستان کی آزادی کی مخالفت کر کے ہندو قائدین نے

ک اسی کا ثبوت دیا ہے کہ وہ خود متعصب اور تنگ نظر اور تنگ دل ہیں الحمدللہ
ب ان کو کسی قدر اس کی سمجھ آئی اور لالہ لاجپت رائے کی اسمبلی کی حال کی
ر اور ڈاکٹر مونجے کے تائید کے طور پر سر ہلانے سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ اب
و مہاسبھائیوں کو بھی یقین ہو چلا ہے کہ رائے عامہ اس معاملے میں سراسر
کے خلاف ہے۔ دیکھیے جبل پور میں ہندو مہاسبھا کا سالانہ جلسہ کیا فیصلہ کرتا ہے
انوی حکومت کے گرگے اور وہ ہندو نیتا جو ہندوستان کی آزادی کے حصول
ے کہیں زیادہ اپنی سرداری کے قیام کے خواہاں ہیں اور وہ ہندو جو ایسے غدار
ی نہیں ہیں نہ ایسے خود غرض ہیں لیکن تعصب اور تنگ دلی نے انھیں اس طرح
قان کے مرض میں مبتلا کر دیا ہے کہ انھیں کوئی چیز اپنے حقیقی اور اصلی رنگ میں
ظر نہیں آتی۔ دیکھیے ان کی فتح ہوتی ہے یا ان ہندوؤں کی جو اب غلامی سے تنگ
آ گئے ہیں اور ضد اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لے کر بلکہ انصاف کو اپنا شعار بنا کر
سارے ہندوستان کو آزادی دلانا چاہتے ہیں خواہ کسی صوبے میں ان کی اقلیت
ہی کیوں نہ ہو۔

ہندو قائدین کی دوسری آزمائش سندھ کی علیحدگی کے مطالبے کے بعد
ہوئی۔ اگر ہندو چاہتے ہیں کہ مسلمان ان کی اکثریت پر اعتماد کریں تو وہ اس
معاملے میں اپنے طرز عمل سے ثابت کریں کہ وہ مسلم اکثریت پر بھی اعتماد کرنے کو
تیار ہیں۔ ان دونوں متنازعہ فیہ مسائل کا براہ راست ہندوستان کے دستور اساسی
کے پہلے اصول سے تعلق ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار تمام امور سلطنت
کا فیصلہ آئندہ کثرت رائے سے ہوا کرے گا۔

صوبہ سرحدی سنہ ۱۹۰۲ء سے ایک علیحدہ صوبہ ہے مگر اس کے باشندوں ک[و]
کثرت رائے سے کسی چیز کے فیصلہ کرنے کا ابھی آج تک اختیار نہیں۔ یہی حال

بلوچستان کا بھی ہے۔ چونکہ یہاں مسلمان اکثریت میں ہیں جس طرح مدراس صوبجات متوسط اور بہار واڑلیہ وغیرہ میں ہندو اکثریت میں ہیں اس لئے اس سرزمین کو سرزمین بے آئین رکھا جا رہا ہے اور امور سلطنت کا فیصلہ اسی انگریزی حکومت کے ہاتھ میں چھوڑنا پسند ہے جس کی اس قدر برائی کی جاتی ہے (اور بجا طور پر کی جاتی ہے) اور امور سلطنت کا فیصلہ اس کے باشندوں کی اکثریت کے ہاتھ میں چھوڑنا گوارا نہیں۔ ہاں اگر وہ دوبارہ صوبہ پنجاب میں مدغم ہو کر مسلمانوں کی ۹۲ فی صدی اکثریت کو گھٹا کر پنجاب کے "پچونجا" میں کھو بیٹھے تو پھر اس کے باشندوں کو بھی وہی حقوق دے دیئے جائیں گے جو پنجاب والوں کو دئے جا چکے ہیں یا دیئے جائیں گے۔ سندھ والوں کو وہی حقوق حاصل ہیں لیکن آج وہاں کی مسلمانوں کی اکثریت سندھ کے گجرات یا مہاراشٹر میں مدغم ہو جانے سے اقلیت بنی ہوئی ہے اس لئے سندھ کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہندو نیتاؤں کی یہی ذہنیت رہی تو کیا مسلمان اقلیت ان پر اعتماد کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ صوبہ سرحدی و بلوچستان کے متعلق تو ہزاروں بہانے بنانے کے بعد بھی ہندو سبھائی نیتا آج مجبور ہو گئے کہ ان کو آزادی دلانے کی مخالفت کرنا اپنے تعصب اور اپنی تنگ نظری کو عالم آشکار کرنا ہے۔ لیکن ابھی سندھ کی علیحدگی کے خلاف بہانے بنائے جا رہے ہیں۔ گو مجھے یقین ہے کہ یہ بھی صرف چند روز ہوتا رہے گا اس کے بعد اس بارے میں بھی ان ہندو نیتاؤں کو یقین ہو جائے گا کہ یہ بہانے بازی خود ان کے تعصب اور ان کی تنگ دلی کا دنیا بھر میں ڈھنڈھورا پیٹ دے گی۔ صوبہ سرحدی کے متعلق تو زیادہ پٹھانوں کی جہالت، ان کی بدمزاجی اور دراز دستی وغیرہ کو پیش کیا جاتا تھا یا مدراس کے سورما جنگی نقطہ نظر سے ہم شمالی ہندوالوں کو درس دیا کرتے تھے

اور بتاتے تھے کہ ہندوستان کے تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سرحدوں پر مرکزی حکومت ہی براہ راست انتظام قائم رکھے۔ صوبہ سرحد کی مالی حالت کے متعلق بھی باصرار کہا جاتا تھا کہ وہ بنجر زمین اس کے اخراجات کی کفالت نہیں کرسکتی اور جب اس کے اخراجات کے کفیل اور ہیں تو اسے حکومت خود اختیاری کس طرح دی جاسکتی ہے۔ لیکن اس مالی نقطۂ نظر پر کہیں زیادہ اصرار سندھ کی علیحدگی کی بحث میں کیا گیا ہے۔

سندھ کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کبھی ایک علیحدہ صوبہ نہیں رہا ہے تاریخی حیثیت سے وہ ایک علیحدہ ملک کی طرح رہ چکا ہے اور آج بھی انتظامی طریقے پر وہ بمبئی سے علیحدہ ہی ہے۔ اس کی جغرافیائی حیثیت گجرات اور مہاراشٹر سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہ حلقۂ بمبئی سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہے اور ایک طرف صحرا اور دوسری طرف سمندر اسے حلقۂ بمبئی سے جدا رکھتے ہیں۔ اس کی زمین، اس کا موسم، اس کی نباتات بالکل جداگانہ ہیں۔ اس کے باشندوں کی زبان اور ان کا طرز بود و ماند بالکل جداگانہ ہے۔ حلقۂ بمبئی میں جو چیز اس کو شامل کئے ہوئے ہے وہ سوائے برطانوی غلامی کے حلقے کے کچھ نہیں۔ اس پر بھی اگر وہ ۱۸۴۳ء میں اس حلقۂ غلامی کو اپنے گلے میں نہ ڈال چکا ہوتا جب کہ پنجاب اس حلقۂ غلامی سے محفوظ تھا اور بجائے اس کے ۱۸۴۹ء کے بعد جب کہ یہی حلقہ پنجاب کے گلے میں بھی ڈالا گیا اس کا قلمروئے برطانیہ میں داخلہ ہوا ہوتا تو وہ یقیناً بجائے بمبئی کے پنجاب میں شامل کیا گیا ہوتا۔ حلقۂ بمبئی میں شمول کے باعث اس کے انتظامات میں ہزاروں خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کی شکایت سندھ کے ہنود سے زیادہ کسی نے نہیں کی۔ حلقۂ بمبئی کے بڑے بڑے عہدے اور جن کی تنخواہوں پر سندھ کے باشندوں کا بھی لاکھوں روپیہ صرف ہو رہا ہے

بہت کم وقت سندھ میں صرف کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سندھ کے نشو ونما پر ہرگز اتنا روپیہ صرف نہیں کیا جاتا تھا کہ حلقۂ بمبئی کے دوسرے حصوں اور بالخصوص شہر بمبئی پر کیا جاتا ہے۔ "بیک بے" پر جو کروڑوں روپیہ پھینکا گیا اس سے کون واقف نہیں؛ بمبئی کے بندر پر جتنا روپیہ صرف کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ اس روپے کا بندرگاہ کراچی مستحق تھا۔ یہ بمبئی کے مقابلے میں یورپ سے بقدر دو دن کی مسافت کے قریب تر ہے اور اگر بمبئی پہلے سے "باب الہند" نہ بنا دیا گیا ہوتا تو کراچی ہی آج باب الہند ہوتا۔ سندھ کو مواصلات یعنی سڑکوں اور ریلوں کی جس قدر ضرورت ہے وہ ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جسے اس کے ریتیلے راستے طے کرنے پڑے ہوں لیکن شہر بمبئی کو ریلوں کے دھوئیں سے بچانے کے لئے کروڑوں روپیہ بجلی کی ریل چلانے پر صرف کر دیا گیا لیکن غریب سندھ اب تک دُخانی ریلوں کے دھوئیں سے بھی محروم ہے۔

خدا خدا کرکے محکمۂ زراعت کو اب اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور محکمۂ آبپاشی نے اب جاکر کہیں سکھر کے بند کی تجویز کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا ہے گو اب یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ جہاں چراغ کے تلے ہی اندھیرا ہو اور انجنیری کے محکمے والوں نے بمبئی گورنمنٹ کی ناک کے نیچے ہی "بیک بے" اسکیم کے سلسلے میں وہ کچھ کیا ہو جو ہاروی اور نریمان کے مقدمے میں ظاہر ہوا ہے تو نہ معلوم بمبئی سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر کیا کچھ نہ ہوگا یقیناً سندھ کے ریگستان کو آبپاشی اور فلاحی گلستان بنا سکتی ہے لیکن سندھ کے وہی ہندو بنیا جو آج تک یہی گلے شکوے کئے جاتے تھے آج صرف اس وجہ سے حکومت بمبئی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور اس کے شکریے اور اس کی تعریف کے قصیدے سنائے جاتے ہیں کہ کہیں سندھ کو بمبئی کی غلامی سے نجات نہ مل جائے اور بجائے برطانوی

Back Bay ۱

غلامی کے سندھ کو ان مسلمانوں کی اکثریت سے سابقہ نہ پڑے جو محمد بن قاسم رح کی حجازی فوج کی اولاد ہیں، یا ان کی جو ان مبلغین اسلام کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے۔ ایک طرف تو مسلمانوں سے شکایت کی جاتی ہے کہ تم ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے اور دوسری طرف ان مسلمانوں سے جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا یا جو ان ہنود کی اولاد ہیں جنھوں نے سب سے پہلے ان کی قدر پہچانی اس قدر مغائرت ہے۔

خیر یہ تو سب کچھ ہے مگر ذرا اس بہانے پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جو سندھ کی علیحدگی کی مخالفت میں بنایا گیا ہے۔ جب تک اعداد سے دلیل و برہان کا کام زیادہ نہیں لیا جاتا تھا تو ایک ماہر علم الاعداد نے خوب کہا تھا کہ انسان جھوٹ بولا کرتے ہیں مگر اعداد جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ لیکن اب جبکہ اعداد کو دلیل و برہان کے طور پر پیش کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے انسان کوئی جھوٹ ایسا نہیں بولتا جس کی تائید میں اعداد کی جھوٹی شہادت پیش نہ کرائی جاتی ہو۔ آج سندھ کی علیحدگی کے خلاف بھی اعداد سے طرح طرح کی جھوٹی گواہیاں دلوائی جا رہی ہیں۔ دہلی کے سندھی پروفیسر چھابلانی جو علم الاقتصاد کے ماہر ہیں اور دہلی کے ہندوستان ٹائمز کے سابق سندھی اڈیٹر سری جیت جے رام داس دولت رام کے دست راست ہیں اور برابر وہ مضامین شائع کر رہے ہیں اور وہ پمفلٹ نکال رہے ہیں جن کے ذریعے سے سندھ کی علیحدگی قیامت کبریٰ سے بھی بڑھ کر مصیبت تسلیم کرائی جا سکے۔ میں اس وقت ان مضامین اور پمفلٹوں کا جواب نہیں دے رہا ہوں گو میں پروفیسر چھابلانی صاحب کی اس قدر تعریف ضرور کروں گا کہ یقیناً ان کے مضامین خواہ وہ کتنی ہی تنگ نظری اور کتنے ہی تعصب کا ثبوت دیتے ہوں ان کی قابلیت اور ہوشیاری کا بھی ثبوت

دیتے ہیں اور وہ یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ ان کا سنجیدگی کے ساتھ تبصرہ کیا جائے ۔ کسی سندھی ہندو نے ان سے زیادہ قابلیت کا اس سلسلے میں ثبوت نہیں دیا ہے گو اچاریہ گڈوانی اور اچاریہ کرپلانی جیسے قابل سندھی بھی ان سے کسی طرح کم تنگ نظری کا ثبوت نہیں دے چکے ہیں۔

پروفیسر چھابلانی نے سر ہنری لارنس بمبئی کے سابق رکن حکومت اور وزیر مالیات کے بیان سے جو انھوں نے کوئی پانچ برس ہوئے بمبئی کونسل میں دیا تھا اعداد دے کر اور اپنی طرف سے آیندہ کے مزید اخراجات کا تخمینہ دے کر اور اندازہ کرکے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ سندھ اس وقت اپنے اخراجات کی خود کفالت نہیں کرسکتا اور بہ ظاہر آیندہ بھی مدتوں تک نہیں کرسکے گا۔ سندھ کے موجودہ اخراجات اور اس کی موجودہ آمدنی کے لئے صحیح اعداد کیا ہیں؟ اور آیندہ کے مزید اخراجات کا اور آیندہ بڑھنے والی آمدنی کا صحیح تخمینہ اور اندازہ کیا ہے۔ ان سب امور پر وہ کمیٹی غور کرے گی جس میں سندھ کے ہندو اور مسلمان دونوں شریک کئے گئے ہیں۔ یہ کمیٹی اس پر بھی غور کرے گی کہ اگر آج سندھ اپنے اخراجات کی کفالت نہیں کرسکتا تو کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ آیندہ ایسا کرسکے ۔

جس چیز کی طرف میں اس وقت توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ فرض کر لیجئے سندھ آج اپنے اخراجات کی کفالت نہیں کرسکتا یا تاقیامت بھی ان کی کفالت نہ کرسکے گا پھر کیا اگر ہندوستان کے ہر ٹکڑے کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اخراجات کی کفالت خود کرے اور سندھ ایسا نہیں کرسکتا تو سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ خدا سے دعا کی جائے کہ وہ اس کنگال دوسروں کے دست نگر حصۂ ملک کو ایک نیا طوفانِ نوح کراچی کے بندرگاہ سے لاکر غرق کردے یا دریائے سندھ ہی میں وہ طغیانی آئے کہ اس نام کا ریگستانی ملک بھی ڈوب جائے اور صحرا مبدل بہ دریا ہو جائے۔

جس قطعے کے لیے جائز نہیں کہ وہ ہندوستان کے مرکزی خزانے سے کچھ امداد لے کر گذر اوقات کر سکے اور اس کی شرم کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے اخراجات کی خود کفالت نہ کر سکے تو علیحدہ صوبہ بنائے جانے کا بھی مطالبہ نہ کرے۔ اس کے لیے یہ کب جائز ہے کہ وہ بڑا بڑا گجرات اور مہاراشٹر کی روٹیاں توڑا کرے؟ اس کے لیے یہ تو جائز ہے کہ حلقہ بمبئی میں شامل رہ کر سکھر کے بند کے لیے کروڑوں روپیہ ہندوستان کی مرکزی حکومت سے قرض لے لیکن یہ جائز نہیں کہ اس قرضے کو خود اپنے نام منتقل کرے؟ وہ بمبئی کی "بیک بے" اسکیم کے لیے کروڑوں کے قرضے کی ادائگی کی ذمہ داری تو گجرات اور مہاراشٹر کے ساتھ مل کر لے سکتا ہے لیکن اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر جس سے اسے کوئی بھی فائدہ نہیں اور سراسر نقصان ہے وہ سکھر کے بند کے قرضے کی ذمہ داری بلا شرکت غیرے نہیں لے سکتا جس سے اسے توقع ہے کہ وہ مالامال ہو جائے گا۔ یہ نیا علم الاقتصاد ہے اور پروفیسر چھابلانی اس کے خاص ماہر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور گو مجھ سے زیادہ کوئی بھی اس کا خواہاں نہیں کہ اس کے مختلف صوبجات کی حکومت کو بتدریج زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں تاکہ مختلف صوبجات کے باشندے ان کے انتظامات میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں اور ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں اور میں نے اس سب کمیٹی میں جو دستور اساسی کے بعض اہم ترین مسائل کے حل سوچنے کے لیے ابھی بیٹھی تھی اس مسئلے پر غور کرتے وقت کہ فلاں اختیارات صوبجات کی کونسلوں کو دیے جائیں یا مرکزی مجالس قانون سازی کے لیے محفوظ رکھے جائیں زیادہ تر صوبجات ہی کی کونسلوں کے حق میں رائے دی۔ تاہم مجھ سے زیادہ اس سے کوئی بھی خائف نہیں ہے کہ کہیں مختلف صوبجات بالکل مطلق العنان نہ بن جائیں، جس طرح سلطنت مغلیہ میں اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مختلف صوبے دار اور ادیب

صدی عیسوی میں مطلق العنان نواب، وزیر اور پھر بادشاہ بن بیٹھے تھے۔ ہندوستان امریکہ کی طرح نہیں ہے کہ مختلف ممالک مل کر ایک مملکت وفاقیہ بن بیٹھے۔ یہ ایک ملک ہے۔ اس کے ٹکڑے مختلف ممالک نہیں ہیں۔ جغرافیائی، تاریخی، عمرانی، معاشرتی، مذہبی اور سیاسی سب حیثیتوں سے یہ ایک ہی ملک ہے۔ جب ہم دیسی ریاستوں کو اس سے علیحدہ نہیں کر سکتے" اور انھیں السٹر کی حیثیت دینا نہیں اس قدر بھی گوارا نہیں جس قدر آئرلینڈ کی آزاد مملکت کو آج گوارا ہے" تو پھر ہم ہندوستان کے مختلف صوبوں کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ نہیں سمجھ سکتے وہ خود بھی ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اسی طرح جس طرح کہ انسان کے دو ہاتھ یا دو پیر اور گو دونوں کے افعال یکساں ہیں اور ہر ایک اپنا اپنا فعل علیحدہ علیحدہ کر سکتا ہے" تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ سے

چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

خدا نے چاہا تو سندھ آج نہیں تو کل اپنے اخراجات کی کفالت کرنے لگے گا اور دریائے سندھ کی بدولت وہ اس قدر سرسبز و شاداب ہوگا اور اس کی تجارت کو بندرگاہ کراچی کی بدولت اس قدر فروغ ہوگا کہ وہ ہندوستان کی مرکزی حکومت اور اس کے درماندہ صوبجات والوں کی مدد کیا کرے گا لیکن اگر یہ بھی نہ ہو تب بھی کیا ہم اس کی مدد سے دریغ کریں گے اور کہیں گے کہ ہمارا اصول وہی ہے جو قیامت کے دن مصیبت زدہ گنہگاروں کا ہوگا کہ پکارتے پھرتے ہوں گے "نفسی نفسی لاتزر وازرۃ وزر اخریٰ"؟ کیا اسی کا نام قومیت ہے۔ یہ ذہنیت ہندو سبھا کو مبارک ہو۔ ہماری ذہنیت تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ہم نے تو غیر ملکی ترکوں اور عربوں کی اس سے کہیں زیادہ مدد کی ہے۔ ہم سندھ علیحدگی کے خواہ مخواہ کسی مذہبی تعصب

کی بنا پر طلب گار نہیں ہوئے ہیں۔ سندھ اسی طرح علیحدگی کا مستحق تھا جس طرح کہ صوبہ سرحدی آزادی کا مستحق ہے اور ہم سے زیادہ مستحق ہے اس لیے کہ ہم نے دونوں کا مطالبہ کرنا قبول کر لیا۔ اگر سندھ علیحدگی کا مستحق نہ ہوتا تو ہم ہرگز اس کا مطالبہ نہ کرتے۔ ہم نے مشرقی بنگال کی علیحدگی کے بعد اس کا مغربی بنگال سے الحاق طلب خاطر قبول کر لیا گو برطانوی حکومت نے ہم کو اس معاملے میں سخت دھوکہ دیا اور ہم کو بنگال کے ہندو سے خواہ مخواہ اپنی جنگ میں لڑوا کر ہم سے پوچھے بغیر ان سے صلح کر لی اور ہمیں ان کے رحم پر چھوڑ دیا لیکن جب سندھ کی علیحدگی کے خلاف ایک دلیل بھی وزنی نہیں اور اس کی علیحدگی سے ہمیں یہ موقع ملتا ہے کہ ہم ہندو کی بے تعصبی اور رواداری اور انصاف پسندی کا امتحان بھی لے لیں اور اگر وہ کامیاب اتریں تو اپنے مسلمان بھائیوں کو یقین دلا دیں کہ دیکھو تین کروڑ ہندو اقلیت میں رہنے پر راضی ہیں اگر اپنے دو کروڑ مسلمان بھی اقلیت میں رہے تو کیا مضائقہ ہے تو ہم کیوں اس کی علیحدگی کا مطالبہ نہ کریں۔ اگر اس طرح ملک کی تقسیم ہو گئی تو ہندو اقلیت مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک ضمانت ہو گی اور ہم دونوں اس کا خیال رکھ کر ایک دوسرے کے ساتھ انصاف و رواداری کا برتاؤ کرتے رہیں گے۔ یہ زندگی کا سنہری اصول ہے کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں۔ یہ اس کا شیتانہ اور مذہبی پہلو ہے لیکن اس کا ایک سفیانہ اور سیاسی پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ دونوں فریقوں کو اسی طرح ایک دوسرے کو جھلکے دینا چاہئیں تاکہ اگر ہم دوسروں کے ساتھ ناانصافی نہ کریں تو دوسروں کو بھی اس کا موقع حاصل ہو کہ دوسرے بھی ہمارے ساتھ ناانصافی کر سکیں اور ہم دونوں انگریزی مثل کے مصداق ہوں کہ اس کھیل کو دونوں کھیل سکتے ہیں۔

ہمارے ہندو بھائی اس ملک میں ۶۶ فی صدی ہیں اور ہم فقط ۲۵

فی صدی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ آیندہ اکثریت ہی کی رائے کے موافق اور مملکت کا فیصلہ ہو اور وہ نہ چاہیں گے تو کون چاہے گا۔ اتفاق سے یا یہ کہئے کہ مشیت ایزدی سے ہندوستان کی تقسیم صوبوں میں کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ مسلمانوں کی یہ چوتھ بھی بعض صوبوں میں اکثریت میں ہے اور اگرچہ میثاق لکھنؤ میں مسٹر جینا اور دوسرے ماہرین سیاست نے ہر جگہ مسلمانوں کو اقلیت ہی میں رکھ دیا تاہم بہت جلد اس میثاق کے نقائص ہمیں نظر آنے لگے اور اب ہم اپنے تحفظ کے لئے اسے ضروری نہیں سمجھتے کہ ہم اپنے نمائندوں کو بلا شرکت غیرے خود ہی منتخب کیا کریں بلکہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری بھی جن صوبوں اور قطعات ملک میں اکثریت ہے وہ با اختیار رہوں اور ہم بھی اس نعمت سے مستفیض ہوسکیں اقلیتوں کا ضرور تحفظ کیا جائے اور اس کے لئے بھی ہم نے بہترین طریقے وضع کئے ہیں لیکن اقلیت کے تحفظ کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ایک ہی ملت ہر جگہ اقلیت میں نہ رہے کہیں ایک کی اقلیت ہو تو کہیں دوسرے کی تاکہ اس ضرب المثل پر دونوں کا عمل ہو سکے کہ "ہر چہ بر خود نہ پسندی بہ دیگران مپسند"

(۲) سنبھالا

ہمدرد ۱۲ اپریل ۱۹۲۷ء

بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

(ذوق)

کیا ہمدرد کے انگریزی اور دیسی زبانوں کے معاصرین میرے اس پیغام کی اشاعت میں مدد دے کر اس پر تبصرہ فرمائیں گے۔ (محمد علی)

میں ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو ایک یادگار تاریخ سمجھتا ہوں اس لیے کہ اس دن خداوند کریم نے متعدد و سربرآوردہ مگر مختلف الخیال مسلمانوں کو ایک ایسا راستہ سمجھا دیا جس پر انشاء اللہ سارا ہندوستان ایک نہ ایک دن ضرور چلے گا اور جس پر چل کر وہ انشاء اللہ ضرور اتفاق اور آزادی کی منزل مقصود پر پہنچے گا۔ اگر سر محمد شفیع کی طرح کے پنجاب کے چند سربرآوردہ مسلمان یا انھیں کی سیرت اور انھیں کی خصلت و خیالات کے صوبجات متحدہ یا بنگال کے چند سربرآوردہ مسلمان جنھوں نے لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے جلسہ کیا تھا ان تجاویز کو مسترد کرتے ہیں جو ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں منظور ہوئی تھیں تو وہ صرف اپنی تنگ نظری اور صرف اپنی خود غرضی کا اعلان کرتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر مونجے کی طرح کے سربرآوردہ ہندو اور ہندو مہاسبھا میں ان کے ہزاروں پیرو اُن تجاویز کو مسترد کرتے ہیں تو وہ بھی صرف اپنی تنگ نظری اور صرف اپنی خود غرضی کا اعلان کرتے ہیں۔ اگر اس میں کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے تو صرف اسی قدر کہ یہ ہندو مسلمان حکومت کی اس

مشہور معروف حکمت عملی کا ڈھنڈھورا پیٹتے ہیں کہ "پھوٹ ڈالو اور راج کرو۔"

افسوس ہے کہ باوجود ہماری کوشش کے اب تک ہندو مہاسبھا اور سر محمد شفیع کے ہم خیال مسلمانوں نے دہلی کی تجاویز کو قبول نہیں کیا لیکن آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے انھیں ۱۶ مئی ۱۹۲۷ء ہی کو قبول کر لیا تھا اور اس کے بعد ۱۶ اکتوبر ۲۷ء کو انھیں صوبجات متحدہ کی مسلم لیگ نے میرٹھ میں اور ۵ دسمبر ۲۷ء کو جمیعۃ العلماء نے پشاور میں، آل انڈیا نیشنل کانگرس نے ۳۰ دسمبر ۲۷ء کو مدراس میں، اور آل انڈیا مسلم لیگ نے ۳۱ دسمبر ۲۷ء کو کلکتے میں منظور کر لیا اور جب آل پارٹیز کانفرنس کو کانگرس کی مجلس عاملہ نے ۱۲ فروری ۲۸ء کو مدعو کیا تھا اس نے بھی اکثر افراد نے اور سوائے ہندو مہاسبھا کے باقی تمام سیاسی انجمنوں کے نمایندوں نے ان سے اتفاق کا اظہار کیا۔ گو آبادی کے تناسب سے قانون ساز مجالس میں نشستوں کے تعین سے سکھ لیگ کے نمائندوں نے اختلاف کیا۔ مہاتما گاندھی کے قید کیے جانے کے بعد ہندو مہاسبھا کو جو عروج ہنود میں حاصل ہوا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندو مہاسبھا کی مخالفت کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے لیکن جتنی مقبولیت دہلی کی تجاویز کو اور جماعتوں میں حاصل ہو گئی ہے اس کو نظر انداز کرنا بھی حماقت سے کم نہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ پورے سال بھر کی ان تھک کوشش کے بعد بھی صرف اسی قدر کامیابی کے حصول پر میرا دل کتنا کڑھتا ہے اور خدا شاہد ہے کہ میری صحت کی خرابی ایک بڑی حد تک ان ہی افکار کا نتیجہ ہے جو دن کے چین اور رات کی نیند کو حرام کیے ہوئے ہیں اور جنھوں نے بارہا میرے بستر کے تکیے کو اشک آلود کر دیا ہے لیکن جب خیال کرتا ہوں کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے کتنی صدیوں سے الگ تھلگ رہے، کب سے ایک دوسرے سے لڑائے جا رہے ہیں اور

لڑ رہے ہیں تو موجودہ حالت کو بھی ناکامی و نامرادی نہیں کہا جا سکتا۔ ۲۰ مارچ کے مسلمانوں کے تاریخی فیصلے کے بعد بھی ہندو مسلم مناقشات برابر جاری رہے بلکہ یوں کہیے کہ انھوں نے اور بھی زور پکڑا۔ لیکن یہ اسی فیصلے کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے دو مہینے بعد ان سے اتفاق کیا اور مسٹر جیکر اور مسٹر کیلکر بھی اس میں بالآخر شریک ہو گئے اور ڈاکٹر مونجے تک کو اختلاف کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جمعیت خلافت کی مجلس عاملہ کی تحریک پر شملہ میں ہندو مسلم کانفرنس منعقد ہوئی اور گو ہندو مہاسبھا کے نمایندوں نے اس کانفرنس کو بار آور نہ ہونے دیا لیکن اسی ناکام کانفرنس کا نتیجہ تھا کہ اس کے ایک ماہ کے بعد کلکتے میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے سریجت سری نواس آئنگر کی اس تجویز کو قبول کر لیا جسے شملہ کانفرنس میں انھوں نے ہندو مہاسبھائیوں کی تنگ نظری سے تنگ آکر پیش کیا تھا اور جسے ہندوؤں نے قبول کرنا تو در کنار سننے تک سے انکار کیا تھا مگر جسے مسلمانوں نے اسی وقت خود اپنی طرف سے پیش کر دیا تھا۔

اس طرح آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ۱۶ مئی ۱۹۲۷ء کو بمبئی میں سیاسی امور متنازعہ فیہ کا اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو کلکتے میں نام نہاد مذہبی امور متنازعہ فیہ کا تصفیہ چکانے کی کوشش کی، اور بالآخر ۲۰ دسمبر ۱۹۲۷ء کو مہاتما جی اور پنڈت مدن موہن مالوی دونوں کو شریک کر کے مدراس کی کانگرس نے متعدد ہندو مہاسبھائیوں کی موجودگی میں تمام امور متنازعہ فیہ پر اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور ایک عالم کو سنا دیا اور ۱۹۲۷ء کے آخری دن ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابو الکلام آزاد، مسز بسنٹ اور پنڈت مدن موہن مالوی کی موجودگی میں اور ان کو شریک کر کے آل انڈیا مسلم لیگ نے بھی وہی فیصلہ بتغیر الفاظ و انداز بیان صادر کر دیا اور ایک عالم کو سنا دیا۔

میرا دعویٰ ہے کہ یہ اسی اتحاد و اتفاق کا نتیجہ ہے کہ وہ شرمناک لڑائیاں

جو روز ہندو مسلمانوں کے درمیان واقع ہوا کرتی تھیں بند ہو گئیں۔ خدا کرے کہ دہلی میں ۲۴ نومبر ۱۹۲۶ء کو جس دن قاضی عبد الرشید مرحوم و مغفور کا جنازہ نکلا تھا اور دہلی میں پھر فساد برپا ہوا تھا اس دن ان شرمناک لڑائیوں کا بھی جنازہ نکل گیا ہو۔ یقیناً جس طرح ہماری اور مہاتما گاندھی کی قید کے بعد شدھی اور سنگھٹن تبلیغ اور تنظیم کا غلغلہ بلند ہوا اور ہندوستان میں ایک حشر بپا ہو گیا اسی طرح ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء تاریخی فیصلے نے بتدریج اس فتنے کو فرو بھی کر دیا اور جس طرح وہ فتنہ حیرت انگیز تھا اسی طرح اس کا فرو ہونا بھی حیرت انگیز ہے۔

میں اس سے ناواقف نہیں ہوں کہ اسی زمانے میں سائمن کمیشن کا بھی تقرر ہوا اور دونوں نبرد آزما سیاسی فریقوں کے سورما اس میدان میں ایک تیسری جماعت کے مقابلے میں یکساں شکست فاش کھا کر ایک حد تک آپس میں متحد اور متفق ہو گئے اور بعض لوگ کہیں گے کہ ہندو مسلمانوں کی ہنگامہ آرائی کو اس نئے ہنگامے ہی نے بند کر دیا۔ میں اپنے دوست مسٹر آرتھر مور اڈیٹر اخبار اسٹیٹسمن کے اس قول کو ہمدرد میں کئی بار خراج تحسین ادا کرکے دہرا چکا ہوں کہ بظاہر خداوند کریم نے برطانیہ کو اسی غرض سے بنایا کہ وہ ہندوستان کی قریب المرگ قومیت کو اپنے مدبرین کی حماقتوں سے از سر نو زندہ کر دیا کرے۔ یقیناً لارڈ برکن ہیڈ اور ان کے مشیران خاص کی حماقت اور ان کے تکبر نے ہندوستان کی اس نیم مردہ قومیت کو پھر زندہ کیا ہے جس کو جنگ عمومی میں ہماری وفاداری نے سپرد خاک کر دیا تھا مگر جسے اوڈوایر اور ڈایر نے تم باذنی کہہ کر جلا دیا تھا لیکن یہ بیرونی مسیحا نفسی بھی ہمارے کام نہ آتی، اگر ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کے تاریخی فیصلے نے آئی ہوئی اجل کو ہماری لیس سے رخصت نہ کر دیا ہوتا۔

یقیناً ۳۱ مارچ ۱۹۲۸ء کو جبکہ سر جان سائمن اور ان کے رفقائے کار نے

اپنے قدم ساحلِ ہندوستان سے اٹھا کر پھر جہاز پر اسی نیت سے رکھے کہ اپنے وطن کو واپس ہوں۔ ہندوستان کی وہ فضا نہیں ہے جو اس سے چھ ماہ پیشتر تھی جبکہ ستمبر ۲۵ء کی آخری تاریخوں میں شملہ کانفرنس کا بظاہر ناکامی کے ساتھ خاتمہ ہوا تھا لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر شملہ کانفرنس اس طرح ختم نہ ہوتی تو وہ کمیشن جس کا حامیانِ تعاون برسوں سے خواب دیکھ رہے تھے یکایک مقرر کر دیا جاتا اور شروع نومبر ۲۵ء میں وائسرائے ہم کالوں کے سرداروں پر اس کی ابیض اللونی کا بصیغہ راز اظہار کر کے ۸ نومبر کو اس راز کو فاش کر دیتے جس طرح ستمبر ۲۵ء میں شملہ کانفرنس کی ہندو سبھاؤں کی بدولت ناکامی و نامرادی نے اس کمیشن کا فوراً تقرر کرایا۔ بالکل اسی طرح اکتوبر ۲۵ء میں کانگریسیوں کی بدولت کلکتہ کانفرنس کی کامیابی نے اس کمیشن کی ناکامی و نامرادی کا بیج بھی بو دیا۔ ہندو سبھائی یا مسلم لیگ والے کچھ بھی کیوں نہ کہیں لیکن ایک ایسے کمیشن کے یکایک تقرر نے جس میں نہ کوئی ہندو سبھائی ہی شامل کیا گیا تھا نہ کوئی مسلم لیگ والا دونوں کو اس خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا جو ان کے جنگ و جدال کا لازمی نتیجہ تھی اور جس میں بے ہوش ہو کر وہ اس حقیقت کو بھول گئے تھے کہ نہ ہندو سبھائیوں کو حقیقتاً کچھ مل سکے گا نہ مسلم لیگ والوں کو جب تک کہ دونوں ہندوستان کی آزادی کے لئے متحد اور متفق ہو کر تیسرے فریق سے جنگ نہ کریں۔

لیکن ہندوستان کی فضا میں جو نمایاں تغیر ہوا وہ درحقیقت اس سنبھالے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جو موت سے پہلے مریض سنبھالا لیتا ہے۔ اس لئے میں نے اس مضمون کا یہی عنوان رکھا ہے اور باوجود یکہ مجھ سے زیادہ کوئی بھی فضا کے اس تغیر سے مسرور نہیں تاہم بار بار ذوق کا یہ شعر میری زبان پر آرہا ہے کہ

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا　　لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

میں ابھی اس سنبھالے پر ہرگز مطمئن نہیں ہوں. میرے دل میں اس مخالفت کی جس سے ہندوستان کی تقریباً تمام سربرآوردہ سیاسی جماعتوں نے اتفاق کر کے سائمن کمیشن کا استقبال اور خیر مقدم کیا، کوئی بڑی وقعت نہیں اس لیے نہیں کہ سائمن کمیشن کے استقبال اور خیر مقدم کے جو گھڑے ہوئے افسانے خود سائمن صاحب ان کے رفقائے کار نے یا حکومت نے حکومت کی کارندہ خبر رساں ایجنسی کے ذریعے سے سارے ملک کو سنائے ہیں ان کو سچ سمجھتا ہوں. جب استقبال اور خیر مقدم کے گھڑے ہوئے افسانے اخبارات کو بھیجے گئے وہ یقیناً زیادہ تر حکومت اور اس کے خود غرض گرگوں کا کرایا ہوا تھا اور ان لوگوں کا بھی اس میں بہت ہی کم حصہ تھا جو اپنی اس غلامانہ ذہنیت کے باعث واقعی اس قدر خوش اعتقاد ہیں کہ اس بے فیض حکومت سے اب تک لو لگائے بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف غیبت کرنے اور اس کی خوشامد کرنے کے لئے تیار اور اس کے صلے میں اپنے فرقے کے لئے کچھ نہ کچھ ہے بھاگنے کی آس باندھے بیٹھے ہیں. اس کے خلاف جس طرح مخالفین کمیشن نے اس کا استقبال اور خیر مقدم کالے جھنڈوں اور "سائمن لوٹ جاؤ" کے نعروں اور اعلانوں سے کیا ہے یقیناً وہ ان لوگوں کے دلی جذبات کا اظہار تھا لیکن ابھی ملک کا ایک بہت بڑا حصہ نیند میں ہی پڑا سو رہا ہے اور نہ اس تک سیاسی لیڈر پہنچے ہیں کہ اسے جاکر بیدار کریں اور نہ وہ بیدار ہوا ہے. کانگریسی لیڈروں کے علاوہ بہت کم لیڈر ایسے ہیں جو ملک کے اس بڑے حصے سے کچھ زیادہ دلچسپی لیتے ہوں بلکہ اکثر تو اس سے بیحد خائف ہیں اور جب ہر بالغ ہندوستانی کو حق انتخاب دیے جانے کا مسئلہ پیش ہوگا تو قارئین کرام دیکھ لیں گے کہ یہ لیڈر ملک کے اس بڑے حصے پر کس طرح بے اعتمادی کا اظہار کرتے ہیں اور اس کی کس طرح حق تلفی کرنا چاہتے ہیں لیکن

کانگریسی لیڈر بھی اگرچہ عوام پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کی حق تلفی کرنا نہیں چاہتے تاہم ان تک پہنچنے کی زحمت وہ بھی کم اٹھاتے ہیں۔ ان پر ان کا لاکھ ایمان سہی لیکن عمل صالح سے وہ بھی زیادہ تر محروم ہیں جس وقت اسمبلی میں سائمن کمیشن پر بحث ہو رہی تھی اور لارڈ برکن ہیڈ کی آخری تقریر کے وہ فقرے مخالفت کی بنچوں پر مزے لے لے کر سنائے جاتے تھے اور ان کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا جن میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ دسیوں لاکھ مسلمان کمیشن کے ساتھ ہیں تو بے اختیار جی چاہا کہ پریس گیلری میں سے بول اٹھوں کہ دسیوں لاکھ مسلمان نہ سر ذوالفقار علی خاں کے ساتھ ہیں نہ مسٹر جینا کے۔ اگر کچھ ہیں تو ان خلافتی اور سوراجی کانگرس والوں کے ساتھ ہیں جو مساجد میں کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ ان خلافت والوں کے ساتھ ہیں جو کانگرسی تو ہیں مگر بحمد اللہ سوراجی ابتک نہیں ہیں اور جو اسمبلی اور کونسلوں میں جاکر بادشاہ اور اس کے وارثوں کی وفاداری کا حلف نہیں اٹھاتے بلکہ اس دروغ حلفی سے بیزار ہیں اور کلیتہً ان کے ساتھ بھی اسی وقت ہوں گے جب وہ بھی مہاتما گاندھی کی طرح گاؤں گاؤں پھر کر ان کی اقتصادی حالت سدھارنے کی کوشش کریں گے۔

سوائے چند خوشامد پسند اور خود غرض لیڈروں کے تمام سیاسی جماعتیں آج کمیشن کے خلاف ہیں۔ لیکن "ٹائمز" جھوٹ نہیں کہتا کہ کانگرس والوں کے سوا اوروں کی مخالفت زیادہ تر شخصی اور ذاتی اغراض پر مبنی ہے۔ کانگرس والے تو کسی کمیشن کے طالب نہ تھے خواہ اس میں سب کے سب گوری رنگت کے بجائے کالی رنگت ہی کے کیوں نہ ہوتے لیکن ہندو سبھائی لبرل اور کلکتہ مسلم لیگ والے بھی الا ماشاء اللہ ہر اس کمیشن کو قبول کر لیتے جس میں ان کو بھی سر جان سائمن کی ہمرکابی کا شرف عطا کیا گیا ہوتا۔ گو نتیجہ بھی اس کا بھی وہی ہوتا جو اسکین کمیشن

کی متفقہ رپورٹ کا ہوا ہے اور عربوں کی یہ مثل صادق آتی کہ دیکھو اپنی گھروالی سے
ہر کام میں مشورہ ضرور کر لیا کرو لیکن کیا وہی کرو جو خود تمھیں مناسب معلوم ہوتا ہو۔ میں
ان خیالات کا اپنے پہلے ہی مضمون میں جو اس کمیشن کے تقرر اور اس کے خلاف
سیاسی لیڈروں کے اتفاق پر لکھا گیا تھا اور ہمدرد مورخہ ۱۱ نومبر ۲۷ء میں شائع
ہوا تھا اظہار کر چکا ہوں[ا]۔ خدا کرے کہ اسکین کمیٹی کی متفقہ رپورٹ کا جو حشر ہوا ہے اس
سے میرے ہم نام بھائی محمد علی جینا کو ہمیشہ کے لئے سبق مل گیا ہو اور وہ اس حکومت
کے ساتھ تعاون کو اسی طرح حرام سمجھیں جس طرح میں سمجھتا ہوں لیکن ڈیلی ٹیلیگراف
کی ہندوستانی خبروں کی سرخیاں اب تک خوف دلا رہی ہیں کہ ہندو سبھائی اور مسلم لیگ
والے کہیں جلد راضی نہ کر لئے جائیں اور سر جان سائمن اور ان کے رفقائے کار
لارڈ برکن ہیڈ اور ان مشیروں کو جن میں سنا جاتا ہے کہ لارڈ ریڈنگ کو خاص امتیاز
حاصل ہے ملک معظم سے ایک رائل کمیشن کا ضمیمہ نہ نکلوا دیں جس میں ہندو سبھائی اور
مسلم لیگ والے اور لبرل شامل کر دئے جائیں۔ سنا جاتا ہے کہ لارڈ ریڈنگ ہی سائمن
کمیشن کی ابیض اللونی کا زیادہ تر باعث ہوئے تھے اور لارڈ برکن ہیڈ کو یہ ترکیب
بھی انھیں نے سجھائی کہ کمیشن کو اپنا کام شروع کرنے کے لئے تو سال بھر بعد
بھیجنا لیکن دو مہینے کے لئے اب کے جاڑوں ہی میں چہل قدمی کرنے کے لئے
بھیج دو تاکہ مخالفین کی مخالفت اس وقت حارج نہ ہو جب کہ کام کا وقت آ گئے
بلکہ پہلے ہی بھڑک بھڑکا کر بجھ جائے اور بعض جل کر ٹھنڈی ہو جائے۔ ترک تعاون
کی تحریک کا بھی لارڈ ریڈنگ کو یہی کرنا تھا اور ان کو اپنے اس گمان پر پورا وثوق
ہے کہ ہندوستانی دیر تک قربانیاں جاری نہیں رکھ سکتے اور ان کی مخالفت کا زور
سوڈا واٹر کی بوتل کی طرح ہے کہ جب وقت کھلتی ہے تو اس کی شوراشوری دیکھنے
کے قابل ہوتی ہے مگر کھل چکنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کی بے نمکی بھی قابل دید

[ا] دیکھئے مضامین محمد علی جلد اول

ہوتی ہے۔ اس دو مہینے میں اس سودے کی بوتل کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں برطانیہ میں نیز یورپ کے دوسرے ملکوں اور امریکہ میں اور تمام مشرق میں بھی جو مغرب کے زیر حکومت ہے سائمن کمیشن اشتہار بازی کر کے سب کو یقین دلا دے گا کہ ہندوستانیوں نے اس کا بڑے جوش خروش سے خیر مقدم کیا۔

علاوہ ازیں برطانیہ کی پرانی حکمت عملی پر چلنے کے لیے یہ دو مہینے اچھے مل جائیں گے۔ اس بار کمیشن مدراس، پنجاب اور صوبہ سرحدی میں جیل قدمی کر کے برہمن غیر برہمن اور ہندو مسلم اور سکھ کے درمیان پھوٹ ڈلوا دے گا اور پھر جب اکتوبر میں کام کا دورہ ہوگا تو وہ راج کرنے لگے گا۔ چنانچہ یہی ہو رہا ہے۔ اب تک ہمارے سیاسی لیڈر تقریباً تمام ملک میں ۳ فروری کی ہڑتال کرانے، اسمبلی اور دو ایک کونسلوں میں کامیابی کے ساتھ مخالفت کرنے اور کالی جھنڈیوں اور "سائمن لوٹ جاؤ" کے نعروں سے کمیشن کا خیر مقدم کرانے کے سوا کچھ نہیں کر سکے لیکن خدا بھلا کرے سبھاش چندر بوس اور اس کے برما کے قید خانے کے ساتھیوں کا کہ انھوں نے برطانوی مال کا مقاطعہ کرنے کی تحریک بھی بنگال میں شروع کر دی مگر اس وسیع پیمانے پر برطانوی تجارت کا مقاطعہ کامیابی کے ساتھ کرانا آسان کام نہیں۔ مہاتما گاندھی سے زیادہ کسی نے بھی برطانوی حکومت کی جڑ بنیاد اکھاڑنے کی ترکیب نہیں کی، گو باردولی کے فیصلے میں انھوں نے بھی وہ مہلک غلطی کی جس نے حکومت کی جڑ کو اور بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ جما دیا۔ ہندو مسلم تنازعات کے رفع کرنے میں فوری کامیابی حاصل نہ ہونے پر بھی انھوں نے اسی قسم کی ایک اور مہلک غلطی یہ کی کہ ہندو کو ہندو سبھا کے ہاتھ چھوڑ کر وہ ان کی اصلاح سے دست کش ہو گئے اور اس میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ اسمبلی اور کونسلوں کی سیاسیات

سے کہیں زیادہ مفید سیاسی کام وہ چرخہ سنگھ کے ذریعے سے کر رہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ وہ بہت جلد برطانوی کپڑے کا مقاطعہ پہلے سے زیادہ زور شور سے اور گذشتہ تجربے سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کی ذہنیت کا لحاظ کرتے ہوئے شروع کردیں گے۔

سوبھاش چندر بوس اور ان کے رفقائے مجلس کی مقاطعہ کی تحریک کو اگر مہاتما جی نے اس انداز سے چلایا تو سائمن کمیشن کا مقاطعہ اسمبلی اور کونسلوں، لیڈروں اور بڑے بڑے شہروں میں ان کے پیروں سے نکل کر ہر شہر کی ہر گلی کوچے میں اور ہر ضلع کی ہر تحصیل اور شاید ہر گاؤں تک میں پھیل جائے گا اور سائمن صاحب اور ان کے رفقائے کار جو بائبل کی زبان میں ۳ فروری کو ہندوستان میں جاسوس بن کر آئے تھے تاکہ اس زمین کی بری حالت دریافت کریں۔ وہ جب اکتوبر میں پھر آئیں گے (بشرطیکہ انھوں نے اس کی ہمت کی ہو) وہ سارے ہندوستان کو اپنے خلاف پائیں گے اور لارڈ ریڈنگ بھی اپنے تجربے کو ناقص تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے اور جہاں وہ خود کامیاب ہوگئے تھے وہاں ان کے جانشین لارڈ ارون باوجود اپنے اخلاق کریمانہ کے اسی سیاست میں جو ہر برطانوی کی سیاست ہے اور جس میں بہ ظاہر تبدیل و تحویل کی گنجائش ہی نہیں، ناکام و نامراد رہیں گے۔

لیکن یہ سب اسی وقت ہوگا جبکہ مہاتما گاندھی اور پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال، لالہ لاجپت رائے اور سیٹھ گھنشام داس برلا، مسٹر جیکر اور مسٹر کیلکر ہندو جاتی کو ڈاکٹر مونجے اور ان ہی جیسے ذہنیت والوں کے پنجے سے نجات دلائیں گے اور ہندو مہاسبھا سے بھی ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کی دہلی کی تجاویز کی تائید کرائیں گے جن کو ۲۰ دسمبر ۱۹۲۷ء

کو کانگریس نے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۲۷ء کو مسلم لیگ نے منظور کر لیا اگر جبل پور میں بھی
ہندو مہا سبھا نے اپنے سالانہ جلسے میں وہی کیا جو اجودھیا میں اودھ کی ہندو سبھا
نے ڈاکٹر مونجے کی صدارت میں کیا ہے تو نہ مہاتما جی کی ساری جد و جہد ولایتی
کپڑے کے مقاطعے کو نہ سبھاش چندر بوس کی دلی تمنا برطانوی مال کے مقاطعے
کو کامیاب بنا سکیں گی یا سائمن کمیشن اس کے خلاف مظاہرے پھر بھی ہو سکیں گے
اور کچھ نہ کچھ سیاسی لیڈر اس سے ہر حال میں بیزار رہیں گے لیکن اس کا قطعی طور
پر مقاطعہ صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ خود ہمارا سائمن کمیشن سارے ملک کو اپنے
فیصلے پر راضی کرے اور جس فیصلے پر سارے ملک کو راضی ہونا چاہئے۔ وہ وہی
فیصلہ ہے جو دہلی میں مختلف الخیال لیڈروں نے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو کیا تھا۔

یہ میرا پیغام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی تک بھی پہنچے اور موتی لال
جی تک بھی۔ مالوی جی بھی اس پر غور فرمائیں اور مسٹر جناح بھی۔ میں بہت ممکن ہے کہ
اسی مہینے میں ایک اہم ترین فیصلہ اپنے طریقہ معاش کے متعلق کروں جس کے بعد
قرین قیاس یہ ہے کہ نہ میں اپنے ملک کے زیادہ کام آسکوں گا نہ اپنی ملت کے۔
میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اس فیصلے کے بعد ولایتی کپڑے کے مقاطعے میں کوئی مفید
حصہ لے سکوں یا نہیں یا سائمن کمیشن ہی کے مقاطعے میں۔ لیکن خواہ میں خود ان دونوں میں کوئی حصہ
لے سکوں یا نہیں میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہندوستان اب ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا
جب تک کہ دہلی کی تجاویز کو ہندو مسلمان سب مل کر منظور نہ کرلیں اور انہی کے مطابق ہندوستان
کا دستور اساسی نہ بنے۔ سائمن کمیشن کو ہمارے مظاہروں اور مجاہدوں سے شکست نہیں مل سکتی اسے
صرف اسی طرح شکست مل سکتی ہے کہ ہمارا اپنا سائمن کمیشن یعنی ہماری آل پارٹیز کانفرنس
۱۹ مئی یا اس سے بھی پیشتر پھر مجتمع ہو کر ایک متفقہ دستور اساسی بنا ڈالے اور سوائے دہلی کی
تجاویز کے کسی اور بنیاد پر اس کی تعمیر قطعی ناممکن ہے۔ اس سے زیادہ ہرجاتی اور ہرکت کے

ساتھ کسی اور طریقے پر انصاف نہیں کیا جا سکتا اور اس سے کم پر مسلم اقلیت کا کسی طرح اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ موتی لال جی کنیڈا کو جا رہے ہیں۔ سر یجیت سری نواس آئنگر اور مسٹر جینا ولایت جا رہے ہیں اور شاید مہاتما جی بھی ہندوستان سے باہر جائیں۔ میں ان بزرگوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ خدارا اس وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ شاید پھر ایسا وقت کبھی نہ آئے۔ سیاست سے کھیلنا مردوں کا کام نہیں۔ جس طرح ۱۱ مارچ کو کانفرنس ملتوی کی گئی اسی طرح ۱۹ مئی کو اس کا پھر منعقد کرنا فضول ہوگا۔ اسی وقت انجام کو سوچ کر اس کام کا پھر آغاز کرو اور اس کو انجام تک پہنچائے بغیر ہرگز ملک کے باہر قدم نہ رکھو۔ آج فضا بہت کچھ سدھر گئی ہے۔ جبل پور میں اور امرتسر میں جو جلسے ایک دو ہفتوں میں ہونے والے ہیں اگر ان میں دہلی کی تجاویز منظور نہ ہو سکیں تو پھر کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ مریض نے ضرور سنبھالا لیا ہے لیکن کہیں یہ سنبھالا مرض الموت کے "دھوکہ دینے" والے سنبھالے کی طرح نہ ہو ؎

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

کانگریسی سیاسیات سے بے اعتمادی

(۱) کانگریس سے علیحدگی کا اعلان

خلافت کانفرنس میں صدارتی خطبہ

ہمدرد ۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء

جون ۱۹۲۸ء میں مولانا علاج کی غرض سے یورپ تشریف لے گئے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں نہرو رپورٹ مرتب ہوئی اور آل انڈیا پارٹیز نے اسے منظور کرلیا۔ مولانا مدراس کانگریس کے فرقہ وارانہ فیصلوں کو برقرار رکھنے کے حامی اور نہرو رپورٹ کے خلاف تھے۔ ہندوستان میں واپس آتے ہی انھوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی اور دسمبر ۱۹۲۸ء میں جب کانگریس نے کلکتہ کے مقام پر نہرو رپورٹ کو قبول کرلیا تو مولانا کانگریس سے علیحدہ ہوگئے۔

یہ صدارتی خطبہ جو خلافت کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں انھی دنوں میں مولانا نے زبانی دیا تھا کانگریس سے علیحدگی کا اعلان ہے۔

"خلافت" کے نمائندے نے خطبے کو بجنسہ قلم بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بہ مشکل مولانا کا مفہوم ضبط تحریر میں لاسکے (افسوس ہے کہ خطبے کا اصل مطلب عبارت سے سمجھ میں نہیں آتا اس کی حیثیت محض کانگریس سے علیحدگی کے اعلان کی ہے)

برادران ملت! آپ مجھے معاف کریں گے اگر میں بہت ہی اختصار کے ساتھ چند واقعات اپنی پبلک زندگی کے ایک خاص غرض سے عرض کروں۔

بیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ مجھے آپ نے ملک کے سامنے آتے

ہوئے دیکھا ہوگا۔ خواہ علی گڑھ کالج کے پرانے طالب علم کی حیثیت سے، یا لیگ کے صدر کی حیثیت سے، اور آخر میں کانگریس کے ایک رکن اور پھر ایک صدر کی حیثیت سے، اس کے بعد خلافت یا کسی اور وفد کے ممبر کی حیثیت سے، اور آج خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے آپ کے سامنے آیا ہوں۔ لیکن میرے عزیز ترین دوستوں اور عزیزوں کو اس کا علم نہ ہوگا اور بڑے بھائی جو میری پرائیویٹ زندگی کے حال سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، کو بھی اس کا علم نہ ہوگا کہ میں نے کسی جلسے کی خواہ وہ پرائیویٹ ہو یا سیاسی یا ملکی، چھوٹا بڑا کیسا ہی جلسہ ہو کبھی صدارت نہیں کی اور کسی جماعت کا کوئی منصب یا عہدہ قبول نہیں کیا۔ میں اپنے نوعمر ساتھیوں میں عہدے اور منصب کی خواہش کو دیکھا کرتا تھا جو جوانوں میں بہت سی رقابت کا باعث ہوتی ہے اور کام خراب کرتی ہے۔ میں نے جو کچھ تعلیم حاصل کی تھی اس سے سبق مل گیا تھا کہ اگر دنیا میں کوئی نام و نمود چاہتا ہے تو وہ صرف کام ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور کام کے لئے عہدے کی ضرورت نہیں۔ جس جمعیت میں کام کرتا ہوں تو وہاں رکن کی حیثیت سے کام میں حصہ لینے سے عہدے داروں سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے جب کسی دوست نے مجھ سے کہا کہ فلاں عہدہ آپ کے لئے تجویز کرتے ہیں تو میں نے انکار کر دیا۔ اگر میں نے سوچ لیا تھا کہ چالیس برس سے پہلے جبکہ رسول کریم ؐ پہلا خدائی فرمان اور رب کا پیغام غار حرا سے لے کر چالیس برس کے بعد ہی نکلے تھے۔ کسی مسلم نوجوان کو یہ حق نہیں کہ وہ کوئی منصب لے۔ لیکن یہ بھی اتفاقی امر تھا کہ میں نے جس منصب کے لئے کبھی کوشش نہیں کی اور نہ کر سکتا تھا، کیوں کہ چھندواڑے کی نظربندی کے زمانے میں کوئی سیاسی کام نہیں کر سکتا تھا، مجھ کو ایک منصب عطا کیا گیا تھا اور وہ اسی شہر میں مسلم لیگ کی صدارت تھی جس کا سنگ بنیاد ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ کے اندر رکھا گیا تھا۔ اسی سال ۱۹۱۱ء میں مسز بسنٹ کو کانگریس

صدارت عطا ہوئی اور گورنمنٹ نے انھیں کم خطرناک سمجھ کر آزاد کر دیا تھا کیونکہ گورنمنٹ خوب سمجھتی تھی کہ جو لوگ ڈومینین اسٹیٹس پر قانع ہوتے ہیں بہ نسبت ان کے کم خطرناک ہوتے ہیں جو آزادی کامل کے خواہاں ہیں۔ پیشتر اس کے کہ حکم امتناعی کی خبر مجھے ملے جو میرے حق میں صادر ہو چکا تھا میں نے بلا خواہش اور اطلاع کے ایک غزل لکھی تھی۔ اس غزل میں ایک مقطع عرض کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تقریر سے پہلے اس مقطع کو پڑھ دوں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ جو توقعات آپ کو مجھ سے ہیں ان کو میں پوری کر سکتا ہوں یا نہیں۔ میں حقیقت میں آپ کی توقعات پوری کرنے نہیں آیا ہوں اور غلط توقع کو تو کبھی پوری کر ہی نہیں سکتا۔ جس وقت مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے ہوئے تھے تو میری آزادی اور رہائی کی تحریک جاری تھی تو مسٹر مانٹیگو کا دفتر ہندوستان کے دو لاکھ تاروں سے بھر گیا تھا۔ اس وقت میں یہ غزل تحریر کر رہا تھا ؎

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی — یہ صدر نشینی ہو مبارک تمھیں جوہر
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے — لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے

میں دنیا کے آزادوں کی طرح حریت کا دعوے دار بن کر آپ کے سامنے نہیں آ رہا ہوں، میں عبدیت کا طوق غلامی گلے میں ڈال کر خدا کا بندہ، محمد رسول اللہ ﷺ کی خاک پا بلکہ اس سے بھی کمتر ذرہ بن کر آپ کے سامنے آ رہا ہوں اور آپ کو بھی اس رشتے میں منسلک کرنے آیا ہوں چاہے وہ آپ کو پسند ہو یا نہ ہو ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

میں اگر آپ سے یہ عرض کروں کہ میں آپ سے وہ باتیں کہنے والا ہوں جو آپ کی اکثریت کو پسند ہوں تو نہیں میں آپ کو غلط توقع نہ دلاؤں گا۔ جب میں کانگریس

میں شریک ہوا تو میں نے اس کے خوش کرنے کی بھی کوشش نہیں کی آپ اگر مجھ سے یہ توقع رکھتے ہوں کہ میں وہی کہوں جو آپ کی اکثریت کی پسند ہو، میرا بھروسہ نہ مسلم اکثریت پر ہے نہ ہندوستان کی اکثریت پر ہے۔ میں مسلم اکثریت سے خائف ہوں نہ ہندو اکثریت سے۔ میرا بھروسہ اگر کسی پر ہے تو وہ توحید ہے۔ میں اللہ کا غلام ہوں۔ میں جو کچھ بھی عرض کروں گا اسی کی خوشنودی کے لئے ہوگا، ورنہ وہی چیز جس کا رسول اللہ صلعم کو حکم ملا تھا لکم دینکم ولی دین خداوند کریم کی رضا جوئی کے لئے سامنے ہوا، بھلا آپ ماریں گے، دھتکاریں گے، گالی دیں گے لیکن آپ کی خوشنودی کے لئے خدا کی رضا مندی نہیں چھوڑ سکتا۔ ابھی چند روز ہوئے کہ میں ذاتی حیثیت سے آل پارٹیز کنونشن میں شریک ہوا اور میں نے وہ تقریر کی جو ہندوستان کے ایک طبقے کے موافق تھی لیکن آپ کو معلوم ہے کہ میں کس کس طرح سے روکا گیا اور میری تقریر میں کس کس طرح سے روڑے اٹکائے گئے، (شرم شرم کے نعرے) میں نہیں چاہتا کہ آپ شرم شرم کے نعرے لگائیں۔ وہ بھی ہماری ہی شرم ہے کیونکہ وہ ہمارے ہی بھائی ہیں۔ لیکن میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں کلمہ حق سنانے کے لئے گیا تھا۔ کسی کی پرواہ نہیں کی۔ جس چیز کو میں ہندوستانیوں کے لئے، ہندوؤں، پارسیوں، سکھوں، مسلمانوں اور انگریزوں کے لئے، بندگان خدا کے لئے بُرا سمجھتا ہوں میں وہ آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔ خدا کرے ہم سب کلمہ حق پر مجتمع ہو جائیں۔ میں غلطی پر ہوں تو آپ میری رہنمائی فرمائیں اور اگر آپ غلطی پر ہوں گے تو میں درست مشورہ دوں گا۔ میں تو ایک رسی آپ کے گلے میں ڈالنا پسند کروں گا۔ باوجود مکمل آزادی کے دعوے کے میں آپ کو آزاد بنانا نہیں چاہتا۔ میں آپ کو بندگی کی طرف لانا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی نظربندی کے زمانے میں اپنے بڑے بھائی کے جواب میں غزل لکھی تھی۔ وہ شاید حکومت پرستی کی وجہ سے ہم سے چھندواڑے میں ملنے تک

ذ آئے، میرے ان بھائی نے جو ہندوستان کے بے مثل شاعر ہیں ایک مطلع میں سب کا جواب دے دیا ہے

جورِ اعدا کے گلے تیری جدائی کے گلے
اس دلِ تنگ میں ہیں ساری خدائی کے گلے

میں نے ردیف بدل کر اسی قافیے میں غزل لکھی تھی جس کا مطلع یہ تھا ہے

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے
خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے

پانچ سال کی مسلسل قید کو مدنظر رکھ کر بتول جیل میں لکھا تھا ہے

کثرتِ شوق سے ہی ہجر بھی ہر رنگِ وصال
ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے

کثرتِ شوق تھی اور لذتِ بُعدِ منزل
ہر طرف خار تھے اور راہ نمائی کے مزے

طبعِ آزاد اسیری میں بھی پابند نہ تھی
قید میں ہم نے اٹھائے ہیں رہائی کے مزے

اور جس شعر کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا تھا جس کے سبب سے بتول جیل مجلسِ مشاعرہ بنادی گئی تھی وہ یہ ہے ہے

میری مرضی ہوئی جب تری مرضی میں گم
بندگی ہی میں ملے ہم کو خدائی کے مزے

میں آپ کو اسی بندگی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں جس میں آپ کو ساری خدائی کے مزے مل جائیں۔

علمائے کرام مجھے معاف فرمائیں گے میں ان گستاخوں میں ہوں جو سب سے

زیادہ گستاخی ان کی شان میں کرتا ہوں لیکن نہایت ادب سے میں ان بھائیوں سے
عرض کرتا ہوں جو نہ تو عمامہ باندھتے ہیں، نہ ٹخنوں سے اوپر ازار پہنتے ہیں، یا تو بڑی بڑی
مونچھیں رکھتے ہیں یا اعتدال پر آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چھینکنے میں کچھ چوہا یا
ریٹ نکل پڑتی ہو اور وہ لگی رہ گئی ہو۔ شکایت کرتے ہیں کہ تم نے ہم پر علمار کو مسلط کر دیا
ہے، وہ یہ جماعت ہے جو یقیناً بینھم کی پوری تفسیر ہے۔ یہ حضرات مجھے کہتے ہیں
کہ تم نے علمار کو ہمارے پیچھے لگا دیا، تم انھیں مسلم لیگ سے جاتے ہو جو چھوٹی چھوٹی
باتوں پر لڑتے ہیں۔ ہمارے دنیاوی اختلافات کا باعث ہمارے مذہبی اختلافات ہیں یا
تم ہندوستان کو غلامی میں مبتلا کر کے تباہ کر دوگے۔ علمائے کرام سن لیں جو مجھے سننا پڑتا
ہے لیکن میں ان بھائیوں سے کیا کہوں جو نہ سر پر عمامہ رکھتے ہیں اور نہ ٹخنوں سے اونچا
پائجامہ پہنتے ہیں اور چہرے پر ڈاڑھی رکھتے ہیں، جس طرح یہ علمار تہجد کے وقت آنکھیں
ملتے ہوئے اٹھتے ہیں اور وضو کے لئے گرم پانی تلاش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ دوسری
قسم کے شب زندہ دار لوگ یا اکل و شرب میں مشغول یا کسی اور محفل رقص و سرود میں
منہمک یا لہو و لعب میں مخمور یا تاش و شطرنج میں شب زندہ دار جب علی الصبح اٹھتے
ہیں تو بجائے وضو کے ڈاڑھی مونڈنے کے لئے گرم پانی تلاش کرتے ہیں اور اہتمام یہ
ہوتا ہے کہ کھونٹی بھی نہ بچنے پائے۔ شاید علمار کرام اتنی سختی نہ کرتے ہوں جس قدر یہ سختی
کرتے ہیں کہ ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہو یا جو اگر سوٹ کا رنگ ایسا ہو تو ٹائی کا رنگ کیسا ہو،
رومال کس قدر جیب سے نکلا ہوا ہو تھوڑا نکلا ہو یا زیادہ یا نیم دروں یا نیم بروں۔ میں
ان حضرات سے دریافت کرتا ہوں کہ علمار نے تعصب سے کام لیا ہے لیکن ہندوستان
کو ان اختلافات نے برباد کر دیا ہے یا تمھارے۔ تم ہندوستان کو متحد کرنا چاہتے ہو
اور اتحاد کے لئے اس پر راضی ہو کہ سر علی امام اور مہاتما گاندھی ایک جھنڈے کے
نیچے جمع ہوں جس پر تین تین صلیبی نشان بنے ہوئے ہوں! (ہرگز نہیں کی آوازیں)

لیکن نہرو رپورٹ کے منوانے کے لئے جو طریقے آج اختیار کئے جا رہے ہیں وہ ہرگز صحیح نہیں ہیں۔ پہلی بسم اللہ ہی غلط ہے۔ طوق غلامی کو گردن میں ڈالنا قبول کیا گیا ہے کہ ہم سر علی امام اور سر تیج بہادر سپرو و مسٹر چنتامنی و دیگر امرا اکابر متحد و متفق ہو جائیں گے لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان میں اتنی نا اتفاقی کبھی نہیں پھیلی تھی جتنی کہ آج نہرو رپورٹ کے منوانے میں پھیلی ہے۔ میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ پہلے اجلاس میں سب سے بہتر تقریر پنڈت موتی لال نہرو کی تھی جس میں انھوں نے کہہ دیا تھا کہ یہ کتاب الہامی نہیں صحف سماوی میں سے کوئی صحیفہ نہیں کہ آپ اس کے ایک ایک حرف سے متفق ہوں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکا ہے بہتر سے بہتر سمجھ کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ہمارا کام نہیں ہے کہ فیصلہ کریں یا آپ کو مجبور کریں۔ یہ آپ کے ہاتھ میں ہے جو آپ کریں گے وہ ہم قبول کریں گے۔ ایک ایسی کمیٹی کے لئے حقیقتاً یہی طریقہ بہتر تھا۔ لیکن جناب ہم کو قرآن کریم نے سمجھا دیا ہے کہ ایک مرض ایسا ہے جس میں علماء اور امی دونوں مبتلا ہو سکتے ہیں یعنی اقرار باللسان اور ہے اور اقرار بالقلب اور ہے۔

علماء کو ریاکار بتایا جاتا ہے کہ "چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند"
میں سیاست دانوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا نہرو رپورٹ کے ارکان جوڑ توڑ نہیں کر رہے ہیں کبھی مفاہمت کے نام سے اور کبھی مسلمانوں کی اکثریت کے نام سے کبھی پنجاب کے نام سے اور کبھی یہ کہہ کر کہ اکثریت کے لئے یہ بھی مناسب ہے کمیٹیوں کو بنانے کے لئے کبھی مردوں کو کفن سے لاکر ارکان بناتے ہیں بلکہ ان کا بس چلتا تو گنگا جی سے راکھ لاکر کہتے کہ ایک جسد بے روح یہ بھی ہے۔ مختلف کمیٹیاں بنتی ہیں اور مسلمانوں کو مرعوب کیا جا رہا ہے بلکہ ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت کانگریس کو بھی فریب دیا جائے گا۔ آپ دیکھیں کہ اس کی کارروائی بھی باطل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ دیکھیں پنڈت موتی لال جیتتے ہیں یا پنڈت جواہر لال، بازی آذر کے ہاتھ رہتی ہے یا!

ابراہیم کے ہاتھ، بت پرست جیتا ہے یا بت شکن۔

مجھے اندیشہ ہے کہ جس طرح یہی چنتامنی ان ہی راجہ محمود آباد اور ان ہی رنگا سوامی آئر نے پنڈت موتی لال نہرو کو جیل میں بھیجا تھا، محمد علی کے اخبار سے وہ ضمانت لی تھی جو کسی چور سے بھی طلب نہیں کی جاسکتی۔ محمد علی کا پریس بند کیا گیا، محمد علی اور اس کے بھائی نظربند کیے گئے، ان کو جیل میں ڈالا گیا اور ان کو قیدیوں کی ٹوپی پہنا کر کام لیا گیا۔ یہ تمام کام کس نے کیا تھا؟ کیا حکومت نے؟ ان ہی لوگوں نے جو آج درجۂ نوآبادیات پر قانع ہیں۔ حکومت نے ان ہی مہاراجہ صاحب محمود آباد کے ذریعے موتی لال کو قید کر لیا تھا، ان ہی سر علی امام کی حکومت نے ہمارا اخبار بند کیا اور ہم نظربند ہوئے۔ تجربے کے متعلق ایک انگریز کا قول ہے کہ تجربہ ان اسلحہ جات سے بنا ہوا ایک جنگی نشان ہے جنھوں نے ہمیں زخمی کیا ہے۔ آج موتی لال نہرو وہی جامہ پہن رہے ہیں جو کل مہاراجہ محمود آباد صاحب اور سر تیج بہادر سپرو نے پہنا تھا۔ کل تم جواہر لال نہرو کو پھانسی کے تختے پر دیکھو تو سمجھ لو کہ اس کا قاتل اس کا باپ موتی لال نہرو ہے۔ جواہر لال جب آزادی مانگنے جائے گا تو حکومت کا دفتری اقتدار کہے گا۔ تم جو آزادی مانگتے ہو وہ بغاوت ہے اور باغی کی سزا پھانسی کا تختہ ہے۔ جس طرح راجہ صاحب محمود آباد نے میرے بھائی شیروانی کو قید کرنے کا سنکشن (منظوری) دیا تھا اگر جواہر لال بھی پھانسی پر لٹکایا جائے گا تو موتی لال کا نام اس کے قاتل کی حیثیت سے لیا جائے گا۔ اس وقت یہ کہا جائے گا کہ یہ باغی ہیں، نوجوان ہیں، باپ سے بھی بڑا بننا چاہتے ہیں۔ موتی لال کو سیاست جواہر لال نے سکھلائی۔ میں پہلا شخص ہوں جس نے جواہر لال کو سکریٹری بنایا مگر شاید اب تو چنتامنی سکریٹری ہیں۔ آج درجۂ نوآبادیات مہاتما گاندھی جی نے بھی قبول کر لیا ہے اور ڈاکٹر انصاری نے بھی۔ جب مسٹر سین گپتا

ایک تقریر کر رہے تھے میں نے ایک جملہ کہا تو موتی لال صاحب بگڑ گئے اور صدر جلسہ ڈاکٹر انصاری ان کے آلۂ کار ہیں، اگھٹ تیلی ہیں جن کو وہ نچاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آج آپ صدر ہیں لیکن میں نے بھی پولیٹکس سیکھی ہے کوئی پارلیمنٹ ایسی نہیں جس میں دو ایک جملے انٹرمیٹ سے نہ کہے جاتے ہوں لیکن جب میں خود تقریر کرنے کھڑا ہوا تو مجھے بار بار روکا جاتا تھا اور موتی لال کی زبان سے ایک لفظ نکلا اور اس وقت ڈاکٹر انصاری کو کسی نے مشورہ نہیں دیا کہ ان مداخلت کرنے والوں کو روک دیا جائے۔ بھائیو! میں ان کی خدمت میں عرض کر رہا تھا کہ یہ غلامی کا طوق ہے۔ این سین گپتا نے بتایا ہے کہ اس سے رنجشیں دور ہوں گی لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ حکومت جب جواہر لال کو پھانسی پر لٹکائے گی تو ان کے قاتل موتی لال ہوں گے جس طرح موتی لال کو قید کرانے والے مسٹر چنتامنی مہاراجہ محمود آباد اور سر سپرو تھے۔ کسی کو شبہ ہے کہ گاندھی کو کس نے قید کرایا؟ ہندوؤں کو ہندوؤں نے، مسلمانوں کو مسلمانوں نے۔ اس وقت سوراج مانگا تھا۔ انڈی پنڈنیٹ کا لفظ زبان سے نکالا تھا تو گاندھی کو چھ برس کے لئے قید کیا گیا تھا تو کیا جواہر لال کو آزادی طلب کرنے میں پھانسی پر نہ لٹکایا جائے گا۔ مسٹر بپن چندر پال برطانوی تعلق کی کڑی نہیں توڑنا چاہتے اور کہتے ہیں کہ یہ ہی آزادی کامل ہے۔ اس کا جواب ایک ہے کہ جب ڈارون نے کہا کہ انسان بندر کی اولاد ہے سب ثبوت مل گئے مگر دم دار انسان نہیں ملا جو ثابت کر سکتے کہ یہ بندر ابھی تک اپنی دم تک نہیں چھوڑنے پایا ہے۔ اسے سائنس میں Missing Link کہتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اس دم کو بپن چندر پال نہیں ملانے پائیں گے بلکہ وائسرائے توڑتا مروڑتا رہے گا۔ برادرانِ ملت آج آپ کو آپ کے ذریعے سے سارے ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا کو میں ایسی بدیہی بات بتانا چاہتا ہوں جو میرا خیال تھا کہ دنیا تیرہ سو برس سے جان چکی تھی۔

مگر افسوس! باوجودیکہ ایک ذات گرامی جس کے نام نامی پر میرا نام رکھا گیا ہے تیرہ سو برس پہلے ساری دنیا کو بتا چکی تھی۔ مگر افسوس اسی نام نامی پر ایک نام رکھنے والے محمد عالم صاحب کو اور افسوس اسی کے نواسے سر علی امام کی وہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ نسل اور مرز بوم وہی لفظ ہے جس کو بھومی اور جاتی کہتے ہیں۔ یہ دو چیزیں جانوروں کی پہچان کی ہیں، انسان کی پہچان کے لیے نہیں 'انگورہ کی بلی'، رام پور کا ہاؤنڈ، جنابار کی بھینس اسلام نے تیرہ سو برس ہوئے کہ رسول اللہ کی معرفت تمام دنیا کو بتا دیا تھا کہ دنیا کے دو ٹکڑے ہوئے ایک وہ جو دنیا کو اس طرح برتنا چاہتا ہے جس طرح بتانے والے نے برتنا چاہا، جو اپنی مرضی کو دخل نہیں دیتا۔ بتانے والے کی مرضی پر ہے اور وہ جماعت بتانے والے کی مرضی پر نہیں چلتی اپنی مرضی پر چلتی ہے اور حقیقت کا انکار کرتی ہے اور ہر بات میں اللہ کو جھٹلاتی ہے اور کفر کی ترکیب ہوتی ہے۔ دنیا کے دو ٹکڑے ہیں، ایک اسلام اور دوسرا کفر۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ کل مومن اخوۃ۔ میں مہاتما گاندھی سے کیوں کہوں یا مالوی جی کو کیوں سمجھاؤں کہ کفر ایک ملت ہے اور اسلام ایک ملت ہے اور وہ کیوں کہتے ہیں کہ دنیا کی تقسیم یوں کی گئی ہے کہ انگلش، جرمن، فرنچ، برہمن اور شودر۔ آپ سے ابھی عرض کر رہا تھا کہ یہ تخصیص کہ فلاں ترک ہے فلاں افغانی ہے فلاں ہندوستانی ہے، نیز ہندی کو کیا واسطہ ایرانی سے، ایرانی کو افغانی سے، عجمی کو عرب سے، فرنچ کو انگلش سے اور انگلش کو رشین سے کیا واسطہ۔ یہ وہ غلط اصول ہے جو زندگی کو نہ ماننے سے پیدا ہوتا ہے۔ انبیائے کرام نے اس کو دور کرنا چاہا، شکایت مالوی جی سے نہیں کہ وہ نہیں سمجھے کہ یہ تقسیم تماری ترکی و افغانی کی عرب و عجم کی اسلامی تفرقہ نہیں بلکہ صحیح تفریق کفر اور اسلام کی ہے۔ میں جب دیکھتا ہوں کہ اسی رسول اللہ کے نواسے سر علی امام بھی نہیں سمجھے اور آل پارٹیز کنونشن میں کہتے ہیں کہ مجھ کو جمعیت العلماء اور خلافت کمیٹی کی آزادئ ہندی پر بھروسہ نہیں کہ یہ ہندوستان کی آزادی چاہتے ہیں

یہ تو چاہیں گے کہ انگریزوں کے نکل جانے کے بعد افغان کا بادشاہ راج کرے اور سنا ہے کہ مالوی جی نے ان کی پیٹھ ٹھونکی سہی نہیں۔

۱، مہاتما جی اور وائسرائے کی ملاقات

قران السعدین

بدھ ۲۰ فروری ۱۹۲۹ء

ع ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

د اپنی سخت علالت، اپنی ایک لڑکی کی سخت تر علالت اور ہجوم افکار کے باعث میں ایک عرصے سے اخباری اور سیاسی دنیا میں نہیں ہوں ورنہ جس طرح دہلی کے ایک ایک بچے کی زبان پر اس دعوت کا ذکر ہے جو صدر مجلس مقننہ مسٹر پٹیل آج شام کو دے رہے ہیں اسی طرح مجھے بھی اس کا علم ہوتا اور کل شام کو پہلی بار ایک سیاست سے تقریباً بے گانہ شخص کی زبان سے جو مجھ سے ملنے آئے تھے یہ سن کر مجھے کسی قدر استعجاب نہ ہوتا کہ مسٹر پٹیل کے مہمان مہاتما گاندھی ہز ایکسیلنسی لارڈ ارون سے اسی دعوت میں ملاقات فرمائیں گے۔ میں پرسوں اور کل بے حد مصروف رہا تھا اس لئے مہاتما جی کی خدمت میں کل شب سے پیشتر حاضر نہ ہو سکا دوسرے مجھے اس کا بھی خیال تھا کہ مہاتما جی کانگریس کی مجلس عاملہ میں شرکت فرما رہے ہوں گے ۱۹ فروری کو مجھ سے ملنا غالباً ان کے لئے دشوار بھی ہوگا۔ البتہ کل روزہ افطار کرنے کے بعد میں راشینہ گیا اور مسلمان کرم فرما کی معیت میں مسٹر پٹیل کے ہاں مہاتما جی کے درشن کئے۔ جب میں ان کرم فرما سے ملا تو معلوم ہوا کہ مسٹر پٹیل وائسرائے کو ایک دعوت دے رہے ہیں اور ان کا قیاس تھا کہ شب کو ڈنر دیا جائے گا کیونکہ کل حسب معمول مہاتما جی کی خاموشی کا دن تھا اور چونکہ کانگریس کی مجلس عاملہ کے علاوہ بھی وہ مسٹر جیناؔ وغیرہ سے گفتگو فرمانے میں ۱۹ فروری کا

کو مشغول رہے تھے اس لئے خاموشی کا دور شب کے سوا نو بجے کے بعد شروع ہوا تھا اور کل شب کو اس وقت ختم ہونے والا تھا جب ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ خاموش تھے مگر تحریر فرما کر ہمیں اس کی اطلاع دی کہ کچھ لوگ ٹھیک اسی وقت ملاقات کے لئے وقت مقرر کرا چکے ہیں جب کہ ان کی خاموشی کا دور ختم ہوگا، اس کے بعد بھی ایک اور صاحب ملاقات کے لئے آنے والے ہیں۔ ہم رخصت ہونے والے ہی تھے کہ سوا نو بج چکے اور مہاتما جی نے فرمایا کہ کل دو بجے آؤ۔ "ہمدرد" کی خدمت (جس دن بھی اس کی فرصت ملے) اس سے کچھ زیادہ ہی وقت لیا کرتی اس لئے میں نے عرض کیا کہ اگر چار کے قریب آؤں تو کیسا؟ تو فرمایا کہ اس وقت وائسرائے تشریف لانے والے ہیں۔ تب جا کر مجھے معلوم ہوا کہ ہز ایکسیلینسی کو ڈنر نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ دعوت محض چائے نوشی کی ہے۔

آج صبح ایک مقامی اخبار سے معلوم ہوا کہ اس دعوت میں صرف مہاتما گاندھی اور وائسرائے صاحب ہی شریک نہ ہوں گے بلکہ پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالوی، مسٹر جینا اور نواب سر عبدالقیوم بھی مدعو ہیں اور ایک جگہ تو یہ بھی درج ہے کہ صرف ملکی لاٹ ہی نہیں بلکہ جنگی لاٹ صاحب بھی شریک ہوں گے اور دو ہندوستانی والیان ملک بھی جو اس وقت دہلی میں موجود ہیں، بالفاظ دیگر یہ صرف قران السعدین ہی نہیں ہے بلکہ فلک سیاست کے سارے سیارے جمع ہو گئے ہیں اور آج شام کو صدر مجلس مقننہ کے دولت کدے پر سب کے سب ضیا پاش ہوں گے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ سوراج پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو جو اپنی پارٹی میں ڈسپلن قائم رکھنے کا خود ہی سب سے زیادہ ڈھول پیٹا کرتے تھے عمال حکومت کی دعوتوں

ہیں اپنی پارٹی کے کسی فرد کو شریک نہ ہونے دیتے تھے گو دیوان چمن لال کے مجلسی حوصلے اس حکم اتناعی سے بھی لبستہ نہ ہوتے تھے' مسٹر رنگا آیر کا تو ذکر ہی کیا ہے اور معترضوں سے یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ سر بازل بلیکیٹ حکومت کے عمال میں سے ہیں لیڈی بلیکیٹ جنھوں نے دعوت دی تھی کہیں اُن عمال میں داخل ہیں۔ پھر سننے میں آیا کہ حکومت ہند کے ایک ہندو عضو نے اپنے گھر ڈنر دے کر خود اس پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو کو حضور والسرائے سے ملایا اور کچھ دنوں تک سیاسی حلقوں میں اس کے بھی بہت چرچے ہوتے رہے۔ آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک ایسی دعوت میں جس میں حضور والسرائے مدعو ہیں نہ صرف پنڈت موتی لال نہرو جنھوں نے ترک تعاون کی تحریک کی ارتھی نکالی اور گوسے گیا کی مقدس زمین میں آگ کی سپرد کیا اور بالآخر پریاگ کے مقدس ترین سنگم میں اس کی راکھ کو گنگا جی اور جمنا جی میں ڈبو دیا مدعو ہیں بلکہ ترک تعاون کی تحریک کے بانی اور ہادی بھی شرکت فرمانے والے ہیں۔

جب میں وہ زمانہ یاد کرتا ہوں جبکہ میں خود کانگریس کا صدر تھا اور مہاتما جی یروودہ جیل اور پونا کے اسپتال سے نکل کر جوہو میں مقیم تھے اور موتی لال جی اور دیش بندھو داس سے ترک تعاون کے پروگرام کی تعمیل کے متعلق گفت و شنید کر رہے تھے اور پھر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں جو احمد آباد میں منعقد ہوا تھا موتی لال جی اور داس اور ان کی ساری پارٹی کو نہ صرف کانگریس کی مجلس عاملہ سے جس میں اپنی "نو چینجرز" پارٹی سے ارجھگڑ کر میں نے دیش بندھو داس کو منتخب کرایا تھا بلکہ تمام کانگریس کمیٹیوں سے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی تک سے نکلوا لینے پر تلے بیٹھے تھے اور جب اس

میں ناکامی ہوئی اور وہ جلسہ ایک دردناک گریہ وزاری پر ختم ہوا تو سابرمتی ستیاگرہ
آشرم میں سارے کے سارے "نوچینجرز" مہاتما گاندھی کے سامنے مجھ پر
ٹوٹ پڑے کہ یہ اسی کا کام ہے کہ دہلی کے اسپیشل سشن اور پھر کوکناڈا کانگرس
میں اس نے سوراجیوں کو کانگریس سے نہیں نکلوانے دیا۔ جب میں وہ
زمانہ یاد کرتا ہوں اور پھر آج کی حالت دیکھتا ہوں کہ نہ صرف موتی لال جی
اور مہاتما جی یک جان و دو قالب ہیں بلکہ وہ مالوی جی بھی جن کے اور ہمارے
درمیان میں نے اپنے نزدیک نہایت تدبر سے یورپ سے خلافت ڈیلیگیشن
کی سرکردگی کرنے کے بعد واپس ہوتے ہی اکتوبر ۱۹۲۰ء میں صوبجات متحدہ
کی پولیٹیکل کانفرنس کی سبجکٹ کمیٹی میں جس میں پہلی بار ترک تعاون کی تعمیل
شروع ہوئی عرض کیا تھا کہ صرف تھوڑا ہی سا فرق ہے مگر جن کے اور مہاتما جی
کے درمیان خود مہاتما جی نے فرمایا تھا کہ ایک "مہاساگر" حائل ہے اور
جنھوں نے احمد آباد کانگریس کے بعد مہاتما جی کا ہاتھ بٹانے کے بجائے ہمارے
کاموں میں شرکت کرکے پہلے باردولی کی رجعت قہقری شروع کرائی اور پھر
مہاتما جی کے قید کر دیے جانے کے بعد پنجاب میں کھادی بیچنے کے لئے جاکر
سنگھٹن شروع کرایا اور ہندو مسلمانوں کے سنہ ۱۹۲۰ اور سنہ ۱۹۲۱ء کے حیرت انگیز اتحاد
کو توڑوایا اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو خواب و خیال بنوا دیا وہ بھی باوجود
اسمبلی کی کانگریس پارٹی میں شامل نہ ہونے اور نام نہاد "نیشنلسٹ" پارٹی کے
(جو دراصل ہندو مہاسبھا پارٹی ہے) صدر ہونے کے کانگریس کی مجلس عاملہ کے
دو سال سے ایک عضو ہیں اور آج مہاتما جی کے مشیر خاص ہیں تو مجھ کو حیرت
بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے اور کبھی کبھی آنکھوں سے دو چار آنسو بھی
نکل پڑتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ سوائے سردرآسی لنڈے کے یہ تو سب

کے سب ہندو ہیں۔

کیا آج کی دعوت محض ہندو لیڈروں اور وائسرائے کی دعوت ہے تو اس شبہے کو دو مسلمانوں کے نام کلیۃً رفع کیے دیتے ہیں، ایک نام مسٹر جینا کا ہے جو کلکتے کے مسلم لیگ منعقدہ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء تک میں خود اپنی ہی صدارت میں منظور کردہ "تجاویز دہلی" کو لیگ کے ریزولیوشن کا جامہ پہناتے ہوئے اور لیگ سے بھی مشروط مطالبات انتخاب کو منظور کراتے ہوئے ٹھہراتے تھے اور جنھوں نے ناگپور کی کانگریس کے بعد سے آج تک کانگریس میں قدم رکھنا حرام سمجھا ہے اور سائمن کمیشن کے بائیکاٹ پر بمبئی کے ایک جلسے میں جس کے وہ صدر تھے اور جو کانگریس ہاؤس کے احاطے میں منعقد کیا گیا تھا نہایت شدومد سے اصرار فرماتے ہوئے بھی اس کی وضاحت اور صراحت فرما رہے تھے کہ اس بائیکاٹ کا سول نافرمانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرا نام نواب سر عبدالقیوم کا ہے جن غریب نے نہ تو کبھی وطن پرستی کا دعویٰ کیا، نہ وطن پروری کا بلکہ اور وفاشعاروں کے دستور کے خلاف ہمیشہ خود ہی اپنی اس طرح تحقیر فرماتے رہے کہ بھائی ہم تو شکم پرور ہیں ہمارا کیا پوچھتے ہو۔ یہاں تک پڑھ چکنے کے بعد قارئین کرام میں سے بعض کو شاید یہ گمان ہو کہ بس اب تو محمد علی کی بھی رال ٹپک پڑی اور بے چارہ روزے میں بھی بے چین اور بے قرار ہو گیا کہ مجھے اس دعوت میں کیوں نہیں بلایا گیا۔ جس کرم فرما کو یہ خیال گذرے ان کی خدمت میں اس نقیر بے نوا کی نہایت ادب سے گذارش ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ مہاتما گاندھی اور حضور وائسرائے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔

مئی سنہ ۱۹۲۱ء میں مہاتما جی لارڈ ریڈنگ سے ملنے گئے تھے اور شملے کے وائسریگل لاج سے امیدوں سے لبریز واپس آکر ہماری طرف سے اس

اظہار افسوس پر مصر ہوئے تھے جب مالوی جی نے حضور والسرائے بہادر کی خدمت میں ہمارا معافی نامہ قرار دیا تھا گرجب کی قلعی لارڈ ریڈنگ کی چیمسفرڈ کلب کی ڈزوالی تقریر کے دوسرے ہی دن بھروچ میں میرے خطبہ صدارت میں، پھر مہاتما جی اور والسرائے کی تارم تار اور خط و کتابت میں جس میں لارڈ ریڈنگ نے سب سے پہلے تو مالوی جی ہی کو اپنی طرف سے بیچ میں ڈالا تھا اور بالآخر کراچی میں میرے خطبہ صدارت میں کھل گئی۔ اس کے بعد مہاتما جی خود لارڈ اردن کی دعوت پر ان سے دہلی میں نومبر ۱۹۲۷ء میں ملے اور سائمن کمیشن کے متعلق گفتگو رہی۔ الحمد للہ کہ میں اور نیز شوکت صاحب باوجود اس قدر لحیم و شحیم ہونے کے اس قدر شکم سیر ہیں کہ ان دعوتوں سے محرومی ہم پر گراں نہیں گذرتی بلکہ ایک طرح تو یہ محرومی ہمارے لئے تمغائے امتیاز ہے اس لئے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کو ہماری طرف سے پورا اطمینان ہے کہ یہ لوگ حکومت کی دیرینہ اصطلاح میں " اریکنسائل ایبل " (-Irreconcile able) ہیں اور ہم سے کسی طرح اور کسی حال میں بھی راضی نہ ہوں گے۔ خیر ہم اس پر راضی ہیں کہ بقول غالب ؎

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

قارئین کرام غالباً اب یہ فرمائیں گے کہ اگر تمھاری رال اس دعوت پر نہیں ٹپکی پڑتی تو پھر اس ساری خرافات کے لکھنے اور شائع کرانے سے کیا حاصل! اس ساری خرافات کے لکھنے اور شائع کرانے سے صرف اس قدر مقصد ہے کہ اول مہاتما گاندھی اور پھر حکومت پر یہ واضح کر دیا جائے کہ مسلمانوں کے سیاسی خیالات کی نہ آج مہاتما گاندھی ترجمانی کر رہے ہیں، نہ

موتی لال جی نہ مالوی جی اور اگر یہ سمجھا جائے کہ مسٹر محمد علی جینا مسلمانان ہند کے نمائندے ہیں تو یہ بھی غلط ہے۔ ممکن ہے مسٹر جینا باوجود مسلمانوں کے صحیح نمائندہ نہ ہونے کے ان کی صحیح ترجمانی کریں۔ "نقل کفر کفر نہ باشد" کہہ کر مسٹر جینا مہاتما جی اور لارڈ اردن دونوں سے صاف صاف کہہ سکتے ہیں کہ نہ کانگریس نہ کنونشن کی سیاست آج مسلمانان ہند کی سیاست ہے اور مجھے یقین ہے کہ نواب سر عبدالقیوم تو ضرور یہی کہیں گے لیکن جس چیز کا خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ کہیں مسٹر جینا جبر و مقابلے کے حرف لا کی طرح مجہول الصفت "مسلم لیگ" کے نام سے کسی سیاسی پروگرام کو پیش فرما کر مہاتما جی اور وائسرائے کو اس کے یقین دلانے کی کوشش نہ فرمائیں کہ یہ مسلمانان ہندوستان کی سیاست ہے"۔ عاجز مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک ہے اور اسی نے مسٹر جینا کو باصرار تمام مسلم لیگ کا ایک عضو بننے پر راضی کیا تھا اور انھیں لیگ میں ۱۹۱۳ء میں داخل کرایا تھا وہ اس زمانے میں مسلمانوں کی سیاست سے بیزار تھے اور مسلمانوں کی مخصوص سیاسی جماعت میں داخل ہونا بھی پسند نہ فرماتے تھے اور وہ میں اور میرے رفیق سفر مسٹر سید وزیر حسن صاحب سابق سکریٹری مسلم لیگ اور اب جج اودھ چیف کورٹ ہی تھے جنھوں نے مسٹر جینا کا ع

کفر توڑا خدا خدا کر کے

لیکن جوں ہی ان کی محبوب کانگریس میں ہی خود شریک ہوا وہ اس سے بیزار ہو گئے اور ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

کلکتے کے گذشتہ اجلاس سے ایک ہی سال پیشتر وہ مدراس میں کانگریس

خلافت مسلم ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ کے دوش بدوش دیا یوں کہیے کہ آگے سامنے اور بالمقابل) لیگ کا جلسہ کرنے پر راضی نہ تھے اس لیے جلسہ کلکتے میں منعقد ہوا۔ اس سال بمبئی کے بعد اب دوسرا جلسہ پھر کلکتے میں ہو اگر اس بار کچھ کلکتے کی ہوا ہی اور تھی اور گو مسٹر جناح کسی نہ کسی طرح لیگ کا جلسہ ملتوی کرا کے "دستور نہروانی" قبول کیے ہوئے بغیر ہی کلکتے سے چلے آئے، مگر بیچارے اس وقت سے آج تک برابر نرغے میں ہیں اور وہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے "اگر ۲۰ مارچ کو نہ سہی آخر مئی تک تو لیگ کو بھی کسی نہ کسی طرف کود پڑنا ہی پڑے گا۔ جب ہم مسٹر جناح کو کانگریس اور ترک تعاون کے پروگرام کی طرف لانا چاہتے تھے تو وہ ہرگز راضی نہ ہوتے تھے اور ایک عرصہ دراز کی منتخب شدہ دقیانوسی جماعت کے چند افراد کو جن سے نئے اعضاء کے ہر جلسے میں داخل کرائے بغیر "کورم" بھی پورا نہ ہو سکتا تھا پیش کر کے فرما دیا کرتے تھے کہ مسلمان اس پروگرام سے متفق نہیں ہیں لیکن آج کیا حالت ہے، سوائے مہاراجہ صاحب محمود آباد اور سر علی امام کے یا ہماری ہی جماعت کے ایک "فئۃ باغیۃ" کے اور کتنے مسلمان ہیں جو کانگریس اور کنونشن کے اس "دستور نہروانی" کے طرف دار ہیں جب پر ہم اب تک راضی نہیں حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی ملت اس دستور اساسی پر ہرگز راضی نہیں اور جب کسی کو مسلمانوں کی رائے بحیثیت ایک ملت کے معلوم کرنا ہے خواہ وہ مہاتما گاندھی ہوں یا والسرائے ہند لسے چاہیے کہ مسلمانوں سے کہے ایک ایسی انجمن کی رائے ہمارے سامنے پیش کرو جس میں ہر کلمہ گو مسلمان تھوڑی سی فیس اس کے ضروری اخراجات کے لیے دے کر اس کا ممبر بن سکے۔ آج سوائے جمعیت خلافت کے کسی اسلامی انجمن کا دروازہ اس طرح کھلا ہوا نہیں ہے دقیانوسی حضرات

کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ جمعیت خلافت میں داخلے کی شرط اہل سنت والجماعت کے عقائد سے اتفاق ہے، لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ جمعیت خلافت میں کوئی مسلمان اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ ترک تعاون نہ کرے، حالانکہ یہ بھی اسی طرح غلط ہے جس طرح کسی کا بھی خیال اس کانگریس کے متعلق ہو جس میں پنڈت مدن موہن مالویہ شریک ہیں اور ہم نے تو مہاتما گاندھی کی طرح جمعیت خلافت سے سوراجیوں کو نکالنے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی اور اگر کوئی صاحب اسی پر اصرار فرمائیں کہ سیاست کے لئے مسلمانوں کی کوئی دوسری انجمن ہونا چاہئے تب بھی میری التماس ہے کہ خواہ وہ مسلم لیگ ہو یا کوئی اور انجمن جب تک اس کے قواعد ایسے ہی ناقص ہیں جیسے کہ مسلم لیگ کے قواعد ہیں اور اس کی ممبری کی شرط اس کی کونسل کی منظوری ہے جیسے کہ مسلم لیگ میں تو وہ انجمن صرف اپنی کونسل کی نمائندہ ہوگی ملت مسلمانان کی ہرگز نمائندہ نہ ہوگی۔

خدا کا غضب تو دیکھو کہ بجائے اس کے مسلم لیگ، کونسل مسلم لیگ کی نمائندہ ہو اور مسلم لیگ ملت مسلمانان کا نمائندہ ہو وہ خود اپنی کونسل کا نمائندہ ہے اور چونکہ اس کی دوامی کونسل روز بروز لیگ کے نئے ممبر اسی کثرت رائے کے ہم رنگ منتخب کرتی رہتی ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ لیگ کس کی ترجمانی کرے گا اس لئے میں نے اسے جبر و مقابلہ کے حرف بیچ کی طرح مجہول الصفت کہا ہے۔ اس مجہولیت کو مسٹر جناح دور کریں تو کسی کو بھی مسلم لیگ میں شریک ہو کر اسے مسلمانوں کا نمائندہ اور ترجمان بنانے میں تامل نہ ہوگا۔ مگر آج نہ وہ مسلمانوں کا صحیح نمائندہ ہے نہ اس کا صدر خواہ وہ اپنے ہمنام دوسرے محمد علی اور اس کے بھائی ہی کی ترجمانی کیوں نہ کرے۔ ہمیں مسٹر جناح کی دعوت

میں طفیلی بننے کی حاجت نہیں نہ ہماری زبان ان لذائذ کا ذائقہ چکھنا چاہتی ہے
جو مسٹر ٹیل کے دستر خوان پر آج شام کو چنے جائیں گے لیکن زبان صرف
لذائذ کا ذائقہ چکھنے ہی کے لیے نہیں بنائی گئی۔ اس کے علاوہ وہ اور کام بھی
کیا کرتی ہے اور حضور والا کی نہ سہی مہاتما جی کی خدمت میں تو ہم بھی
عرض کر سکتے ہیں ع

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں!

(۳۰) امید کی ایک جھلک

مسٹر جناح کی مصالحانہ مساعی

ہمدرد ۵ مارچ ۱۹۲۹ء

جن مسلمانوں نے میرے قیام یورپ کے زمانے میں مسلمانوں کی تمام پارٹیوں کو ایک کانفرنس میں شرکت کی دعوت دے کر ۳۱ دسمبر، یکم جنوری گذشتہ کو دہلی میں اس کانفرنس کو منعقد کرایا تھا انھوں نے ۲ مارچ کو اس کانفرنس کی تجاویز کے سربرآوردہ حامیوں کا ایک جلسہ شریف منزل میں کیا' تاکہ ان تجاویز کی تائید میں پہلے سے زیادہ مسلمانوں کو سرگرم عمل کیا جا سکے۔ مسلم لیگ نے بھی ۳ مارچ کو اپنی کونسل کا جلسہ منعقد کیا تاکہ اس کا تصفیہ کیا جا سکے کہ کلکتے کا ملتوی شدہ سالانہ جلسہ کب اور کہاں منعقد ہو اور مسلم لیگ کی کونسل آنے والی اصلاحات کے متعلق کس پالیسی اور کس پروگرام کی مسلم لیگ سے سفارش کرے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مسٹر پٹیل کی دعوت چائے نوشی کے سلسلے میں جو کچھ مسلم لیگ کے دستور اساسی کے بارے میں یا نہرو رپورٹ کی سفارشات کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جانے اور ایک سے زائد قسم کے خیالات کی جماعتوں میں بٹ جانے کے بارے میں میں نے "ہمدرد" میں لکھا تھا اس کا کسی نے مسٹر جناح سے ان کی بمبئی سے مراجعت پر ذکر کیا تھا یا نہیں لیکن انھوں نے ۲۰ فروری کو ہمارے ایک مشترک دوست کو میرے پاس بھیجا اور یکم مارچ کو ملاقات کے لئے وقت مقرر کرایا۔ میں نے

اس جانکاہ صدمے میں جوان کو مسز جناح کے اس عمر میں یکایک انتقال سے پہنچا ہے اب تک ان سے تعزیت بھی نہ کی تھی اس لئے کہ وہ بمبئی چلے گئے تھے اور مجھے لاہور جانا پڑا تھا اس لئے میں خود ہی ان کی خدمت میں حاضر ہونے والا تھا۔ ان کی دعوت پر تو میں نے فوراً لبیک کہا اور یکم مارچ کو نماز جمعہ سے دو گھنٹے پہلے ان کی فرودگاہ پر جا کر ان سے ملاقات کی ہم دونوں ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک باتیں کرتے رہے اور مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ مسٹر جناح کو بھی اس کا پورا پورا احساس ہے کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے باعث آج نہ حکومت میں کوئی ان کی رائے پوچھتا ہے یا اسے کوئی وقعت دیتا ہے، نہ برادرانِ وطن اس کی طرف اعتنا کرتے ہیں۔

یہ وہ بنیادی حقیقت ہے جسے نظر انداز کر کے مسلمانانِ ہند آئندہ کے لئے اپنے واسطے کوئی پروگرام بھی نہیں بنا سکتے اور جتنی بار بھی اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے ہمیں کرنا چاہئے۔ اسی لئے میں پھر عرض کروں گا کہ آج مسلمانوں کی سیاسی ہستی کا کوئی اثر نہ حکومت پر پڑ رہا ہے نہ برادرانِ وطن پر۔ حکومت سوراج کی مخالفت میں نہ صرف سر محمد شفیع اور سر عبدالرحیم کی طرف بلکہ اب تو شاید ہم جیسے سرکشوں اور باغیوں کی طرف بھی اشارہ کر کے کہے گی اور لارڈ اروِن نے کہہ بھی دیا کہ نہرو رپورٹ کی سفارشات کو کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے ملک میں بعض اہم سیاسی عناصر ان سے متفق نہیں ہیں۔ پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے ہم خیال ہندو خواہ وہ علانیہ مہاسبھائی ہوں یا در پردہ دل سے اور طوعاً مہاسبھائی ہوں یا محض اکثریت سے مجبور ہو کر اور کرہاً ہم جیسے دوسرے کانگریسی مسلمانوں اور ان کے رفقائے کار کی طرف اشارہ کر کے کہیں گے کہ مسلمانوں کا سیاسی سمجھ رکھنے والا

حصہ "ملک کی عام رائے" (یعنی "ہندو مہاسبھا") کے ساتھ اور موتی لال جی تو حسب دستور پوری تعمیم کے ساتھ اپنے ایک مطبوعہ مکالے میں فرما ہی چکے ہیں کہ ملک کی کونسی سیاسی جماعت سفارشات نہرو رپورٹ کے خلاف ہے لیکن باوجود ہماری مختلف جماعتوں کو آلہ کار بنانے کی صاف کوشش کے، نہ حکومت اس جماعت کی دل سے قدر کرتی ہے جو نہرو رپورٹ کی سفارشات سے متفق نہیں نہ ہندو مہاسبھائی ہی اس جماعت کی دل سے قدر کرتے ہیں جو ان سفارشات سے اتفاق ظاہر کر چکی ہے لہذا اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوگا کہ نہ حکومت مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرے گی نہ ہندو مہاسبھائی پنڈت دل ان کی حفاظت کرے گا اور اگر ان دونوں میں کوئی سمجھوتہ ہوا بھی تو وہ انگریزوں اور ہندوؤں کے درمیان مول تول ہوگا نہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مسلمان یوں ہی چھوڑ دیے جائیں گے اور انگریز اور ہندو بلا کھٹکے آگے بڑھیں گے۔ اس بنیادی حقیقت کو مسٹر جناح نے بھی سمجھ لیا ہے اور مجھے دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ میرا ایک شعر ہے ؎

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

بظاہر ہمیں اب اس کا کسی قدر احساس ہونے لگا ہے اور اسی لیے میں اسے ایک شعاع امید کہتا ہوں اور اسے افق پر دیکھ کر خوش ہوں دوسری بنیادی حقیقت جسے مسٹر جناح نے سمجھ لیا ہے وہ یہ ہے کہ نہرو رپورٹ کی سفارشات مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت نہیں کرتیں اور جب تک ان میں متعدد ترمیمات نہ ہوں گی مسلمان ان کو ہرگز قبول نہ کر سکیں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس کے ظاہر کرنے کی بھی ضرورت پیش آئی کیونکہ آج سے چھ

ماہ پیشتر بھی یہ کون تصور کر سکتا تھا کہ مسلم لیگ کے صدر کے متعلق کسی کو ذرا بھی
شبہ ہوگا کہ وہ نہرو رپورٹ کی سفارشات کو مسلمانوں کے لئے مناسب خیال
کر سکے گا جبکہ شوکت علی اور محمد علی جیسے کانگریسی اور مہاتما گاندھی کے پیرو بھی
ان کو مسلمانوں کی صریح حق تلفی خیال کرتے ہیں۔ مسٹر جناح کا رویہ اس سے
پہلے کتنا ہی مبہم کیوں نہ رہا ہو اب یقیناً وہ اس پر اسی طرح پختہ یقین رکھتے
ہیں کہ یہ سفارشات مسلمانوں کے حقوق کی کافی حفاظت ہرگز نہیں کرتیں
اور متعدد اہم ترمیمات کی محتاج ہیں۔ تیسری بنیادی حقیقت جسے مسٹر جناح
سمجھ گئے ہیں وہ یہ ہے کہ برادرانِ وطن کو ہندو مہاسبھا کی قوت پر اور اس کے
کانگریس پر قابو پا جانے پر اب اتنا زعم اور گھمنڈ ہے کہ وہ مسلمانوں سے کوئی
سمجھوتہ بھی نہیں چاہتے اور اگرچہ وہ خوش ہوں گے کہ جمعیت خلافت اور مسلم لیگ
بھی ان کی منزل مقصود تک ان کی ہمرکابی کا شرف حاصل کرنے کے لئے
بے تابانہ ان کی طرف بڑھیں لیکن اگر وہ یہی کہہ کر بیٹھے رہیں کہ فاذھب
انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون (جا تو اور تیرا پروردگار تم دونوں
جا کر لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں) تب بھی برادرانِ وطن کو اس کی پرواہ نہیں۔
وہ شاید یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ تنہا انگریزوں کا مقابلہ کر کے سوراج حاصل کر لیں گے۔
بہرحال کچھ نہ کچھ تو حاصل ہی کر لیں گے اور انگریز ہندوستان میں حکمراں بھی رہے
تو کیا مضائقہ ہے، وہ انگریزوں کی مدد سے مسلمانوں کو دبائے رہیں گے۔ چوتھی
بنیادی حقیقت جسے مسٹر جناح، باوجود دہلی کی مسلم کانفرنس میں شرکت سے معہ
مسلم لیگ کے محترز رہ چکنے کے، اب سمجھ چکے ہیں وہ یہ ہے کہ جن امور کا مطالبہ
۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کے تاریخی جلسے میں سربرآوردہ مسلمانوں کی طرف سے کیا گیا تھا
اور جنھیں بالفاظ دیگر پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے خود پنڈت موتی لال نہرو کی

تحریک پر ڈاکٹر مونجے، مسٹر جیکر اور مسٹر کیلکر کے اتفاق سے بمبئی میں وسط مئی ۱۹۲۷ء میں اور پھر خود ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں اور بالآخر پنڈت مدن موہن مالوی تک کی تائید سے کانگریس نے دسمبر ۱۹۲۷ء میں مدراس میں اور مسلم لیگ نے اسی ماہ دسمبر میں کلکتے میں قبول کیا تھا۔

ان میں اور دہلی کی مسلم کانفرنس کی تجویز میں کوئی فرق نہیں ہے اور چونکہ اب تک مسلم لیگ نے کوئی دوسری پالیسی منظور نہیں کی ہے دہلی کی مسلم کانفرنس کی تجویز ہی اس کی موجودہ پالیسی ہے۔ ساڑھے بارہ بجے شوکت صاحب بمبئی سے آرہے تھے اس لئے میں اس گفتگو کو ختم کرکے انھیں لینے اسٹیشن گیا اور چونکہ مجھ سے علیحدہ گفتگو کرنے کے بعد اسی دن ۲ بجے سہ پہر کو مسٹر جناح ہمارے ہم خیال چند احباب سے بھی گفتگو کرنے والے تھے۔ میں نے اس صحبت میں خود بھی شریک ہونے اور شوکت صاحب کو بھی شرکت کے لئے لانے کا وعدہ کیا اور ان سے رخصت ہوا۔ جب پھر اجتماع ہوا تو کچھ دیر تک تو دہلی کی مسلم کانفرنس میں مسلم لیگ اور مسٹر جناح کی عدم شرکت کے متعلق بحث رہی جس کے باعث دونوں طرف سے صاف صاف اظہار خیال کیا گیا اور ایسی کوئی چیز دل میں نہ رہنے پائی جو مصالحت کے راستے میں حارج ہوتی اور اس کے بعد انھیں بنیادی تحقیقوں کے متعلق کامل اتفاق رائے کا اظہار کیا گیا اور اس مصالحت کی کوشش کی۔ دوسری منزل بھی بخوبی طے ہوگئی۔ تیسری منزل مسٹر جناح اور سر محمد شفیع کی ملاقات تھی اور بحمد اللہ وہ بھی بخوبی طے ہوگئی اور لیگ کے جو دو ٹکڑے اس سائمن کمیشن کی بدولت ہو گئے تھے ان کے پھر جُڑ جانے کی صورت بظاہر نکل آئی۔ ۳۰ مارچ کے مسلم لیگ کی کونسل کے جلسے میں مسٹر جناح سے سب کو معلوم ہوا کہ جس تاریخ کو وہ مسلم لیگ کا اجلاس

جس جگہ طلب کریں گے اسی تاریخ کو اور اسی جگہ سر محمد شفیع بھی اپنی لیگ کا اجلاس طلب کریں گے اور پوری امید ہے کہ دونوں پھر ایک لیگ ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس غرض سے کہ اس مصالحت میں ذرا بھی دیر نہ ہونے پائے اور تمام وہ حضرات بھی جو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے اجلاسوں کی وجہ سے دہلی میں موجود ہیں اپنے وطنوں کو واپس ہونے سے پیشتر شریک ہو سکیں اور مزید مصارف سفر کا بار انھیں نہ اٹھانا پڑے بلکہ وہ حضرات بھی جو سائمن کمیشن کی دعوت پر دہلی آرہے ہیں شرکت کر سکیں مسلم لیگ کا کلکتے کا ملتوی شدہ جلسہ دہلی میں ایسٹر کی تعطیلات میں ۳۰ اور ۳۱ مارچ کو منعقد ہوگا اور سر محمد شفیع سے بھی امید ہے کہ وہ بھی معہ اپنی جماعت کے اس میں شریک ہو سکیں گے۔

میں نے لیگ کے آئندہ جلسے کے متعلق عرض کیا کہ بہتر ہوگا اگر اس میں صرف دستور اساسی کی وہ ترمیمات پیش کر کے منظور کرائی جائیں جن سے سب حاضرین جلسۂ کونسل متفق تھے اور جن کا مقصد یہ تھا کہ ہر کلمہ گو بلا روک ٹوک مسلم لیگ کی کسی مقامی شاخ کا عضو بن سکے اور یہی مقامی شاخیں ہر صوبے کی مسلم لیگ کے اعضاء کا انتخاب کریں اور صوبے کی مسلم لیگ آل انڈیا مسلم لیگ کے اعضاء کا انتخاب کرے تاکہ لیگ کا دروازہ کسی مسلمان کے لیے بھی بند نہ ہو اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اعضا پوری ملت اسلامیہ کے سیاسی نمائندے سمجھے جائیں اور مسلم لیگ کا فیصلہ پوری ملت اسلامیہ کا سیاسی فیصلہ سمجھا جا سکے۔ بظاہر تمام حاضرین جلسہ مسٹر جناح کے اس قول سے متفق تھے کہ اس وقت ملک کے سامنے اور دنیا کے سامنے صرف ایک ہی تحریر ہے جسے ہندوستان والوں کا سیاسی مطالبات نامہ کہا جا سکتا ہے اور وہ نہرو رپورٹ ہے اور چونکہ مسلمان اس کی ان سفارشوں کو جو ملت اسلامیہ کے

حقوق کی حفاظت کے متعلق ہیں کافی اور مناسب خیال نہیں کرتے اس لئے ایک اور تحریر کی بھی ضرورت ہے جسے مسلمانوں کا مطالبات نامہ کہا جاسکے اور پھر دنیا اس کا فیصلہ کرے کہ حق بجانب کون ہے۔ چونکہ مسلم لیگ کا آئندہ جلسہ یہ نیا مطالبات نامہ مرتب کرے گا اس لئے ضروری ہے کہ مسلم لیگ خود بھی اسی طرح پوری ملت اسلامیہ کا صحیح سیاسی نمائندہ بن جائے جس طرح ہندو سبھا آج پوری ہندو جاتی کی صحیح سیاسی نمائندہ ہے اور یہ حالت اس وقت نہیں ہے مسلم لیگ کے موجودہ ممبر زیادہ تر خود اس کی تنفیذی کونسل کے منتخب کردہ اور اس لئے اسی کے نمائندہ ہیں اور جس جماعت کا غلبہ کونسل میں ہو اسی کے ہم رنگ اعضا لیگ میں بھی داخل کیے جاتے رہے۔ ایک عرصے سے لیگ کے فیصلوں پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ کیا ہوں گے، مسلمانوں کی عام رائے کے موافق ہوں گے یا اس کے خلاف کیونکہ بالعموم کسی زمانے میں ایک رائے کے اعضاء وقت کے وقت بھرتی کرلیے جاتے ہیں اور کسی زمانے میں دوسری رائے کے، اور لیگ کے فیصلے ملت اسلامیہ کے قطعی فیصلے نہیں ہوتے بلکہ Snatch Division کی طرح ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے کہ کسی مجلس میں یکایک رائے شماری کا حکم دے دیا جائے اور حاضرین کی تعداد نہایت ہی مختصر ہو اور کبھی ایک فریق کے اعضا اتفاق وقت سے دوسرے فریق کے اعضاء سے کچھ ہی زیادہ ہونے کے باعث اتفاقیہ بازی لے جائیں اور کبھی دوسرے فریق کے اعضاء، فیصلہ کن رائے شماری ایک بار بھی نہ ہو۔ اس سے بظاہر سب کو اتفاق تھا اور سب نے اس قسم کی ترمیمات کی تائید کی لیکن اس سے کم کو اتفاق تھا کہ آئندہ جلسہ صرف ان ترمیمات کی منظوری کے لئے کیا جائے اور جب آل انڈیا لیگ کے اعضاء ان ترمیمات

کے مطابق مختلف اضلاع اور صوبوں سے منتخب ہو کر آئیں اور صحیح طور پر ملت اسلامیہ کے نمائندے کہے جا سکیں، تب دوسرا جلسہ کیا جائے اور کلکتے کا ملتوی شدہ جلسہ اسے کہا جائے اور وہ اس کا آخری فیصلہ کرے کہ مسلمانوں کے مطالبات کیا ہوں۔

میں نے عرض کیا کہ مجھے جس چیز کا خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ جب مسلم لیگ پوری ملت اسلامیہ کا حقیقی نمائندہ نہیں ہے اور آئندہ جلسے میں بھی اتفاق وقت سے کسی ایک فریق کے اعضاء کو تھوڑی سی اکثریت حاصل ہو گئی تو لیگ کا فیصلہ پوری ملت اسلامیہ کا قطعی فیصلہ نہ ہو سکے گا، مگر اتفاق وقت سے غلبہ پا جانے والا فریق اسے اسی طرح بہ بانگ دہل ظاہر کرے گا کہ یہ ساری ملت اسلامیہ کا قطعی اور ناطق فیصلہ ہے اور دوسرا فریق اس کو تسلیم نہ کرے گا اور یہ وہی تو تو میں میں ہوگی اور وہی باہمی اختلافات رونما ہو جائیں گے جنھوں نے ملت اسلامیہ کو آج ایک عضو معطل بنا رکھا ہے۔ اس پر ایک صاحب نے تو یہ تجویز پیش کر دی کہ لیگ خود کوئی فیصلہ ہی نہ کرے بلکہ آخری فیصلے کو ایک آل مسلم پارٹیز کانفرنس پر چھوڑ دے جسے قبول کرنے کے لئے میں نے اپنی اور اپنے ہم خیالوں کی فوراً آمادگی ظاہر کر دی، مگر مسٹر جناح اس تجویز سے متفق نہ تھے اور انھوں نے کنونشن کی شان کے متعلق کہا کہ وہ پنڈت موتی لال نہرو کی ایک چال تھی کہ پہلے کنونشن میں "ڈومینین اسٹیٹس" منظور کرا لیں پھر کانگریس میں اس فتح کے بعد صدارت کر کے اسے بھی اس کنونشن کی فتح سے مرعوب کر دیں اور مکمل آزادی کے حامیوں کو شکست دے سکیں۔ مگر مسٹر جناح نے اس کا علی الاعلان اعتراف کیا اور کہا کہ جب تک مسلمانوں کی سب جمعیتیں مثلاً جمعیت خلافت اور جمعیت العلماء بھی لیگ کی تجویز کو منظور

نہ کرلیں لیگ کا فیصلہ ملت اسلامیہ کا فیصلہ نہ تصور کیا جا سکے گا، اور انھوں نے
ان کا صاف صاف عہد کیا کہ نہ وہ خود اس فیصلے کو سوائے اعضائے لیگ
کے فیصلے کے کچھ ظاہر کریں گے نہ کسی دوسرے کو اس کا گمراہ کن پروپیگنڈا
کرنے دیں گے کہ ایک ایسے لیگ کا فیصلہ جو خود پوری ملت اسلامیہ کا حقیقی
سیاسی نمائندہ نہیں ہے پوری ملت اسلامیہ کا قطعی اور ناطق فیصلہ کرے۔
ان کے اس حتمی وعدے پر میں مطمئن ہو گیا اور میں نے لیگ کے آئندہ اجلاس
کے جلد اور دہلی ہی میں منعقد ہونے کی تائید کی مجھے امید ہے کہ میں اسی جلسے
میں لیگ کے دستور اساسی کی ترمیمات بھی پیش کر سکوں گا۔

یہ تو ایجنڈے کی پہلی مد تھی دوسری مد یہ تھی کہ کونسل لیگ کے آئندہ
جلسے میں جو کلکتے ہی کا سالانہ ملتوی شدہ جلسہ ہو گا، مسلمانوں کے مطالبات کے
متعلق لیگ کے سامنے کیا سفارشات پیش کرے۔ مسٹر جناح نے ایک ایسی
کمیٹی اس کام کے لیے مقرر کرنا چاہی جس میں ہر خیال والی جماعت کے دو دو
اعضا شامل ہوں لیکن اس رائے سے ہمارے ہم خیالوں نے اس بنا پر اختلاف
کیا کہ ابھی جب کہ مصالحت نہیں ہونے پائی ہے اور اس کی طرف پہلا قدم
ہی اٹھایا جا رہا ہے ہر خیال کی جماعت میں سے دو دو اعضا کا منتخب کرنا
جتھہ بندی کو ترقی دے گا، نہ کہ مصالحت کو، اور ایسی کمیٹی میں رائے شماری اور
ہار جیت کی طرف زیادہ اور مصالحت اور حصول اتفاق کی طرف کم توجہ منعطف
کی جائے گی۔ اس سے کہیں بہتر ہو گا کہ مسٹر جناح بحیثیت صدر کے اپنی مصالحانہ
کوششوں کو جاری رکھیں اور جس طرح انھوں نے مجھ سے، سر محمد شفیع سے اور
ڈاکٹر انصاری ہم تینوں کے ہم خیالوں سے اب تک گفتگو کی ہے اسی طرح
گفتگو کرتے رہیں، اور جن امور میں ان کی وساطت سے تبادلۂ خیالات ہو کر

اتفاق رائے حاصل ہو جائے، ان کو اسی طرح لیگ کی کونسل میں اور پھر لیگ میں پیش کر دیا جائے اور جن امور میں باوجود پوری کوشش کے اتفاق رائے نہ حاصل ہو سکا ہو ان کے متعلق مختلف تجاویز کو پیش کر دیا جائے تاکہ اعضائے لیگ جو کچھ بھی موجودہ حالت میں جبکہ وہ پوری ملت اسلامیہ کی حقیقی سیاسی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتے تاہم ان کے فیصلے کی وقعت ہو، ان مختلف تجاویز پر اپنا فیصلہ صادر کریں۔

جب مسٹر جناح نے میری رائے کو اچھی طرح سمجھا تو انھوں نے اس سے اتفاق کیا اور اپنے مساعی جمیلہ کو جاری رکھ کر مختلف الخیال اعضائے لیگ سے مسلمانوں کے مطالبات کے متعلق گفتگو کرنے اور ان کو حتی الوسع متفق کرنے کی ذمہ داری کو بحیثیت صدر لیگ قبول کیا اور جلسہ کامل اتفاق رائے کے بعد برخاست ہوا۔ دہلی کی مسلم کانفرنس کی تجاویز کے حامی ۲ اور ۳ مارچ کو حکیم محمد اجمل خاں صاحب کے دولت کدے پر جمع ہو کر انھی تمام امور کے متعلق گفت و شنید کرتے رہے، اور ۲۴ مارچ کو پھر وہیں مجتمع ہو گئے۔ ان میں سے جو مسلم لیگ کی کونسل کے اعضا تھے وہ کونسل کے جلسے میں شریک ہوئے اور ان کی اتفاق رائے سے کونسل کے ایجنڈے کی مدات کے فیصلے ہوئے۔ اس کے علاوہ ممبران اسمبلی میں سے پانچ حضرات کی ایک کمیٹی کانفرنس کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد سرگرمی سے جاری رکھنے کے لئے مقرر کی گئی جس کے اعضا کانفرنس کے دونوں معتمدین مولانا محمد شفیع داؤدی، مسٹر فاضل ابراہیم رحمت اللہ اور سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون، نواب محمد اسمٰعیل خاں اور ڈپٹی پریزیڈنٹ مولوی محمد یعقوب صاحب ہوں گے یہ بھی فیصلہ ہوا کہ چونکہ ۱۰ مارچ سے جو جلوس اور جلسے کئے جائیں گے وہ نہرو رپورٹ کی

ان سفارشات کی تائید ہی میں ایک پروپیگنڈا ہیں جنہیں جمعیت خلافت اور جمعیت العلماء مسلمانوں کی صریح حق تلفی سمجھتے ہیں اور مسلم لیگ بھی ان پر ہرگز مطمئن نہیں ہے، اس لئے مسلمانان ہند سے درخواست کی جائے کہ وہ جلوس اور جلسوں میں شرکت سے احتراز کریں۔

یہ بھی فیصلہ ہوا کہ جمعۃ الوداع اور عید الفطر کے موقعوں پر جہاں جہاں ہو سکے با اثر مسلمان جماعت کے سامنے دہلی کی مسلم کانفرنس کی تجاویز پیش کریں اور حاضرین کو سمجھائیں کہ کس بنا پر دہلی کی مسلم کانفرنس نے ان کو منظور کیا ہے اور اگر ہندوستان کے دستور اساسی میں ان کو داخل نہیں کیا گیا تو کس طرح مسلمانوں کی صریح حق تلفی ہوگی۔ اس غرض سے یہ خدمت میرے سپرد کی گئی کہ ایک واضح اور مفصل اعلان کا مسودہ تیار کر کے کمیٹی کے سامنے پیش کروں تاکہ ضروری ترمیمات کے بعد اسے شائع کیا جا سکے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے ظاہر ہے کہ ایک بار پھر امید بندھنے لگی ہے کہ مسلمان اپنے سیاسی اختلافات کو دور کر کے ایک منظم ملت کی حیثیت سے اپنے سیاسی مطالبات دنیا کے سامنے پیش کریں گے اور ہر اس جماعت اور قوت کا متحد ہو کر مقابلہ کریں گے جو مسلمانوں کی حق تلفی کرے یا اسے گوارا کرے۔ کلکتے کے مناقشات کے بعد امید کی یہ پہلی جھلک ہے۔ خدا کرے کہ یہ شعاع امید اس ظلمت کو بالکل دور کر دے جو آج مسلمانوں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

(۴) نہرو رپورٹ اور مسلم لیگ

ہمدرد ۳ اپریل ۱۹۲۹ء

میں تو "ہمدرد" میں آج سے بہت پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں کہ جب تک آل انڈیا مسلم لیگ کا دستور اساسی وہ انبار خرافات رہے گا جو وہ اس وقت تک ہے مسلمانوں کی زیست اور موت کے اس مسئلے پر جو نہرو رپورٹ نے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے، لیگ کا کوئی ریزولیوشن ملت اسلامیہ کا فیصلہ ہرگز نہ سمجھا جائے گا۔ اسی لئے میں نے ۳ مارچ کے لیگ کے کونسل کے جلسے میں عرض کیا تھا کہ ۳۰ و ۳۱ مارچ کو جو جلسہ منعقد کیا جائے وہ ایک خاص اور غیر معمولی جلسہ سمجھا جائے نہ کہ کلکتے کے سالانہ اجلاس کا ملتوی شدہ جلسہ جس میں کلکتے کے اجلاس کی ہدایت کے مطابق نہرو رپورٹ پر لیگ کی رائے ظاہر کی جائے اور اس خاص اور غیر معمولی اجلاس میں صرف اتنا کام کیا جائے کہ لیگ کے لئے ایک نیا دستور اساسی منظور کر لیا جائے اور لیگ کو ملت اسلامیہ کا صحیح طریقے پر سیاسی نمائندہ بنایا جائے اور جب ساری ملت اسلامیہ کے نمائندے اس کے اعضاء اور ارکان بن جائیں تب کلکتے کا ملتوی شدہ شاندار اجلاس پھر منعقد ہو۔ اس کی مخالفت مسٹر جناح نے صرف اس بنا پر کی تھی کہ لیگ میں جو افتراق دسمبر ۱۹۲۷ء میں واقع ہو گیا تھا اس کو دور کرنے کی طرف سب کی طبیعتیں اس وقت بہت زیادہ مائل ہیں اس لئے دونوں لیگوں کے ملانے میں دیر نہ کی جائے اور ۳۰ اور ۳۱ مارچ ہی کے جلسے میں دونوں لیگوں کے ارکان ایک ہی مکان کی چھت کے سایے تلے جمع ہو کر بیٹھیں اور نہرو رپورٹ پر مسلمانوں کا غور کردہ اور متفقہ فیصلہ صادر کریں۔

میں یہ بھی "ہمدرد" میں ظاہر کر چکا ہوں کہ میں نے اسی جلسے میں یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ اگر خدا نخواستہ اتفاق و اتحاد نہ واقع ہو اور اسی طرح انتشار و افتراق باقی رہے تو لیگ میں کثرت رائے سے منظور شدہ کسی ریزولیوشن کو ملت اسلامیہ کا قطعی فیصلہ نہ ظاہر کیا جائے۔ اس پر مسٹر جناح نے نہایت صفائی سے قبول کیا تھا کہ وہ صرف ان لوگوں کی اکثریت کا فیصلہ ہو گا جو اس میں ان کے ادھار لیے لیگ کے ارکان و اعضاء کی حیثیت سے شریک ہوں گے اور اس فیصلے کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ وہ ملت اسلامیہ کا فیصلہ ہے بالکل ناجائز ہو گا۔ یہ تمام باتیں ۲۰ مارچ کو لیگ کے دفتر میں اس کی کونسل کے اجلاس میں ان تمام حضرات کے روبرو ہوئی تھیں جو نہرو رپورٹ کو ملت اسلامیہ کا فیصلہ قرار دے رہے ہیں یا کم از کم ملت اسلامیہ پہ اس کے جلد سے جلد منوانے کا بیڑا اٹھا چکے ہیں اور ان میں سے ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا تھا اور ۳۰ اور ۳۱ مارچ کو کلکتہ لیگ کے اجلاس ملتوی شدہ کا جلسہ اسی امید پر منعقد کیا گیا تھا کہ وہ بھی اتفاق و اتحاد کے آرزومند اور متوقع ہیں اور ملت اسلامیہ کا حقیقی فیصلہ سننا چاہتے ہیں۔ نہ کہ نہروانی دستور کو جو ان کی من مانی چیز ہے، زبردستی ملت اسلامیہ کے سر چپکنا چاہتے ہیں۔ ۳۰ مارچ کی فضا نہایت ہی امید افزا تھی اور باوجودیکہ میں بصرہ نکیر پانچ چھ دن کا سفر طے کر کے ۱۱ مارچ ہی کو رنگون پہنچا تھا اور بجائے آرام کرنے کے جو میرے سفر کی بڑی غرض تھی، صبح و شام بلکہ دن رات ملی و ملکی کاموں میں مشغول رہا تھا اور اور بھی تھک کر چور ہو گیا تھا، ۲۳ مارچ کو عازم دہلی ہو گیا اور جہاز پر بھی تین دن متواتر لیگ کے لیے حسب وعدہ ایک معقول دستور اساسی وضع کرتا رہا اور بالکل خستہ و ماندہ ۲۹ کی نصف شب کے بعد گھر پہنچا اور ۳۰ کو لیگ کی کونسل کے جلسے میں شریک ہوا۔

مگر اب تو رنگ ہی دوسرا تھا۔ میں جس وقت جلسے میں پہنچا تو کچھ عجیب سی بے ترتیبی نظر آئی اور بعض اصحاب پریشان و حیرت زدہ اور بعض کو قہقہے لگاتے اور استہزا کرتے سنا۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے تو میرے عزیز دوست مسٹر رفیع احمد قدوائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ دہلی کے ایک صاحب نے ہیں بیٹھے بیٹھے ۱۰۰ نئے ممبروں کے نام ہندوستان کے مختلف صوبوں کی طرف سے پیش کر دیے ہیں اور ان کی منظوری کے خواستگار ہیں۔ اسی وقت ڈاکٹر کچلو نے درخواستوں کے فائل میں سے ایک اور نام پڑھا اور میرے ایک عزیز دوست تصدق احمد خاں صاحب شیروانی نے اس کی منظوری کے خلاف آواز بلند کی اور صدر جلسہ نے اس کی نامنظوری کا اعلان کیا۔ اسی طرح اور ایک نام پڑھا گیا جس پر کسی نے کہا کہ انھیں کوئی بھی نہیں جانتا اور اس پر بھی نامنظوری کا اعلان کیا گیا۔ پھر ایک تیسرا نام پڑھ کر سنایا گیا اور اسی طرح شیروانی صاحب کی جماعت میں سے کسی نے اس پر بھی اعتراض کیا مگر کسی اور نے جو ان کی جماعت میں نہ تھا کہا کہ میں ان کو جانتا ہوں تاہم یہ نام بھی نامنظور ہوا۔ میں نے جناب صدر کے سامنے چھوٹتے ہی یہ تجویز پیش کر دی تھی کہ نئے ممبروں کا انتخاب بالکل نہ کیا جائے اور اسے نئے دستور اساسی کے منظور ہونے تک ملتوی کیا جائے اور یہ بھی عرض کیا تھا کہ پچھلے جلسے میں بھی میں نے یہی درخواست کی تھی اور اس وقت وہ منظور کی گئی تھی۔ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد اور ان کی اور شیروانی صاحب کی جماعت کے لوگ بہ ظاہر میری تجویز کے مؤید تھے مگر اس وقت یہ ذکر چھڑا کہ ۲ مارچ کے جلسے میں فقط لیگ کی کونسل کے لئے نئے ممبروں کا انتخاب ملتوی کر دیا گیا تھا مگر خود لیگ کے ممبروں میں اس جلسے میں بھی اضافہ کیا گیا تھا۔ میں نے اس سے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ میں شروع سے آخر تک جلسے میں موجود تھا مگر

کسی نئے ممبر کا لیگ کے لیے میرے سامنے انتخاب نہیں ہوا بلکہ میری درخواست کہ تمام انتخابات نئے دستور اساسی کی منظوری تک ملتوی رکھے جائیں منظور کرلی گئی تھی۔ اس پر مولانا ابوالکلام صاحب آزاد اور عبدالرحمٰن صاحب غازی نے کہا کہ انھوں نے ذکر میں نے انتخابات کی مخالفت کی تھی مگر وہ لیگ کے کونسل کے ممبروں تک ہی محدود ہوئی تھی اور لیگ کے ممبروں کا انتخاب ضابطے کی خانہ پری کے طور پر عمل میں آیا تھا۔ جب میں نے پھر اصرار کیا کہ کسی کا نام ہمارے سامنے پیش ہی نہ ہوا تھا انتخاب کیوں کر ہوتا تو دوسری طرف سے کہا گیا کہ ڈاکٹر کچلو فہرست سنانا چاہتے تھے مگر یہ کہہ کر انھیں روک دیا گیا تھا کہ یہ تو لیگ کا دستور ہے کہ جو نئے نام پیش کیے جائیں ان کی ممبری منظور کرلی جائے، پھر فہرست پڑھنا فضول ہے سب کا انتخاب منظور تصور کیا جائے۔

میں نے اور میرے ساتھ دس یا بارہ اعضائے کونسل نے اسے صحیح تسلیم کرنے سے انکار کیا، مگر جب جناب صدر نے کہا کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ پوری فہرست بغیر ناموں کے پڑھے ہوئے حسب دستور سابق منظور کرلی گئی تھی تو مجبوراً میں خاموش ہوگیا۔ اس پر جناب صدر نے فرمایا کہ میں تو اب بھی سب حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ یہ انوکھی بات نہ کریں کہ جو فہرست نئے ممبروں کی آج انتخاب کے لیے پیش کی گئی ہے اس کے قبول کرنے سے انکار کریں بلکہ حسب دستور سابق فہرست کے سب نام قبول کرلیے جائیں، اگر آپ میری اس التجا سے بالکل متاثر نہ ہوسکیں تو پھر جو نام باقی رہ گئے ہیں وہ بھی پڑھ دیے جائیں اور ان کے متعلق بھی رائے لی جائے۔ فہرست کے بڑے حصے پر غور ہو ہی چکا ہے، تھوڑی دیر میں باقی حصے پر بھی غور کرلیا جاسکے گا۔ اس اپیل کا شیروانی صاحب کی جماعت پر کوئی اثر نہ ہوا اور فہرست کے باقی ماندہ نام بھی پڑھے گئے۔ میں اس طرح انتخاب

کا اصول قائل نہ تھا اور اس کو بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی شخص دہلی ہی میں بیٹھے
بیٹھے ہندوستان کے سارے صوبوں میں سے سو سے اوپر اشخاص کو ان کا نمائندہ
اس طرح بنوا دے، اور گو میں حیرت زدہ تھا کہ کس طرح غالباً ۱۰۰ نئے ممبر میرے
ہوتے ہوئے ۲۰ مارچ کے جلسے میں منتخب کر لیے گئے تھے حالانکہ کسی نے ان کے
نام تک نہ سنے تھے اور وہ غالباً سب کے سب شیروانی صاحب کی جماعت
کے طرف دار تھے اور ان کی اور ان کی ہی جماعت کی تحریک پر اس طرح
منتخب ہوئے تھے اور اس لئے میرے بھی جی میں آیا کہ میں بھی اس جلسے میں
پیش شدہ فہرست کے باقی ماندہ ناموں کی منظوری کے لئے ہاتھ اٹھاؤں۔ مگر
میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی، اور میں نے باوجود سخت غم و غصے کے اس سے
احتراز کیا، البتہ صرف دہلی کے ایک علاوہ سوہن فروش صاحب کے لئے جو
استہزاءً ہاتھ اٹھا دیا اور وہ غالباً ممبر منتخب کر لیے گئے۔ اس پر رفیع احمد صاحب
قدوائی نے ارشاد فرمایا کہ مولانا کا ہاتھ بھی بالآخر اٹھ ہی گیا، اٹھنے سے رک
نہ سکا۔ مجھے اس وقت معلوم نہ تھا کہ ان بزرگ نے مجھے دھوکا دیا تھا اور دہلی
کے کسی آدمی نے بھی یہاں بیٹھے بیٹھے ۱۰۰ نئے ممبروں کے نام انتخاب کے لئے
پیش نہیں کر دیے تھے بلکہ متعدد حضرات نے اپنے دوستوں اور واقف کاروں
کے نام ان سے دریافت کر کے اور ان کی اجازت سے پیش کیے تھے اور یہ اس
لئے کہ خود جناب صدر مسٹر جناح نے ان سے کہا تھا کہ لیگ کے ممبروں کی تعداد
کو بڑھایا جائے اور بعض حضرات تو صرف کثیر کے بعد اپنے گھروں سے دہلی تک
یہی سمجھ کر آ بھی گئے تھے کہ ہمارا ۲۰ کے جلسے میں انتخاب ہو جائے گا اور ہم ۳۰
اور ۳۱ مارچ کے اجلاس میں پورا حصہ لے سکیں گے۔ جب میں نے رفیع احمد
صاحب قدوائی سے دریافت کیا کہ یہ ۱۰۰ کی تعداد کے متعلق انھوں نے

مجھے کس بنا پر اطلاع دی تھی انھوں نے فرمایا کہ یہ تو Figure of Speech تھا۔ Figure انگریزی میں تعداد کو کہتے ہیں اور Figure of Speech جس کے لفظی معنی "محض بول دینے کی تعداد" ہیں، استعارے کو کہتے ہیں۔ میں رفیع احمد صاحب قدوائی کے .... کا پہلے سے بھی قائل تھا لیکن اب اس کا بھی قائل ہو گیا کہ وہ صرف ...... ہی نہیں ہیں بلکہ پنڈت موتی لال نہرو کے ایک .... بھی ہیں اور جو کام ان کے سپرد کیا گیا ہے وہ کام نکالنا بھی خوب جانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اثر میرے قلب پر ڈالنا چاہا تھا وہ اس پر پڑ گیا تھا حالانکہ وہ ہرگز پڑنا نہ چاہیے تھے اور مولانا شفیع داؤدی جن کو رفیع احمد صاحب یقیناً بہت سادہ لوح ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ سمجھتے ہیں وہ رفیع احمد صاحب کا اس قسم کی ٹیکنیکی چالوں میں ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر شفیع صاحب اس قدر سادہ لوح ہوتے تو وہ میرے جلسے میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنی اور اپنے دوستوں کی فہرست امیدواران عضویت ورکنیت کے متعلق حقیقی حالات سے مطلع کر دیتے اور میں ان سب حضرات کے انتخاب پر زور دیتا اور خود بھی جتنوں کے لیے ممکن ہوتا ہاتھ اٹھاتا۔

حقیقتاً جو غلط اثر میرے قلب پر رفیع صاحب نے ڈالا وہ زیادہ تر اس فہرست ہی سے میرے قلب پر پڑنا چاہیے تھا جسے نہروانی پارٹی نے ۳ مارچ کو پیش کیا تھا اور جو اس طرح تیار کی گئی تھی کہ ہر صوبے کے ممبروں میں یہ پارٹی تھوڑی سی اکثریت حاصل کرے تاکہ جب رائے شماری کا وقت آئے اور لیگ کے دستور اساسی کے مطابق صوبے وار تناسب کا خیال رکھ کر رائیں گنی جائیں تو فتح نہروانی پارٹی ہی کو ہو۔ اس لئے ریاستوں سے چار نہایت ہی غیر معروف حضرات ممبر بنائے گئے تھے جنھوں نے ۳۰ مارچ کے اجلاس میں بغیر

شوکت صاحب کو یا مجھے یا میری بیوی کو یا کسی اور ممبر کو جو کسی ریاست کا باشندہ ہو مدعو کئے ہوئے اپنے تئیں سبجکٹ کمیٹی کا ممبر منتخب کر لیا اور اسی باعث ریاستوں کی طرف سے اس فہرست کے پیش ہونے پر حیرت زدہ ہو کر میں نے احتجاج کیا تھا اور تب جا کر از سر نو انتخاب کے لیے ریاستوں کے ارکان مدعو کئے گئے اور گو اس وقت بھی یہ نئے اعضائے اربعہ سب کے سب موجود نہ تھے، صرف تین دہلی کے ایک اہل حدیث بھائی کو دستیاب ہو سکے تھے انتخاب چاروں ہی کا تسلیم کر لیا گیا، حالانکہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ چاروں اعضائے لیگ ریاستوں سے آئے تھے اور چاروں جگہیں خالی تھیں اس لیے سب کے سب کا لازمی طور پر انتخاب تسلیم کر لیا گیا۔ کیونکہ کم سے کم بارہ تیرہ برس سے میری اہلیہ بھی اس لیگ کی ممبر چلی آتی ہیں اور وہ باوجود ممبری کی فیس ادا کرنے اور جلسے میں شریک ہونے کے، مردوں کے حصے میں نہیں بیٹھی تھیں بلکہ وزیٹروں کے حصے میں جو مستورات کے لیے مخصوص تھا، بیٹھی ہوئی تھیں اور انتخاب میں حصہ بھی لے سکتی تھیں۔ اسی ایک مثال کو پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ متعدد مثالیں اسی قسم کی ہیں اور پنجاب کے نام نہاد خلافت کمیٹی کے "آغائے"..... کی جگہ لیگ میں آنریبل شاہ زبیر صاحب کے باورچی نے لی تھی جو سنا گیا ہے کہ لیگ کی کونسل کے ممبر ہیں اور ڈائس پر رونق افروز تھے اور یا تو کونسل آف اسٹیٹ میں یا کم از کم اسمبلی میں صوبہ بہار کی طرف سے منتخب ہو کر آئیں گے یا شاید تخت افغانستان پر "بچہ سقہ" کے جانشین ہوں گے۔

اب ساری دنیا دیکھ سکتی ہے کہ ایک طرف تو خود اس طرح اور اس قسم کے نئے ممبر بنائے جاتے ہیں، دوسری طرف اس طرح سے دوسرے نئے ممبروں کے انتخاب میں روڑا اٹکایا جاتا ہے اور پھر "شفیع لیگ" کے ممبروں کو

اپنی لیگ میں داخل نہیں کیا جاتا حالانکہ ۳۰ اور ۳۱ مارچ کا جلسہ صرف ہمارے لیگ
کے ممبروں کی شرکت کے لیے منعقد نہیں کیا گیا تھا بلکہ صریحاً دونوں لیگوں کے
ایک مکان میں متحد ہو کر اجلاس کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ اب جبکہ اسی
طریقے پر ایک نہایت ہی مختصر سی اکثریت کے متعلق اس نہروانی پارٹی کو اطمینان
ہو گیا تو ہمارے اتفاق و اتحاد کے لیے التجاؤں کو ٹھکرایا جاتا ہے۔ شیرانی صاحب
ایک جماعت کو سائمن کمیشن کا پرستار ٹھہراتے ہیں تو ایک اور صاحب جنہیں شیرانی
صاحب نے ماں اور بہن کی گالیاں دیتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا ہے
اور جنہیں نہایت ہی گندی دھمکیاں مجھے برسر اجلاس دیتے ہوئے اور ایک
دوسرے پنجابی بزرگ کو میری بیوی کے متعلق بھی بدزبانی فرماتے ہوئے سن کر
وہ خود دوڑ پڑے تھے اور جلسہ چھوڑ کر چل دیے تھے (حالانکہ ان کے شائع کردہ
بیان میں اس کا ایک حرف بھی اپنی نہروانی جماعت کے خلاف ڈاکٹر محمد عالم
صاحب" اور "پنجابی" دہلی کے کارفرما مولوی عبدالقادر صاحب قصوری نے
آنے نہ دیا تھا) ہم سب کو قرآنی اصطلاح میں "خبیث" اور اپنی نہروانی
جماعت کو "طیب" یعنی مسلمانوں کے حقوق کی حامی جماعت کو کافر اور
ہندو سبھا کی حکمرانی سے مرعوب اور ہندوؤں سے مغلوب جماعت کو مسلم ٹھہراتے
ہیں۔ ۳۱ مارچ کی صبح کو میری منت سماجت پر مطلق التفات نہیں فرمایا گیا
حالانکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ساری عمر میں اس قدر منت سماجت میں نے کسی
جلسے میں کسی کی نہ کی تھی۔ مفتی کفایت اللہ صاحب نے بھی عرض معروض کرنا
چاہی تو چونکہ وہ کونسل کے ممبر نہ تھے حالانکہ شاہ زبیر صاحب کے باورچی کو
یہ اعزاز حاصل تھا ان کو موقع نہ مل سکا باوجودیکہ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد
نے بھی جو بظاہر اپنے تئیں مددگارِ صدر ظاہر کرنا چاہتے تھے اور ایک ایسی ہی

کرسی پر جلوہ فگن تھے جو عہدیداروں کے لئے صدر کے ایک جانب میز کے پاس بچھائی جاتی ہے مفتی صاحب موصوف کی سفارش فرمائی۔ مولانا شوکت علی صاحب کی تقریر کا بھی جس میں صاف ظاہر کیا گیا تھا کہ اصل فیصلہ اس جلسے میں نہ ہوگا بلکہ اس کے باہر ساری ملت اسلامیہ ہی کرے گی مطلق اثر نہ ہوا اور لدھیانوی صاحب کی...... پر آقائے ظفر الملت والدین کی ....
.... کا نظارہ مستورات تک نے دیکھ لیا تو مجبور ہو کر مولوی محمد یعقوب صاحب نے بلا مجھ سے اور بہت سے اور اپنے ہم خیالوں سے مشورہ کئے اس کا اعلان کیا کہ جب کارروائی اس انداز سے کی جا رہی ہے اور نہرو والی پارٹی کی ذہنیت یہ ہے تو ہم لوگ اسی کو مناسب سمجھتے ہیں کہ جلسے کو انھیں کے ہاتھوں میں چھوڑ کر چلے جائیں۔ چونکہ یہ اعلان ہم میں سے اکثر کے مشورے کے بغیر ہوا تھا اس لئے بعض تو اخیر تک جلسے ہی میں رہے بعض دیر تک بیٹھے رہے اور عارضی التوا وغیرہ کے لئے کوشاں رہے مگر اکثر (اور ان میں میں بھی شامل تھا) اسی وقت اٹھ کر چلے آئے اور ہمارے کل ہم خیالوں کی تعداد ساٹھ ستر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ جس چیز نے مجھے اٹھ کر چلے آنے پر مجبور کر دیا وہ کیا تھی؟ وہ یہ اندیشہ تھا کہ اگر اپنی قلیل اکثریت کے گھمنڈ میں لدھیانوی صاحب کی طرح اور...... بھی اپنی...... کا ثبوت دینے لگے تو کہیں دوسروں کے صبر کا پیالہ بھی لبریز نہ ہو جائے اور ایک ایسے جلسے میں جو دہلی میں کیا جا رہا تھا جس کے اخراجات کے لئے ہم لوگوں نے روپیہ بھی صرف کیا تھا جو یقیناً ہماری شرکت کے بغیر اتنی جلد منعقد نہ ہو سکتا تھا اور جس کے ایک طرح ہم میزبان اور باہر سے آئے ہوئے اصحاب ہمارے مہمان تھے، اس میں کوئی فساد نہ ہو جائے اور اس کا اثر اہل دہلی پر اسی طرح نہ پڑے جس طرح ایک بار میرے یورپ کے

عمر کے زمانے میں پہلے ایک نہرو انی جلسے کا بڑا تھا اور وہ مفتری جنھوں نے کلکتہ خلافت کے جلسے میں خود فساد برپا کرکے ہم کو مفسد اور لفنگوں کے ساتھ پہلے سے ساز باز کرنے والا ٹھہرایا تھا ہم کو ایک بار پھر بدنام کرنے کی کوشش نہ کریں اور بالآخر اس احتیاط کے باوجود بھی لیگ کے اجلاس کا حشر کیا ہوا ؟ اس چھوٹی جماعت کی سیاسی چال بازیاں اسے خود کب چین لینے دیتی ہیں؟ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگی بڑا بیوقوف شور بے سے نہ کھائے؟ ایک بار ایک مختصر سی اکثریت مسلمانوں کی ایک جماعت میں اسے نصیب ہو جائے اور وہ سب مسلمانوں کی قسمت کا آخری فیصلہ کرائے بغیر چھوڑ دے یہ کیسے ہو سکتا تھا ؟

لہٰذا صدر کی چند منٹ کی تعویق سے فائدہ اٹھا کر اس نے اس نئے .... ڈاکٹر محمد عالم کو بلا حاضرین جلسہ کی منظوری کے کرسی صدارت پر بٹھا دیا اور عبد الرحمٰن صاحب غازی کی ایک تحریک کو بلا اس کے پڑھے جانے یا اس کے سنے جانے یا اس کی تائیدی تقریر کے کئے جانے یا سنے جانے یا صدر تک آئی ہوئی کسی ترمیم کے پیش کیے جانے، پڑھے جانے یا سنے جانے، اور بلا کسی کی رائے مانگے جانے، دیے جانے یا شمار کیے جانے، اور صوبے وار تناسب کے مطابق اس کا حساب کئے جانے جو قواعد لیگ کے مطابق لازمی ہے اس کا منظوری کا "بقول خود برعم خود" اعلان کر دیا۔ پھر کیا تھا! ساری لیگ کی ہستی اسی لئے تھی کہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کی ایک جماعت ہی کسی نہ کسی طرح قبول کرے اور لیگ کیا ساری ملت اسلامیہ کا وجود اسی لئے تھا اور یہی نہیں بلکہ اس رپورٹ کی منظوری ہی باعث تکوین دو عالم تھی اور اقلیدس کی اصطلاح "Quod Erat Faciendum" Q.E.F. (Quod Erat Faciendum)

یہ جو کرنا تھا اور اب یہ کر لیا گیا، لہٰذا "المقبول نازہ" .... "و برعم خود" الجلسہ

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برخاست ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو بیانات شائع ہوتے ہیں ان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جلسہ مسٹر جناح کے آنے تک شروع ہی نہیں ہوا تھا، محمد عالم صاحب ممبران لیگ نے ہرگز بطور عارضی صدر کے قبول نہیں کیا تھا، انھوں نے زبردستی اور سراسر خلاف قاعدہ کرسی پر قبضہ کرلیا اور مسٹر جناح کے آنے تک ساری کارروائی غلط اور قابل صد احتجاج تھی اور جن لوگوں نے احتجاج کیا وہ سب کا سب اسی کارروائی کے خلاف تھا اور بالکل جائز تھا گو ممکن ہے کہ مشتعل ہوکر کسی نے ایسے الفاظ اپنے منہ سے نکالے ہوں جو ایسے موقع پر بھی کسی کو نہ نکالنے چاہئیں۔ مسٹر جناح کے آتے ہی سب احتجاج کرنے والے خاموش ہوگئے اور جلسہ کی کارروائی باضابطہ شروع ہوئی اور بلا کسی تجویز کے منظور کرائے ہوئے مسٹر جناح نے جلسے کو بلا تعین وقت ملتوی کردیا۔ ملتوی شدہ اجلاس کے انعقاد کے لئے کونسل جلسہ کرنے والی تھی اور یکم اپریل کو ۹ بجے اس کا جلسہ منعقد کیا گیا اگرچہ نکہ اب وہ "بیچو بچا" کی اکثریت موجود نہ تھی، حاضرین میں سے بھی نہرو انیوں نے دبی زبان سے عرض کیا کہ ہماری جماعت کو اس کی اطلاع نہ تھی کہ آج ۹ بجے جلسہ ہوگا اور ڈاکٹر کچلو سے زیادہ کسی کے نزدیک ان کا یہ عذر مسموع ہوتا چنانچہ سکریٹری نے جس کا ....

کے حصول کے لئے ہر اصول سے بے نیازی اور ذرا سی محنت سے بھی سخت پرہیز آج اظہر من الشمس ہے اور جس کا اسی واقعے کے متعلق دیا ہوا بیان اس کے دل و دماغ کا صحیح ترین آئینہ ہے اور غم و غصے سے زیادہ آج بھی مضحکے ہی کا مستحق ہے سب کچھ قبول کرلیا اور کونسل کے سو سے زیادہ ممبروں کو یکم اپریل کو بے وقوف بنا کر دس منٹ میں لیگ کے دفتر سے نکال باہر کیا۔ کاش ۱۰ مارچ کو ہی کہہ دیتے کہ یہ تماشہ بعد ایک فصل کے ختم ہوتا اور ۳۱ مارچ کی ٹریجڈی

دیکھنے والے یکم اپریل کی کومیڈی دیکھنے کے لئے آنے پر مجبور نہ کئے گئے ہوتے۔
اب اس لیگ کا بھی خاتمہ ہوا اور نہرو رپورٹ کا بھی اور کانگریس کا بھی۔
جس کو اس میں شبہ ہو وہ ہندو مہا سبھا اور سکھ لیگ کے جلسوں کی کارروائی کو بھی
پڑھ لے۔ موتی لال جی تو شاید کسی خدا کے بھی قائل نہیں ہیں لیکن جو ہندو دھرم
کے دیوتاؤں کو آج بھی مانتے ہیں وہ تو ضرور قیاس کریں گے کہ تباہ و برباد
کرنے والے شیو جی نے شاید نہرو والی کے روپ میں جنم لیا ہے اور اس ویرانہ
ساز نے سارے کارساز دشمنوں کی کارسازیوں کا خاتمہ کر دیا۔

رُودادِ چمن

(کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ (دسمبر ۱۹۲۸ء) کے بعد مولانا نے کانگریس کی سیاسیات سے قطع تعلق فرمایا تھا۔ اس علیحدگی کے تاثرات، کانگریس سے بیزاری کے اسباب اور اپنی سیاسی زندگی کی تمام سرگذشت "رُودادِ چمن" میں قلم بند فرمائی ہے۔ مرتب)

کہ دیار غیر سے زیادہ خود اپنے وطن میں غریب الوطن ہوں۔ انھیں کانوں سے جن سے آج اپنی ہجو سن رہا ہوں اپنی تعریف میں ہزاروں قصیدے بھی کبھی سن چکا ہوں۔ ان عجیب و غریب تجربوں کے بعد سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ملک و ملت کی خدمت کا آغاز اپنے پرانے کالج مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کو جامعہ ملیہ بنانے کی کوشش اور مسلم لیگ کی بنیاد ڈالنے سے کیا تھا پھر جدید لکھائی شروع کی اور "کامریڈ" اور "ہمدرد" کو جاری کیا۔ جب عالم اسلام پر پیہم مصیبتوں کا نزول ہونے لگا تو "خدام کعبہ" کی بنیاد ڈالی۔ جنگ طرابلس کے زمانے میں مظلوم ترکوں کی اعانت و امداد کے لئے فنڈ کھولا۔ جنگ بلقان میں خود کشی کرتے کرتے بچا تو طبی وفد کو چیتا لیہ اور درد انیاں کو روانہ کیا۔ جنگ عمومی میں پہلے اپنے پریس کی وہ ضمانت ضبط کرائی جو کانپور کی مسجد کے شہید کیئے جانے اور اس کی صدائے احتجاج بلند کرانے پر طلب کی گئی تھی اور پھر خود بھی نظر بند اور بعد میں جیل خانے میں قید ہو گیا۔ اس قید و بند کے زمانے میں میرے رفقائے کار نے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کو کلیتہً حکومت اور حکومت پرستوں کے حوالے کر دیا اور ہمارے منٹو اصلاحات کے زمانے کے جداگانہ اور مخلوط حلقہائے انتخاب کی جگہ مسلم لیگ کے ذریعے مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے صرف جداگانہ حلقہائے انتخاب قائم کرا دیئے اور مخلوط انتخاب کو جن کا مجھے شدید ترین مخالف اور اپنے تئیں یکا حامی بنایا جا رہا ہے حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور بنگال و پنجاب کی مسلم اکثریتوں کو اقلیتوں میں تبدیل کرا کے اس خداداد نعمت کو ٹھکرا دیا

جو فاتحین اور مبلغین اسلام کا طفیل تھی اور ان کی جگہ اور صوبوں کی اقلیتوں میں چند مقابلۃً بیکار نشستوں کا اضافہ کرا دیا۔ یہ تھی وہ روداد چمن جو پہلی بار کی گرفتاری میں مجھ سے قفس میں کہی گئی تھی۔

میرے قید و بند کے زمانے میں ملک وملت کو جن مصائب کا شکار بنا پڑا تھا انھیں کے صدقے میں قوم و وطن میں ایک بیداری بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس بیداری سے جہاں تک فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا اٹھایا گیا اور ایک طرف ترکوں کو اس غلامی سے نکلنے میں پوری مدد دی گئی جس میں ان کی مدد سے محروم رہ کر ہم خود ساٹھ ستر برس پیشتر مبتلا ہو چکے تھے اور دوسری طرف اپنے تئیں بھی اس غلامی سے نکالنے کا سامان فراہم کیا گیا مگر ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہا سبھائی مہاراشٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت کو بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد باردولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈال دینے کے مرادف سمجھا اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دئے گئے۔ ان کے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آنجہانی آزاد ہوئے اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے، جس کا یادش بخیر اب پھر کلکتے میں نام لیا گیا ہے گیا میں سوراج کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا گیا جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لطف یہ کہ ہندو مہا سبھائیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں جنھوں نے ان مذہبی تعصبات کی آگ کو بھڑکا دیا جنھیں ہم پھر ٹھنڈا کر چکے تھے اور ان کے جواب میں مسلمانانِ پنجاب میں سے اسی عنصر

نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے زبانی جمع خرچ دکھانا شروع کیا جو آج وطن پرستی اور
ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے۔ اس طرح ہمارا کیا کرایا سارا کام اکارت گیا اور
جب مجھے جیل خانے ہی میں اس کا احساس ہوا تو میں نے اس طرح اس کا
اظہار کیا ؎

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

یہ وہ روداد چمن تھی جو دوسری گرفتاری سے رہائی پر میں نے آکر سنی اور
جس کے متعلق میں نے جیل خانے ہی میں لکھ دیا تھا کہ ؎

ہوا تھا قید فصل گل میں جو مرغ اس گلشن میں
قفس سے چھٹتے ہی صید غم جور خزاں پایا

جس "فصل گل" کا اس شعر میں ذکر کیا گیا ہے اس کے پیدا کرنے میں
ہمارا جو حصہ تھا وہ آج بھی کسی سے مخفی نہیں مگر جس جور خزاں کا اس میں ذکر
کیا گیا ہے اس میں مطلق ہمارا حصہ نہ تھا' نہ ہم نے ڈاکٹر منجے' مسٹر اینے اور مسٹر
کیلکر کی طرح مہاتما گاندھی کے خلاف مہاراشٹر کی اس بغاوت میں حصہ لیا تھا جو
بالآخر پنڈت موتی لال نہرو کے خلاف بھی بغاوت کی شکل میں "جوابی تعاون"
کے لاجواب نام سے ظاہر ہوئی۔ نہ ہم نے باردولی کی کایا پلٹ میں حصہ لیا تھا
جو مہاتما جی کے وائسرائے کو الٹی میٹم کے بعد "یا آں شور اشوری یا بایں بے نمکی"
کا مصداق ہوئی اور جس نے عدم تعاون کی تحریک کو یک بیک ٹھنڈا کر دیا' نہ ہم نے
گیا میں اس تحریک کے خلاف پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے سوراجی ساتھیوں
کی طرح علم بغاوت بلند کر کے حصہ لیا اور نہ پنڈت مدن موہن مالوی اور سوامی
شردھانند آنجہانی کی طرح ہندو مہاسبھا کی قائم کردہ سنگھٹن اور شدھی کی تحریکیں

میں حصہ لیا اور نہ ڈاکٹر کچلو اور ان کے پنجابی مسلم رفقائے بیکار کی طرح تبلیغ و تنظیم کے نام سے اپنا ڈھنڈورا پیٹا۔ آج یہی حضرات کلکتے کی تماشا گاہ میں وطن پرستی کا سوانگ بھر رہے ہیں یا وہ چند کانگریسی مسلمان ہیں جو یا تو اس تمام زمانے میں آزاد رہے یا کم سے کم ہم سے کہیں جلد آزاد ہو گئے، مگر جو نہ سوراجیوں اور تارکین تعاون کی تفریق کو روک سکے نہ ہندو مسلم تفریق کو۔ تفرقہ پردازی، فرقہ وارانہ جدوجہد اور مذہبی اور ملی تعصبات کا الزام آج ہم پر تھوپا جاتا ہے لیکن یہ بہتان لگانے والے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ ہمارے لگائے ہوئے چمن اتحاد کو ہمارے قید و بند کے زمانے میں آخر کس نے ویران کر دیا تھا۔ میں نے تو قید سے چھوٹتے ہی اس تفرقہ پردازی تک کا خاتمہ کرنا چاہا جس کی علت العلل موتی لال نہرو اور ہمارے رفقائے کار میں سے بہت سے مسلمان تھے، جنھوں نے گیا میں فئۃ باغیۃ کی شکل اختیار کی تھی اور جس کا جھگڑا چکانے کے لئے دہلی کا اسپیشل سشن منعقد کیا جا رہا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے سوراجیوں کو کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت نے جو کچھ سوراج دلوا دیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس شرکت پر پنڈت جی کو جو آج کانگریس کے صدر ہیں اتنا اصرار تھا کہ انھوں نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کانگریس نے اس شرکت کی اجازت نہ دی تو میں کانگریس کے گرد اگرد دو سو میل کے احاطے میں بھی کبھی قدم نہ رکھوں گا۔ ایسے باغی کو جمہوریت کی طرف سے جو سزا ملنی چاہئے وہ پنڈت جی خود ہی تجویز فرما سکتے ہیں کیونکہ "پارٹی ڈسپلن" کے نام سے ان کی جباری اور قہاری مشہور ہے دگو ہندو مہاسبھائیوں سے وہ ہمیشہ ہی جھکتے رہے)۔ میں نے اس خیال سے اپنی پارٹی سے طوعاً و کرہاً اس شرکت کی آج کے خداوند کانگریس و کنونیشن کو اجازت دلوائی کہ کہیں پھر وہ جیل سے نکل کر مہاتما گاندھی شکایت نہ کریں کہ

تم نے کانگریس سے اتنی بڑی اقلیت کو کیوں نکال دیا اور کانگریس کے دو ٹکڑے کیوں ہونے دئے، ورنہ میرا قیاس ہے کہ دہلی میں بھی اور مجھے کیا ہر شخص کو یقین کامل ہے کہ کوکناڈا میں موتی لال جی کو شکست فاش نصیب ہوتی اور کونسلوں میں جاکر گدے دار کرسیوں پر براجنے اور ملک کا اور اپنا روپیہ اور وقت ضائع کرنیوالے کانگریس کے فرش پر ۱۹۲۳ء کے بعد ہرگز نظر نہ آتے۔ جب مہاتما گاندھی یرودہ جیل سے چھوٹے اور جوہو میں آرام کرنے لگے تو ہماری پارٹی والوں نے مہاتماجی کو سوراجیوں کے خلاف اتنا ابھارا کہ احمد آباد کی کانگریس کمیٹی کے جلسے میں مہاتماجی نے انھیں کانگریس کمیٹی تک سے نکالنے کی کوشش کی اگو میں تو دھتکار کران کو اپنی مجلس عاملہ تک میں داخل کر چکا تھا۔

ہماری کوششوں سے مہاتماجی اس کارروائی سے باز آئے مگر اس کے جلسے میں ہماری پارٹی نے میرے منہ پر مہاتماجی سے میری اس طرح شکایات کی کہ اس کا سننا گالیاں کھانے سے بھی مجھے کم گوارا ہونا چاہیے تھا اور یقیناً مہاتماجی خود بھی ان شکایت کرنے والوں کا دل بڑھا رہے تھے۔ باوجود اس کے جب مہاتماجی کے برت کے بعد حکومت بنگال نے حکومت ہند اور وزیر ہند کی اجازت سے سوبھاش چندر بوس اور ان کے سوراجی رفقائے کار کو بلا مقدمہ چلائے قید و بند میں مبتلا کر کے جلاوطن کر دیا تو میں نے مہاتماجی کو آمادہ کیا کہ وہ باوجود اپنی کمزوری کے کلکتے تشریف لے جائیں اور حکومت اور سوراجیوں اور دنیا پر صاف ظاہر کر دیں کہ ہماری پارٹی اس معاملے میں سوراجیوں کے ساتھ ہے۔

مہاتماجی نے اصول جمہوریت کو نظر انداز کر کے تن تنہا یہ فیصلہ کر دیا اور سوراجیوں کو سنا دیا کہ کانگریس کو اب ان کے سپرد کر دیا جائے گا اور طوعاً و کرہاً ہم نے اسے بمبئی کے جلسے میں قبول بھی کر لیا اور میں نے اسی دیرینہ امید پر اس کی تائید

"کمرنڈ" میں بھی کی کہ ایک نہ ایک دن سوراجی کونسلوں میں شرکت کی حماقت سے تنگ آکر ملک میں کام کرنے کے لئے ہم سے آملیں گے اور عدم تعاون کی تحریک پھر زور پکڑے گی اور جو تفریق کی خلیج ہمارے اور ان کے درمیان گیا ہے لے کر اس وقت تک حائل چلی آتی ہے وہ حائل نہ رہے گی۔ مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ مہاتما جی 'تارکینِ تعاون' 'سوراجی' جوابی تعاون والے اور وہ لبرل جنھوں نے حکومت کے ساتھ تعاون کرکے تارکین تعاون کو مہاتما جی سمیت جیل بھجوایا تھا سب ڈومینین اسٹیٹس اور مہاسبھائیت پر راضی ہو جائیں گے اور وطن دوست اور حامیانِ اتحاد کہلائیں گے اور سارے ہندوستان میں اگر کوئی تفرقہ پرداز، اتحاد کا دشمن اور وطن کے خلاف غدار رہے گا تو اس کا نام یا شوکت علی ہوگا یا محمد علی!

مہاتما جی جب یرودہ جیل سے چھوٹے تھے تو انھوں نے اخبارات کے ذریعے سے ایک پیغام میرے نام ارسال فرمایا تھا جس میں ارشاد کیا تھا کہ جو تفریق ہندو مسلمانوں میں پڑگئی ہے اس کے مٹانے ہی سے تم اپنی صدارت کانگریس میں کامیاب سمجھے جا سکتے ہو۔ میں نے اس تفریق کے مٹانے میں جس قدر کوشش کی اس کے متعلق میں فیصلہ خدا ہی پر چھوڑ سکتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ خدائے عالم الغیب والشہادہ اس کام میں میری جد و جہد کو کسی ہندو اور کسی مسلمان سے کم نہ ٹھہرائے گا۔ افسوس ہے کہ چند مقامات پر ہندو مسلمانوں کے درمیان تنازعات سے متاثر ہو کر مہاتما جی نے کوہاٹ کے نزاعات کی خبر سنتے ہی بلا ہم میں سے کسی سے بھی مشورہ کئے ہوئے ۲۱ دن کا برت میرے ہی غریب خانے پر قیام کے زمانے میں رکھ لیا اور برت رکھنے اور برت کھولنے پر تقریر فرمائی اور ہم سے خاص طور پر خطاب کرتے ہوئے دونوں سے ظاہر

کردیا کہ وہ مسلمانوں کو ظالم اور ہندو کو مظلوم سمجھتے ہیں۔ کوہاٹ کے واقعات کے
متعلق جو بیان انھوں نے شائع فرمایا جو شوکت صاحب کے بیان سے بہت
کچھ مختلف تھا اس کے بعد تو انھوں نے ہندو مسلم تنازعات اور مناقشات کو چکانے
کا کام ہی بند کر دیا اور جب کبھی ان سے ہم دونوں بھائیوں، ڈاکٹر انصاری،
مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر محمود یا اور کسی نے اس بارے میں عرض کیا تو انھوں
نے اس میں حصہ لینے سے انکار ہی فرمایا اور اس کام کو کلیتۃً خدا ہی پر چھوڑ دیا۔
اگر میری صدارت کانگریس کی طرح ان کی صدارت کی کامیابی کا معیار اسی
تفرقے کا مٹانا تسلیم کیا جائے تو مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ سے بھی کم کامیاب
سمجھے جائیں گے اور یہی حال کانگریس کے تمام صدروں کی صدارت کا ہوگا اور
جو کچھ کامیابی کسی کو نصیب ہوئی وہ صرف اس کارروائی کا نتیجہ تھی جو سرینواس آئنگر
نے ہمارے ایما سے بالآخر ہمت کر کے اکتوبر ۱۹۲۷ء کو کلکتے کی کانگریس کمیٹی میں
شروع کی تھی اور جسے انھوں نے اور ہم نے مدراس کی کانگریس اور کلکتے کی
مسلم لیگ میں انجام کو پہنچایا تھا۔

مہاتما جی کی اس مسئلے میں خاموشی ایک ایسا عقدہ ہے جس کا واکرنا
بہت مشکل ہے۔ انھوں نے جو مجھ سے اس بارے میں ایک مبسوط بیان شائع
کیا تھا جس میں ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان ظالم (Bully) اور ہندو
بزدل (coward) ہیں۔ اسی دن سے ہندو مہا سبھائیوں نے ٹھان
لی کہ اب ہم ظالم بنیں گے اور مسلمانوں کو بزدل بنا کے چھوڑیں گے اور جب
کلکتے اور داناپور اور بیتیا میں ہندو کے مظالم پر اس مہاتما نے کچھ نہ لکھا جو ہمیشہ
چھوٹے بڑے چھوٹے تنازعہ کے بعد بھی مسلمانوں کو پند و موعظت سے مستفیض
کرتا رہا تھا اور جو اس کا دعوے دار ہے کہ 'ہندو دھرم ہی میں "اہنسا" کو

ایک خاص امتیاز حاصل ہے تو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرے دل میں بھی یہ شبہ پیدا ہونے لگا کہ مہاتما جی سمجھتے ہیں کہ اسی طرح مسلمان ظلم سے اور ہندو بزدلی سے اجتناب کریں گے کہ مسلمانوں پر کلکتے، دانا پور اور بیتیا کی طرح ہنود مظالم توڑیں گے اور باوجود "اہنسا" کو "پرمو دھرم" کہنے کے مسلمانوں کو "ہنسا" کا شکار بنائیں۔

ہم نے جس صبر سے کام لیا اس کا اندازہ کچھ انھیں الزامات سے ہو سکتا ہے جو ہم پر ہماری ملت نے ہماری قید کے زمانے سے لے کر آج تک مسلسل لگائے ہیں اور جن میں سب سے زیادہ حصہ خود جمعیت خلافت کے اس باغی عنصر نے لیا ہے جو آج وطن پرستی اور اتحاد ملکی کا دعوے دار ہے اور کانگریس اور کنونشن کی صفوں میں ڈاکٹر منجے اور پنڈت مدن موہن مالوی کے ساتھ دوش بدوش کھڑا ہے۔ ہماری "ہندو پرستی" ہی نے ڈاکٹر کچلو کو صدارت خلافت سے مستعفی کرا کے سر محمد شفیع وغیرہ کی جماعت سے جا ملایا اور ہماری "ہندو پرستی" ہی نے "زمیندار" کے سینکڑوں صفحات کو اس کے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کرا دیا لیکن آخر صبر کی بھی انتہا ہوتی ہے اور جب ہمارا جام صبر لبریز ہو گیا تو ہم نے کلکتے کے فسادات کے بعد مہاتما گاندھی، مسز نائیڈو (صدر کانگریس) اور پنڈت موتی لال نہرو کو دہلی میں مدعو کیا کہ ہنود کو مہاسبھائیت سے بچائیں ورنہ مسلمان جو پہلے بھی ایک حد تک ہمارے قابو سے نکل چکے تھے بالکل ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے اور حقیقتاً ہمارا بھی یہ فرض ہو جائے گا کہ ان کی جماعت کو منظم کر کے مدافعت کریں۔ مہاتما گاندھی جی گوشۂ تنہائی میں پورا ایک سال گذارنے کا عہد کر چکے تھے، الا ماشاء اللہ اور سوائے گورنر بمبئی وغیرہ سے زراعت کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے ان کے پاس جانے کے وہ کانپور کی کانگریس کے بعد سے گوہاٹی کانگریس تک کہیں تشریف نہ لے گئے۔ مسز نائیڈو بیچاری پر کانپور ہی میں بجائے گلدستوں

کے اگالدانوں کا منہ برسایا جانے والا تھا' مگر وہ اس پر بھی آمادہ و تیار تھیں کہ وہ اس کام میں پورا حصہ لیں اور جو کچھ اپنی صدارت کانگریس سے پہلے انھوں نے پنجاب میں کہا تھا اسے دہرائیں' لیکن پنڈت موتی لال نہرو نے جو اپنے سوا صرف ایک دیوتا یا دیوی کی پرستش کرتے ہیں اور اس کا نام اکثریت ہے اور جو لالہ لاجپت رائے آنجہانی کو سوراج پارٹی کے رشتے میں مربوط رکھے رہنے کی موہوم امید میں صوبہ سرحد کو اصلاحات دیئے جانے کی مخالفت کر چکے تھے الا یہ کہ وہ پنجاب میں مدغم ہو کر اپنے ۹۳ فی صدی کی مسلم اکثریت کو تقریباً ضائع کرا دے' صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ انتخابات کے زمانے میں ان سے ہرگز اس کی توقع نہ رکھنی چاہیے کہ وہ ہندو مہاسبھا یا اس کی نازیبا حرکات کی علانیہ مذمت کریں گے۔ اس پر تب پنجاب اور بہار کے مسلمانوں نے ہم پر پورا دباؤ ڈالا کہ اب جمعیت خلافت کو بھی اجازت دی جائے کہ وہ ہنود کے مقابلے کے لئے مسلمان حلقہائے انتخاب سے اپنے امیدواروں کو منتخب کر دے مگر ہم نے اس پر بھی جمعیت خلافت کو اس سے باز رکھا۔ پنڈت موتی لال نہرو جو آئین کمیٹی کی رکنیت اپنے لئے نہایت ہی ضروری سمجھتے تھے اکثریت کی دیوی کا رنگ دیکھتے ہی اس کمیٹی پر لات مار بیٹھے اور کونسلوں اور اسمبلی سے سوراج پارٹی کو نکال لائے' مگر نہ اس لئے کہ دیا کہ اب وہ اقرار کرنے لگے تھے وہ کونسلوں میں اس تعداد میں اپنی جماعت کی اس شرکت کو بے سود پا چکے تھے بلکہ صرف اس امید پر کہ اس بے نظیر جرأت کا ووٹ دینے والوں پر اچھا اثر پڑے گا اور کونسلوں اور اسمبلی میں ان کی پارٹی کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہو جائے گا۔ مگر اس تعداد میں خاک اضافہ نہ ہوا' اور اگر ان سرینواس آئنگر کو جو پنڈت جی کے خاص محبوبوں میں نہیں ہیں مدراس میں اس قدر کامیابی نہ ہوئی ہوتی تو سوراج پارٹی نے انتخابات

میں سے اور بھی زیادہ ہزیمت خوردہ ہو کر نکلتی۔ پھر بھی پنڈت جی جو واک آؤٹ کر چکے تھے "واک ان" فرمانے لگے مگر باوجود صوبہ سرحد کے ساتھ برابر ناانصافی کرنے کے لالہ جی آنجہانی ان کی پارٹی سے صاف نکل جا چکے تھے اور مالوی جی، لالہ جی اور مہاراشٹر کے ہندو مہاسبھائیوں نے انھیں ہر جگہ شکست دی تھی اور خود ان کے صوبے میں تو ہنود میں سے صرف ایک وہ اور ان کے "دوست" زنگا آئر کامیاب ہوئے تھے حالانکہ مسلمانوں نے اپنے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے تین سوراجیوں کو منتخب کرکے بھیجا تھا۔ جب پنڈت موتی لال نہرو نے مہاسبھائیوں کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کیا تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے مجبور ہو کر ان سے صاف کہدیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کوئی توقع نہ رکھیں۔ اس پر پنڈت جی نے الہ آباد جاتے ہوئے کانپور سے ایک تار ہمارے نام بھیجا جس میں ہم سے ایک درخواست کی گئی کہ ہم سے علیحدگی اختیار نہ کریں اور دوبارہ اس امر پر غور و خوض کریں اور جو کچھ مسلمانوں کے مطالبات ہوں ان کو پیش کریں۔ اس کا جواب ان کو یہ دیا گیا کہ ہم کو جو کچھ کہنا اور کرنا تھا وہ ہم کہہ چکے اور کر چکے، اب اگر مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنا مقصود ہے اور ان کو ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں اپنے دوش بدوش رکھنا منظور ہے تو غیر متعصب ہندو لیڈر اٹھیں اور متعصب ہندوؤں کو سمجھا دیں کہ یہ لچھن ہندوستان کو آزاد کرانے کے نہیں ہیں۔ اس تار پر نہ صرف کانپور کی کانفرنس کے صدر مولانا شوکت علی کے دستخط تھے جن پر تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں نے بمبئی جیسی فضا میں "شرم" "شرم" کے آوازے کسے، اور جن کے منہ پر ان میں سے ایک نے تھوک بھی دیا، نہ اس تار پر صرف محمد علی کلکتے کی خلافت کانفرنس کے صدر کے دستخط تھے جس کی کنونشن والی تقریر کے ہر فقرے پر شور برپا کیا گیا حالانکہ وہ ہندو مسلم مناقشات یا مطالبات

کے متعلق مطلق نہ تھی بلکہ صرف آزادی اور غلامی کے مسئلے پر کی گئی تھی اور ہنود کی غلامی تک کو انگریزوں کی غلامی پر اس میں ترجیح دی گئی تھی۔ اس پر حکیم اجمل خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستخط بھی تھے جو ہم دونوں سے کہیں زیادہ ہندو مہاسبھا کی زیادتیوں اور مہاتما جی اور پنڈت موتی لال نہرو کی خاموشی کے شاکی تھے اور جو ان دل خراش واقعات سے ایک سال پیشتر ہی دنیا سے کوچ کر گئے اور تذلیل سے بچ گئے۔ یہی نہیں بلکہ اس تاریان مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے بھی دستخط ثبت تھے جو ہنود کی زیادتیوں کے بارے میں عرصے سے دہن مبارک پر مہر سکوت لگا کر ابوالکلام کی جگہ ابوالسکوت بنے بیٹھے ہیں اور جنھوں نے ' واللہ اعلم بالصواب' بقول راویان ثقہ' کنونشن کے تماشے کے ختم ہونے پر فرمایا کہ مسلمان احمق تھے کہ وہ کنونشن کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنے آئے اور ہندو احمق تر تھے کہ انھوں نے ایسے مطالبات تک کو قبول نہ کیا جس کے یقیناً یہ معنی ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد عقلمند ترین شخص ہیں کہ بالکل خاموش رہے اور امام الہند بولے بھی تو ایک مشہور لطیفے کے امام کی طرح جس کے سارے مقتدی نماز میں بول اٹھے تھے اور جس نے بالآخر کہا کہ "شکر خدا کہ من نہ بولیدم"

جب ہماری سعی لاحاصل رہی اور ایک ہندو لیڈر بھی ہندو مہاسبھا کی بیہودگیوں کے خلاف کچھ نہ بولا تو ہم نے ۸ اور ۹ مئی ۱۹۲۹ء کو حج بیت اللہ اور مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت کے لئے احرام سفر باندھتے وقت بھی دہلی میں خلافت اسپیشل کانفرنس کا اجلاس کیا جس میں بالکل آخر وقت مولانا ابوالکلام آزاد صدر خلافت نے خطبۂ صدارت دینے سے اس بنا پر انکار فرما دیا کہ آپ مباحثے میں حصہ لینا چاہتے ہیں حالانکہ اس میں ذرا سی بھی حقیقت نہ تھی اور آپ اس وقت بھی .... ہی بنے بیٹھے رہے اور اگر زبان سے کچھ کلمات آپ نے

کائے بھی تو وہی اور ..... کلمات جن میں آپ نے کنور عبدالوہاب خاں صاحب
د جو استفسار کر رہے تھے کہ آپ کب وہ تقریر فرمائیں گے جس کا وعدہ فرما چکے
ہیں، اور اصرار کر رہے تھے کہ ضرور تقریر فرمائیں نہایت بے دردی سے ڈانٹا۔
س کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت حکیم اجمل خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے
فرمائی اور کانفرنس کی صدارت بلا توقف مولانا ابوالکلام کی جگہ مولانا سید سلیمان ندوی
نے فرمائی۔ ڈاکٹر انصاری صاحب اس وقت نواب صاحب بھوپال کی معیت
میں انگلستان تشریف رکھتے تھے، جب واپس تشریف لائے تو آپ نے نہ آؤ
دیکھا نہ تاؤ آتے ہی جمعیت خلافت سے مستعفی ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ صدر خلافت
مولانا ابوالکلام آزاد نے پنڈت موتی لال نہرو کی معیت میں ایک بیان شائع
فرمایا تھا جس میں ایک نئی انجمن کی تو نہیں البتہ اس کے جنین کی تخلیق فرمائی
گئی تھی جس کی رکنیت کی شرط یہ تھی کہ اس کا کوئی رکن کسی مذہبی یا ملی انجمن کا رکن
ہرگز نہ ہو اور جس کی میں نے حج سے واپس آکر "ہمدرد" ہی میں اس طرح تاویل
کی تھی کہ اس انجمن کے دروازے پر اسی طرح یہ لکھا ہوا ہے کہ "اس میں جو داخل ہو
دین و مذہب کو پہلے باہر چھوڑ آئے"۔ جس طرح ڈانٹے اور ملٹن کے تخیل نے
دوزخ کے دروازے پر اس عبارت کو آویزاں کرادیا تھا کہ "اس میں جو داخل ہو
امید کو پہلے باہر چھوڑ آئے"۔ جمعیت خلافت کا بھی عام طور پر ان انجمنوں کے ساتھ
نام لیا جا رہا تھا جس کی رکنیت اس جنین کی رکنیت کے لئے مانع قرار دی گئی تھی۔
صدر خلافت جو اس لادینیت کے دو بانیوں میں سے ایک تھے انھوں نے تو
ابھی صدارت سے اپنا استعفا نہیں بھیجا تھا مگر ڈاکٹر انصاری صاحب نے ہمارے
حج و زیارت اور مؤتمر سے آنے سے پہلے ہی اپنا استعفا ارسال فرما دیا تھا گو وہ
منظور نہیں کیا گیا ورنہ وہ جس طرح کانپور کانگریس کے بعد مسلم لیگ کو بے مدذلیل

سمجھ کر ہمارے ساتھ اس کے جلسے منعقدہ علی گڑھ میں شریک نہ ہوئے تھے بلکہ ہم کو بھی اس ذلیل اور بے حقیقت جمعیت میں شریک ہونے سے روکتے تھے۔ اسی طرح وہ امسال کلکتے میں مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے میں بھی شریک نہ ہوئے ہوتے اور غنڈوں، اوباشوں اور بدمعاشوں کی زد میں نہ آتے، نہ اس کنونیشن میں جس کے یہ صدر تھے مرکزی خلافت کمیٹی کے نمائندے بن کر نہرو کمیٹی کی سفارشات کو منظور کرائے اس بے حد وقیع جماعت کے ساتھ جاتے جس کے اسمائے گرامی اخبارات میں دھوم دھام سے شائع کرائے ہیں۔

(۲) کانگریس کی مہاسبھا نوازی

ہمدرد ۱۲ جنوری ۱۹۲۹ء

دہلی کی اسپیشل کانفرنس پر جو کچھ محنت اور جس قدر روپیہ اہل دہلی نے صرف کیا تھا تقریباً سب کا سب رائگاں گیا، اس لئے کہ ہمارے حجاز چلے جانے کے بعد جناب صدر مولٰنا ابوالکلام آزاد اور مرکزی کمیٹی نے کچھ کام نہیں کیا۔ البتہ میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ گوہاٹی کی کانگریس میں مسلمانوں کی فریاد پیش کروں گا لیکن مشیت ایزدی یہ نہ تھی۔ ریل ہی میں ہمیں یہ اطلاع ملی کہ سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نے قتل کر ڈالا اور ایک مسلمان کے اس فعل کے باعث ساری ملت کو معذرت کرنا پڑی اور مظلوم پر سے اس شبہے کو دور کرنے کی ضرورت آپڑی کہ وہ خود ہی ظالم ہے۔

اب ۱۹۲۷ء کا آغاز ہوا اور رمضان المبارک میں ۲۰ مارچ کے دن تیس پینتیس سربرآوردہ مسلمانوں نے ان تجاویز پر اتفاق کیا جو "تجاویز دہلی" کے نام سے جلد مشہور خلائق ہوگئیں اور جنھوں نے بقول سرینواس آئنگر ہندو مہاسبھا کے بادبان میں سے ساری ہوا نکال ڈالی۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے ان تجاویز کا خیر مقدم کیا، مگر ہندو مہاسبھا نے اسی وقت سے ان کی اس طرح مخالفت شروع کی کہ مخلوط انتخاب کی اس تجویز کو جو متعدد شرائط سے مشروط تھی بطیب خاطر قبول فرمانے کا اظہار فرمایا مگر سب شرائط کی مخالفت کی اور اس چیز کا جس سے محتاط مسلمان پہلے ہی لرزاں تھے بڑے زور شور سے پروپگنڈا شروع کردیا یعنی شرائط کو قطعاً نظر انداز کرکے مشہور کرنا شروع کردیا کہ اب تو مسلمان بھی جداگانہ حلقہائے انتخاب سے

دست بردار ہو گئے۔ محتاط مسلمانوں نے سمجھ سے ہر جگہ التجا کی تھی کہ خدارا ایک لفظ بھی جداگانہ حلقہائے انتخاب کے خلاف نہ لکھئے' نہ اس کا اظہار کیجئے کہ کسی حالت میں اور کتنی ہی شرائط کے ساتھ سہی' ہم جداگانہ حلقہائے انتخاب ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے کیونکہ ہندو فوراً گورنمنٹ سے (جس نے مسلمانوں کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں بمقام کلکتہ عہد کر لیا ہے کہ جداگانہ حلقہائے انتخاب اس وقت تک قائم رکھے جائیں گے جب تک مسلمان خود نہ کہہ دیں کہ یہ ہمیں درکار نہیں) کہنا شروع کر دیں گے کہ لو اب تو مسلمان خود ان سے بیزار ہیں اور شرطیں ساری کی ساری دھری کی دھری رہ جائیں گی' گورنمنٹ ایک شرط کو بھی منظور نہ کرے گی اور ہندو کہہ دیں گے کہ ہم کیا کریں ہم نے تو منظور کر لی تھیں گورنمنٹ قبول نہ کرے تو ہم کیا کریں اور مانا کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اقلیتوں کے لیے بے سود ہی نہیں بلکہ مضر ہیں ان کے حقوق کی حفاظت ان کے ذریعے سے نہیں ہو سکتی لیکن ان کی حقیقی حمایت تو ہو سکتی ہے' اگر یہ غتر بود ہو گئے تو ہم دل کی بھڑاس نکالنے سے بھی رہے' نماز بخشوانے جائیں گے تو کہیں الٹے روزے اور گلے نہ پڑ جائیں۔ اس کے جواب میں میں ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ اتنا بھی اندھیر کہیں ہو سکتا ہے۔" دہلی کی تجاویز" درحقیقت ایک تجویز کا نام ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہندو اقلیتیں پانچ صوبوں میں ہمارے انصاف پر اعتماد کرنے کو آمادہ ہیں تو ہماری اقلیتیں بھی نو صوبوں میں ان کے انصاف پر اعتماد کرنے کو آمادہ ہیں ورنہ نہیں!

جب تک پانچ صوبوں میں ہماری اکثریت متعین نہ ہو جائے ہم جداگانہ حلقہائے انتخاب سے ہرگز دست بردار نہیں سمجھے جا سکتے تاہم ہندو مہا سبھا نے اسی دن سے جب سے کہ وہ ان تجاویز کے دھچکے سے کسی قدر سنبھلی یہ کہنا شروع کیا کہ یہ بھی عجیب دھاندلی ہے کہ ساری کی ساری تجاویز ہم سے منوائی جاتی ہیں' ہمیں

ان میں سے جو معقول معلوم ہوں گی انہیں کو ہم قبول کریں گے اور جو معقول معلوم نہ ہوں گی ان کو ہم مسترد کردیں گے اور بظاہر تمام نام نہاد "تجاویز" میں سے صرف یہ تجویز" ہندو جہا سبھا کو معقول معلوم ہوئی کہ مسلمان جداگانہ حلقہائے انتخاب سے دست بردار ہوتے ہیں، حالانکہ جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں اس تجویز کو کسی نے بھی پیش نہیں کیا تھا۔ اسی سلسلے میں یہ بھی عرض کردوں کہ جن سرآوردہ مسلمانوں نے ان "تجاویز" پر اتفاق کیا تھا ان میں سے کسی نے پوچھا کہ اگر یہ منظور نہ ہوں تو کیا کیا جائے۔ اس وقت متعدد حضرات نے کہا تب تو جداگانہ حلقہائے انتخاب کو قائم رکھا جائے مگر ڈاکٹر انصاری اور ان کے ساتھ دو تین مسلمان سوراجیوں نے جو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے ارکان تھے فرمایا کہ اس حالت میں بھی مخلوط حلقہائے انتخاب قائم کرادینا چاہیے۔ میں نے اس وقت بھی اسی طرح اس سے اختلاف کیا تھا جس طرح کہ ۱۹۲۶ء میں میں برابر اختلاف کرتا رہا تھا، حالانکہ سرینواس آئنگر کی اس تجویز پر سوائے لالہ لاجپت رائے کے اور ممبرانِ مجلس عاملہ کانگریس متفق تھے کہ اگر مسلمان مخلوط حلقہائے انتخاب قبول کرلیں تو انھیں تمام کونسلوں میں اور اسمبلی میں جہاں ان کی اقلیت ہے اتنی ہی نشستیں دے دی جائیں جو انھیں اس وقت حاصل ہیں اور پنجاب اور بنگال میں ان کی اکثریت قائم کردی جائے۔ ڈاکٹر انصاری اور چند سوراجی ارکان اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ اس طرح بلا شرط مخلوط انتخاب کو قبول کرنے پر بیں نے اور غالباً نواب اسمٰعیل خان نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اتنی دیر بعد تو ایک چیز پر اتفاق ہوا ابھی سے اختلاف بھی شروع ہوگیا، آج ہی اس پر بحث کرنے سے کیا حاصل کہ گورنمنٹ ان شرائط کو قبول نہ کرے تو کیا کیا جائے۔ جب گورنمنٹ انکار کرے تو اس وقت پھر غور کرلیا جائے اور اس وقت جو چیز مناسب ہو کی جائے۔

اس پر سب متفق ہو گئے اور اس طرح ڈاکٹر انصاری اور سوراجی حضرات اور سر محمد شفیع اور جداگانہ حلقہائے انتخاب کے دلدادہ اور ہم لوگ جو نہ جداگانہ کے اس طرح دل دادہ تھے نہ مخلوط کے، ایک ہی فیصلے پر راضی ہو کر مغرب کے قریب اس جلسے سے رخصت ہوئے۔

افسوس کہ اپنی معبود اکثریت کی دیوی کی خاطر ہندو مہا سبھا سے مرعوب ہو کر پنڈت موتی لال نہرو نے دہلی کی تجاویز کو حکومت کے سامنے بھی پیش نہ ہونے دیا، اور ڈاکٹر انصاری اور ان کے سوراجی رفقائے کار اپنے اس عہد سے پھر گئے جو ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو رمضان شریف کے مبارک مہینے میں انھوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا کہ جب تک حکومت ہماری شرائط کو رد نہ کر دے ہم اس کا فیصلہ نہ کریں گے کہ اس حالت میں بھی جداگانہ حلقہائے انتخاب کو ترک کر دیا جائے یا قائم رکھا جائے۔ یہ تو کونشن کے صدر صاحب کی کایا پلٹ تھی۔ اب نہرو کمیٹی اور کانگریس کے صدر صاحب اور درحقیقت کونشن کے بھی اصلی صدر صاحب کی کایا پلٹ ملاحظہ ہو۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کی دہلی کی تجاویز پر وسط مئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے غور کیا۔ مالوی جی صاحب تشریف نہ لائے، اور لالہ جی آنجہانی جنیوا اور ولایت کو چل دیئے، گو وہ ارشاد فرماتے تھے کہ میں اپنے رفقا سے کہہ گیا تھا کہ ان تجاویز کو مسترد نہ کر دینا، اور اسی وجہ سے وہ مسترد نہ کی گئیں۔ ڈاکٹر منجے، مسٹر جیکر اور مسٹر کیلکر اور غالباً مسٹر اینے بھی شریک تھے۔ جب مجلس عاملہ میں یہ تجاویز پیش ہوئیں تو جس شخص نے ان کے منظور کرانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا وہ خود پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ صوبہ سرحد کو اصلاحات دیئے جانے کے اب وہ مخالف نہ تھے اس لئے کہ اب ان پر لالہ جی کی شہ نہیں پڑ رہی تھی، جس بازی میں لالہ جی کے مہرے کی شہ ان پر پڑ رہی تھی یعنی ۱۹۲۶ء کے

انتخاب اس بازی کو وہ ہار ہی چکے تھے اور لالہ جی اسے جیت چکے تھے۔ سندھ کی علیحدگی بھی انھیں منظور تھی، لیکن اسے ایک معقول شکل میں پیش کرنے کے لیے انھوں نے یہ بڑھا دیا کہ زبان کی علیحدگی کی بنا پر کانگرس اسے علیحدہ صوبہ بنا ہی چکی ہے اور اسی بنا پر وہ راضی ہو گئے کہ آندھرا اور کرناٹک کو ان تنازعات کے ساتھ کسی قسم کا واسطہ نہ تھا۔ سندھ کی مالی حالت کے متعلق کسی نے ایک حرف بھی نہیں کہا اور نہ اس کی کوئی شرط لگائی گئی اور لگائی جاتی بھی کیوں۔ اگر سندھ کی مالی حالت اچھی نہیں ہے تو پھر اسے بمبئی کے احاطے میں ملحق رکھ کر اس کا بار گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک وغیرہ پر ڈالنا کیوں روا ہے اور سارے ہندوستان پر یا مرکزی حکومت پر اس کا بار ڈالنا کیوں ناروا ہو سکتا ہے؟ باپ کا مال تو اولاد پر حرام لیکن بھائی کا مال بھائی پر حلال؟

اقلیتوں اور اکثریتوں دونوں کے لیے نشستوں کے مخصوص کیے جانے پر کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ جب اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے کم از کم ایک ثلث نشستیں مخصوص کرنے کا سوال پیش ہوا تو پنڈت موتی لال نہرو ہی نے فرمایا کہ اس طرح تو یہ چیز کسی اصول کے مطابق نہیں معلوم ہوتی، اور بے تکی سی ہے۔ اگر اسے اس طرح رکھ دیا جائے کہ ہر صوبے سے اسمبلی کے لیے بھی اسی تناسب سے مسلمان منتخب کئے جائیں گے جس تناسب سے ان کے لیے صوبجات کی کونسلوں میں نشستیں مخصوص ہیں تو یقیناً ایک ثلث نشستیں مسلمانوں کو مل جائیں گی اس لیے کہ دہلی کی تجاویز میں یہ بھی رکھا گیا تھا کہ ہر صوبے میں مسلم اقلیتوں اور ہندو اقلیتوں کو باہمی سمجھوتے کے بعد تناسب آبادی سے زیادہ نشستیں دی جائیں گی اور اس تجویز کے مجلس عاملہ میں منظور ہو جانے کے بعد بلا کسی کی اجازت کے سر پیو اس آئنگر نے سکھوں کے لیے بھی اسی قسم کی رعایت کا اضافہ کر دیا جس سے

نہ میں راضی تھا نہ ڈاکٹر انصاری، اور ہم دونوں نے اس کا سر بتواس آنگر سے ذکر بھی کر دیا کہ یہ ایک غلطی ہے اس سے پنجاب کا مسئلہ پیچیدہ ہو جائے گا اور اس کا ہندو مسلم نزاعات کے ساتھ کسی قسم کا تعلق ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دستور کانگریس کی وہ شرط بھی رکھی گئی کہ اقلیت کی ¾ اکثریت اگر کسی چیز کی اس بنا پر مخالفت کرے کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف ہے تو وہ پیش نہ ہو سکے مگر موتی لال جی نے اس "ویٹو" (Veto) کو "بین الملل امور" (Inter communal matters) تک محدود کر دیا جو یقیناً ایک نیک منشا تھا، مگر اس کا فیصلہ کہ کونسا امر بین الملل ہے اور کونسا نہیں ایک بین الملل کمیٹی پر چھوڑ دیا جو ہر سیشن کے شروع میں منتخب کی جائے جس سے مجھے اتفاق نہیں۔ اس تمام تجویز کو موتی لال جی ہی نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں پیش کیا اور انھیں نے اسے منظور کرایا۔ سب ہندو مہاسبھائیوں نے جو اس وقت موجود تھے اسے منظور کیا گویا درہے کہ جے رام داس صاحب اس جلسے میں موجود نہ تھے اور اس جلسے کے فیصلے کی مخالفت بعد میں انھیں سے شروع ہوئی۔ ڈاکٹر منجے نے صرف صوبہ سرحد کو اصلاحات دیے جانے پر اس بنا پر اختلاف کیا کہ ان کی ہندو مہاسبھا اس کے خلاف تھی۔ مگر مسٹر جیکر نے اس میں کچھ شرطیں لگانے کی سعی لاحاصل کے بعد، ایک معمولی ترمیم کو، جسے ہم نے بطیب خاطر قبول کر لیا، پیش کر کے منظور کر لیا۔

مگر اب موتی لال جی کی کایا پلٹ ملاحظہ ہو۔ مرکزی حکومت کو فرعونی اور نمرودی اختیارات دے کر ان صوبوں کی حکومتوں کو جہاں بھول چوک سے کہیں مسلمانوں کی اکثریت باقی رہ جائے غلام بنانے کے بعد ہندو سبھائیوں کو کیا پڑی ہے جو کسی صوبے میں اپنی اقلیت کے لئے مزید نشستیں طلب کریں؟

لہذا اسی ۱۹۲۷ء کے کانگریس کمیٹی کے فیصلے کو نہرو رپورٹ میں رد کر دیا گیا ہے اور مسلم اقلیتوں کو صرف اتنی ہی نشستیں ملیں گی جتنی کہ ان کی آبادی کے تناسب سے ان کے لئے مخصوص کردی گئی ہوں۔ مسلم اکثریتوں کے لئے بھی کانگریس کمیٹی نے نشستیں مخصوص کردی تھیں لیکن نہرو رپورٹ میں یہ بھی غائب۔ لہذا اسمبلی میں جو ہندو سبھا کا ہاؤس آف لارڈز یعنی دارالامرا ہوگا، جہاں ہر وہ چیز منظور ہو سکے گی جسے وہ صوبے منظور کریں جہاں ہندو اکثریت ہے اور ہر وہ چیز نامنظور کی جا سکے گی جسے وہ صوبے منظور کریں جہاں گئی گذری مسلم اکثریت بچی کھچی باقی رہ گئی ہو۔ مسلمانوں کو اتنی نشستیں ملنے کا بھی یقین نہیں جو ان کی تناسب آبادی کے مطابق یعنی ۲۵ فی صدی ہوں اور ۳۳ ۱/۳ فی صدی کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ پھر اقلیتوں کی ۳/۴ اکثریت کو "ویٹو" (Veto) کا جو حق دستور کانگریس میں، میثاق لکھنؤ میں، دہلی کی تجاویز میں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ریزولیوشن میں دیا گیا تھا وہ بھی نہرو رپورٹ میں غتر بود کر دیا گیا، اور اس رپورٹ کے لکھنے والے نہیں تو لکھوانے والے وہی پنڈت موتی لال نہرو ہیں جنھوں نے ایک سال قبل بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے وہ ریزولیوشن پیش فرما دیا تھا جس کی تائید کرنے کے باعث آج ہم غداری کے مجرم ٹھہرائے جا رہے ہیں! یہ ہے وہ داستان ڈاکٹر انصاری اور موتی لال جی کی کایا پلٹ کی اور جس کی ہمت ہو وہ اس میں کے ایک حرف کو بھی غلط ثابت کرنے کی کوشش کرلے۔ اب آگے چلئے۔

(۳) سمجھوتے کی کوشش

ہمدرد ۲۰ جنوری ۱۹۲۹ء

جس طرح کلکتے کے فسادات نے ہمیں دہلی میں مئی ۱۹۲۶ء میں اسپیشل کانفرنس کرنے پر مجبور کر دیا تھا اسی طرح دانا پور، بتیا، کلکائی اور پیاسی کے فسادات نے اور ان میں مسلمانوں پر جو ظلم توڑے گئے انھوں نے ہمیں مجبور کر دیا کہ میں کلکتے کی خلافت کانفرنس کی صدارت کروں اور اگرچہ نیوز ایجنسیوں اور اخبارات نے میرے زبانی خطبۂ صدارت کے ساتھ تقریباً وہی سلوک کیا تھا جو اس بار کیا گیا۔ باوجودیکہ میں نے گھنٹوں بے حد محنت شاقہ برداشت کرکے اس وقت بھی اپنے خطبے کا ملخص رپورٹروں کو نہ صرف شارٹ ہینڈ بلکہ لونگ ہینڈ میں بھی لکھوا دیا تھا تاہم جن حضرات نے میرا خطبۂ صدارت سنا یا پڑھا اُن کو یاد ہوگا کہ اس کا بڑا حصہ اس مہلک متعصبانہ ذہنیت کو دور کرنے کی کوشش کے لئے وقف کیا گیا تھا جو ڈاکٹر منجے صدر ہندو مہاسبھا منعقدہ پٹنہ کے خطبۂ صدارت میں ظاہر کی گئی تھی، جو اسی صوبے میں ہندو مہاسبھائیوں کے فسادات کی شکل میں دانا پور اور بتیا میں نمودار ہوئی اور جواب کلکتے تک کنونشن اور کانگریس دونوں میں یکساں نمایاں تھی کہ ابھی سوراج لینا فضول ہے اس لئے کہ ہندو سنبھال نہیں سکتے، انھیں مل بھی گیا تو جلد ان کے ہاتھوں سے پھر نکل جائے گا۔ ابھی صرف مسلمانوں پر قابو پانے کا انتظام کیا جائے اور ۵۷ء سے پہلے کے دہلی کے ڈھنڈورچی کی طرح جو پکارا کرتا تھا کہ "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا" ابھی اسی کا بندوبست کیا جائے کہ "خلق خدا کی، ملک وائسرائے کا اور حکم ہندو مہاسبھا کا"

ہو جائے' آزادی وغیرہ کا سوال اس کے بعد اٹھایا جائے گا۔ تیا کے واقعات نے جن پر جہاتما جی نے برت نہ رکھا' نہ جنھیں مالوی جی اور لالہ جی آنجہانی نے کبھی ہندو سبھائیوں کے تعصب کا نمونہ سمجھ کر ان پر اظہار ندامت کیا' ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم فوراً شملے جائیں اور ایک بار ہندو مہا سبھائیوں کو یہ اچھی طرح سمجھا دیں کہ اگر وہ اسی طرح متعصب ہنود کو شہ دے کر مسلمانوں کے خلاف ابھارتے رہے اور ان پر مظالم توڑتے رہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں وہ خانہ جنگی ہو کر رہے گی جس کی طرف گذشتہ اکتوبر میں کانپور کی کانفرنس میں شوکت صاحب کو پھر اشارہ کرنا پڑا۔ خلافت کی مجلس عاملہ کا جلسہ شفیع داؤدی صاحب کی قیام گاہ پر منعقد ہوا اور ڈاکٹر انصاری اور شعیب قریشی صاحب اس بنا پر ہمارے ایلچی مقرر کر کے ہندو مہا سبھا کے عہدے داروں کے پاس بھیجے گئے کہ ان کے متعلق کسی ہندو کو یہ شبہ نہ ہوگا کہ یہ جذبۂ ملت پرستی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ہنود کے ساتھ انصاف نہیں کرتے' بلکہ جب ایسے حضرات کو بھی اس الٹی میٹم کے ان تک پہنچانے کے لئے سفیر کی صورت میں دیکھیں گے تو وہ یقین کر لیں گے کہ ہمارے صبر کی کمان کو اب زیادہ نہ کھینچنا چاہیے' ورنہ وہ ٹوٹ جائے گی۔ حیرت کا مقام ہے کہ ہمارے ان دو سفرا میں سے ایک ڈاکٹر انصاری دوسرے سفیر شعیب قریشی صاحب کے متعلق یہ رائے رکھتا ہے کہ وہ سخت متعصب اور فرقہ پرست مسلمان ہیں اور باوجودیکہ ہندو سبھائیوں کی ذہنیت مطلق نہیں بدلی ان کا شریک وسہیم بن کر اپنے کو ان سے مرعوب نہیں سمجھتا بلکہ ان کو حق پرست تبلاتا ہے!

خیر اسے جانے دیجئے' شملے کی خلافت کانفرنس منعقد ہوئی' اور جس طرح ہندو سبھائیوں نے اسے توڑا وہ سب کو معلوم ہے اور جو بیان اس کی کارروائی کے متعلق شفیع داؤدی صاحب نے شائع کرایا تھا اسے ڈاکٹر انصاری صاحب

کم بھلا سکتے ہیں گو مولانا ابوالکلام آزاد یقیناً اسے کب کے بھلا بیٹھے ہوں گے۔ اس کانفرنس کے منتشر ہو جانے کے بعد خدا بھلا کرے مہرنواس آئنگر کا کہ اس غریب نے کلکتے میں کانگریس کمیٹی کا جلسہ منعقد کیا جس میں گائے اور گاجے باجے کے متعلق ایک مدبرانہ فیصلہ کیا گیا۔ وہاں لالہ جی اور مالوی جی تو تشریف نہیں لائے مگر وہاں بھی دو ہندو سبھائی اخیر وقت تک لڑتے رہے جن میں سے ایک اخبار "سوراجیہ" کے مالک اور اڈیٹر پرکاشم صاحب ہیں، دوسرے سندھ کے جے رام داس صاحب جنھیں دہلی بلا کر مالوی جی نے ہندوستان ٹائمز کا اڈیٹر بنایا تھا۔

یہ پہلا جلسہ تھا جس میں اپنی رہائی کے بعد سوباش بابو شریک ہوئے تھے اور ان کی تکالیف اور ان کی قربانی، ان کی لیاقت اور ان کے حسن کا سب کے دل پر اثر تھا، بالخصوص بنگال کے دل پر۔ اس لئے ہندو سبھائیوں کی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان کو ہم سے بھڑا دیا جائے چنانچہ ایک سمجھوتے کے ہو جانے کے بعد جب کسی نے مسلمانوں کو دبانا چاہا اور میں نے دبنا نہ چاہا، تو انھوں نے نہایت ترش روئی کے ساتھ مجھ سے گفتگو کی جس کا میں نے اسی وقت معقول جواب بھی دے دیا۔ شعیب قریشی صاحب اس طرح دبائے جانے سے اتنے بیزار ہو گئے تھے کہ وہ تو شریک جلسہ بھی نہ ہوتے تھے اور باوجود ان گہرے تعلقات کے جو ان اور ڈاکٹر انصاری کے درمیان پندرہ برس سے قائم تھے وہ اس طرح بار بار دبائے جانے پر ہرگز رضامند نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر وہ بھی شریک جلسہ ہو گئے۔ جب جلسہ بالآخر ایک اچھے نتیجے پر پہنچ کر برخاست ہوا تو شب کو ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا جس میں آخری تقریر میری تھی۔ الحمد للہ کہ اس تقریر کا سوباش بابو پر اس قدر گہرا اثر پڑا کہ وہ باوجود اپنی علالت اور کمزوری کے رات کے بارہ بجے کے بعد اخبار "فارورڈ" کے دفتر میں خود پہنچے اور

جہاں تک انھیں یاد رہی میری تقریر خود رپورٹ کی اور صبح کے پرچے میں اسے شائع کردیا۔

اس کے بعد کانگریس کا مرحلہ تھا۔ ڈاکٹر انصاری اس کے صدر منتخب ہونے والے تھے مگر آپ نے ایک انوکھی روش اختیار کی اور صدارت سے پہلے ہی ایک خطبۂ صدارت شائع کرنا چاہا جس کی مقبولیت کے بعد ہی آپ صدارت قبول کرنے پر راضی ہو سکتے تھے۔ اس خطبے کا مسودہ میری نظر سے بھی گذرا اور میں اسے پڑھ کر دریائے حیرت و افسوس میں غرق ہو گیا' اس لیے کہ وہ ایک تارک تعاون ہی نہیں سوراجی کی حیثیت سے بھی گرا ہوا تھا اور جو "جوابی تعاون" والے غالباً لبرل بھی اسے دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ خدا بھلا کرے ایک سیدھے سادے تعاون والے کا جس نے اس بیان کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کو سمجھایا کہ وہ ان سے کس قدر غیر متوقع تھا' تب جا کر ڈاکٹر صاحب اس کی اصلاح کے لیے تیار ہوئے مگر یہ کہہ کر کہ ان کا حقیقی منشا بھی وہی تھا جو ہمارا تھا چنانچہ ایک دوسری روح جہاں تک ہو سکا اسی قالب میں ڈھالی گئی اور اگرچہ یہ بیان بھی غیر ضروری تھا تاہم وہ اس قدر گرا ہوا نہ تھا جس قدر کہ پہلا بیان' جس پر ہارنیمین نے "نیشنل ہیرلڈ" میں نہایت سختی سے تبصرہ کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب صدر کانگریس منتخب ہو گئے' ان کا خطبۂ صدارت بھی ہر پہلو کو بچا کر لکھا گیا اور وہ مدراس میں رونق افروز ہوئے۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے محض اس لئے کہ امورِ طے شدہ کی بخیہ نہ ادھیڑی جائے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ ہائے منعقدہ بمبئی' کلکتہ کی تجاویز کو ہندو مسلم نزاعات کے مٹانے کی ایک تجویز میں رکھ کر بعینہٖ پیش کر دیا اور اسی پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ گو میں نے ایک امر کو پیش کرنا چاہا جو مسٹر جناح کی غلطی سے تجاویز دہلی میں شائع ہونے سے رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ پنجاب اور بنگال میں مسلم اور غیر مسلم رائے دہندگان کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب ہی کے مطابق رکھی جائے تاکہ دونوں صوبوں میں

مسلمانوں کی اکثریت قائم رہے۔ نواب اسمٰعیل خاں اس کے شاہد ہیں کہ تجویز صرف مسٹر جناح کے سہو کے باعث شائع ہونے سے رہ گئی تھی۔ اس کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ جس چیز پر آج بڑا زور دیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ نہرو کمیٹی نے ایک نئی دنیا کا انکشاف کیا ہے جس نے "پنجابی" ٹولی کی کایا پلٹ کر دی اور وہ نئی دنیا ہر بالغ کو رائے دہی کا حق دیا جاتا ہے، حالانکہ دہلی کی تجاویز میں ہی نہیں بلکہ اس سے دو سال پہلے ۱۹۲۵ء کی ابتدا میں جو آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں ہوئی تھی اس میں بھی اس تجویز کو اس وقت پیش کیا گیا تھا جبکہ ڈاکٹر کچلو اور ظفر علی خاں صاحب کے دعوے کے خلاف لالہ لاجپت رائے نے فرمایا تھا کہ پنجاب میں مسلم اکثریت ہے کہاں، آبادی میں وہ "بچو بچا" ہوں مگر رائے دہندگان میں ان کی اکثریت نہیں ہو سکتی۔ ہندو زیادہ انکم ٹیکس دینے والے اور زیادہ تعلیم یافتہ ہیں، اور سکھ مال گذاری کا بڑا حصہ ادا کرتے ہیں۔ بہر حال ۱۹۲۸ء میں جب دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کے واضع دستور کمیٹی نے سوائے مالوی جی کے یوں ہی سے اختلاف کے ہر بالغ کو حق رائے دہی دینے کا باتفاق کامل فیصلہ کیا تھا اور یہ چیز "پنجابی ٹولی کے سامنے آفت بھی تھی جبکہ وہ اپنی اکثریت کے واسطے نشستیں مخصوص کرانے کے لئے چھٹا دریا خون کا بہانے کا اعلان کر رہی تھی!

بہر حال مجلس عاملہ کی منظوری کے بعد یہ تجویزیں کی تینوں سبجکٹ کمیٹی میں پیش ہونے والی ہی تھی کہ مہاتما گاندھی اپنے گوشۂ تنہائی سے برآمد ہوئے اور انھوں نے ڈاکٹر انصاری کو فرمایا کہ میں تو صرف اس لئے حاضر ہوا تھا کہ تمھاری کچھ مدد کروں اور ہندو مسلم نزاعات کا آخری فیصلہ کراؤں لیکن جب میں نے اس تجویز کو دیکھا جسے مجلس عاملہ نے سبجکٹ کمیٹی میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا تھا

اور جب بمبئی اور کلکتے کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں نے منظور کیا تھا تو میرے تو ہوش اڑ گئے۔ اس گائے والے حصے پر تو میں نہ کوئی اور ہندو راضی ہو سکتا ہے، وہ تو بالکل ہمارے مذہبی فرائض کے منافی ہے۔ مجھے رات بھر اس خیال کے باعث نیند نہیں آئی کہ میں تو تمھیں مدد دینے کے بجائے ایک فیصلے پر پہنچنے میں ایک روک بن جاؤں گا۔ مگر کیا کیا جائے؟ تم علی برادران کے پاس جاؤ اور ان سے یہ سب کچھ کہہ کر انھیں بھی میرے پاس لاؤ۔ قصہ مختصر ہم حاضرِ خدمت ہوئے اور مہاتما جی کے مذہبی خیالات کا، جو کبھی ہمارے مذہبی خیالات نہیں ہو سکتے ایک بار پھر اعادہ کیا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر انصاری کی قیام گاہ پر ایک طول طویل جلسۂ مشاورت ہوا جس میں مجبور ہو کر میں نے مہاتما جی کی منطق پر اعتراض کیا اور بالآخر انھیں ایک ایسی چیز پر لے آیا جو انھیں بھی قبول تھی اور ہمیں بھی اور ترمیم شدہ تجویز سبجکٹ کمیٹی میں پیش ہوئی۔ اب وہاں اس کے سیاسی جزو پر ہندو سبھائیوں اور مہاتما جی کے بعض پیروانِ خاص نے حملے کرنا شروع کئے اور مالوی جی تو صبح کے ڈھائی بجے تک لڑتے رہے۔ میں نے بھی تقریر کرنا چاہی مگر ڈاکٹر انصاری نے مجھے روکے رکھا اور کہا کہ خود ہندو ہی ان ہندوؤں کو کافی جواب دیدیں گے۔ اور بہتر ہے کہ وہی ان مخالفین کو ساکت کر دیں۔ میں خاموش رہا اور بالآخر مالوی جی کو پے در پے شکستیں ملیں اور صبح کو وہ اس پر راضی ہو گئے کہ اس تجویز کی تائید کریں۔ ان کی تائیدی تقریر میری اس تقریر کا باعث ہوئی جس میں میں نے عرض کیا تھا کہ اگر مالوی جی اسی طرح عملی کام بھی کریں تو ہم بھی مصر والوں کی طرح جنھوں نے ملنر کمیشن کا بائیکاٹ کیا تھا اور ہر سوال کے جواب میں یہی کہا تھا کہ زاغلول پاشا سے پوچھو، جو اس کی رائے ہے وہی ہماری رائے ہے، سائمن کمیشن والوں سے کہہ دیں گے کہ جاؤ مالوی جی سے پوچھو، جو ان کی رائے ہے وہی

ہماری رائے ہے۔

مالوی جی کی اس تقریر کے بعد کسی نے مہاتما جی کو یہ غلط خبر جا کر سنا دی کہ میں نے نعوذ باللہ من ذالک مالوی جی کے قدموں پر سجدہ کیا۔ مہاتما جی نے ہمیشہ مالوی جی کو سراہا اور ہمیشہ اس سے انکار کیا کہ وہ مسلمانوں کے بہی خواہ نہیں بلکہ بدخواہ ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ اسلام سے اور ہم سے ۱۹۲۶ء کے آخر تک اتنے ناآشنا رہے کہ انھوں نے باور کر لیا کہ میں نے مالوی جی کو سجدہ کیا ہوگا، یا ان کے قدموں پر اس طرح سر رکھا ہوگا جس طرح احمد آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں ان کے خلاف میرے رولنگ پر ان کے رو پڑنے کے بعد میں نے رو کر ان کے قدموں پر سر رکھ دیا تھا۔ خیر جو کچھ بھی ہوا ہو اب تو یقینی ہے کہ مالوی جی نے نہرو کمیٹی کی رپورٹ کی جو مدراس کانگریس کی تجویز کے سراسر خلاف تھی پوری تائید فرمائی اور ان کی مدراس کانگریس کے فیصلے سے روگردانی کی، مجھے اس کا حق دیتی ہے کہ ان سے روگرداں ہو جاؤں۔ افسوس اگر ہے تو اس کا کہ مہاتما جی بھی مدراس کے اس فیصلے سے روگرداں ہو گئے جس میں آخر وقت خود مداخلت بیجا کر کے انھوں نے ترمیم کروائی تھی۔

(۴۸) سمجھوتے سے روگردانی

(ہمدرد ۱۵ر جنوری ۱۹۲۸ء)

مدراس کانگریس کے بعد کلکتے میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس سے پہلے اعضائے مسلم لیگ میں ایک سخت تنازعہ واقع ہو چکا تھا اور آخر وقت تک یہ امر مشتبہ تھا کہ مسلم لیگ کا اجلاس کلکتے میں منعقد ہو گا بھی یا نہیں جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کانگریس والے تو اس اصول کے قائل ہی نہ تھے کہ ہندوستان کا دستور اساسی سوائے ہندوستان والوں کے کوئی دوسرا بنائے اس لئے وہ تو ایسے کمیشن کو بھی قبول نہیں کر سکتے تھے جس کے تمام اعضاء ہندوستانی نہ ہوں۔ لیکن جب سائمن کمیشن کے سب کے سب اعضاء انگریز مقرر ہوئے تو لبرل فیڈریشن اور مسلم لیگ کے صدر نے بھی اس کے بائیکاٹ کی ٹھان لی مگر سر محمد شفیع اب بھی اس پر راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے اور ان کے رفقاء نے لاہور میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کرانا چاہا اور لطف یہ کہ ان کے رفقاء نے انھیں کو اس اجلاس کا صدر بنانا چاہا۔ حالانکہ دستور یہ ہے کہ جس صوبے میں مسلم لیگ کا یا کانگریس کا اجلاس ہوا کرتا ہے اس صوبے سے کسی عضو کو صدر نہیں بنایا جاتا۔ مسلم لیگ کے دیگر اعضاء نے سر آغا خاں کو صدر بنانا چاہا اور گو مسٹر جناح نے پسند نہ کیا کہ مسلم لیگ کا اجلاس مدراس میں منعقد ہو جہاں ہندو مسلم تنازعات کا فیصلہ باہمی مفاہمت سے ہو جاتا تاہم انھوں نے کلکتے کی دعوت کو قبول کر لیا اور اس کا امکان ہو گیا کہ مدراس کی کانگریس سے فارغ ہوتے ہی ہم کانگریس والے بھی مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہو جائیں گے اور اس کا اجلاس بھی بجائے

دن کی تعطیلوں ہی میں منعقد ہو جائے۔ مقام اجلاس اور صدارت کے انتخاب کے بارے میں مسلم لیگ کی کونسل میں جو تنازعات واقع ہوئے اس کا دہرانا ضروری نہیں صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہو گا کہ سر محمد شفیع اور ان کے رفقا نے کلکتے کے اجلاس میں شرکت کو گوارا نہ کیا اور خود لاہور میں ان کی صدارت میں مسلم لیگ کے اجلاس کے نام سے ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس کے باعث مسٹر جناح سخت پریشان تھے کہ کلکتے میں مسلم لیگ کا اجلاس ہو بھی سکے گا یا نہیں اور وہ ہم کانگریس والے مسلمانوں کی اعانت کے محتاج تھے۔ عین وقت پر سر عبدالرحیم کو بھی حکومت پرستوں نے توڑ لیا تھا اور سخت اندیشہ تھا کہ مسلم لیگ کی کونسل کلکتے کے اجلاس کے خلاف فیصلہ نہ کر دے۔

ڈاکٹر انصاری کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ وہ مسلم لیگ کے کس قدر خلاف تھے اور اس کو کس قدر بے حقیقت سمجھتے تھے۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اسی علی گڑھ والے اجلاس میں جس میں انھوں نے ہماری معیت میں بھی شرکت گوارا نہ کی تھی، جو سلوک شوکت صاحب اور میرے ساتھ کیا گیا تھا اس نے ہمیں بھی اس قدر بددل کر دیا تھا کہ ہم بھی آئندہ کے لئے طے کر چکے تھے کہ اب اس میں شریک نہیں ہوا کریں گے۔ وہی سر علی امام جو آج پنڈت موتی لال نہرو اور ڈاکٹر انصاری کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں علی گڑھ کے اجلاس میں ہم سب کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور انھیں نے مسلم لیگ کی پرانی تجویز کو اس اجلاس میں پیش فرمایا تھا اور لطف تو یہ ہے کہ وہی سیٹھ یعقوب حسن صاحب جنھوں نے نہرو کمیٹی کے دستور اساسی کو بنیادی تجویز کی ابھی کلکتہ کنونشن میں تائید فرمائی اور جنھوں نے باوجود جمعیت خلافت کے نائب صدر ہونے کے اس کی ہدایات کو ٹھکرا کر ایک جماعت کو اس کا نمائندہ بنا کر کنونشن میں بھیجا اور ہمارے خلاف

ایک از سرتاپا جھوٹے بیان کو اخبارات میں شائع کرایا، انھیں نے علی گڈھ کے اجلاس میں سر علی امام کی تجویز کی تائید کی! میں نے جو ترمیم پیش کی اسے سر عبدالرحیم نے جو صدارت فرما رہے تھے مسٹر جناح کے ایما سے باقاعدہ ٹھہرا دیا اور اس لئے مجھے مجبور کیا کہ میں سر علی امام کی پیش کردہ تجویز کی مخالفت کروں۔ موصل کے مسئلے میں جو تجویز بالآخر مسلم لیگ کی سبجکٹ کمیٹی نے منظور کی اس کو بھی مطبوعہ پروگرام کے خلاف اس اجلاس میں اس وقت پیش کر دیا گیا جبکہ ہم نماز ظہر کے لئے باہر گئے ہوئے تھے تاکہ ہم اس پر تقریر بھی نہ کر سکیں اور حکومت پرستوں کی وفاداری کے جذبے کو ذرا سی بھی ٹھیس نہ لگنے پائے۔ اس تمام کارروائی کے بعد ہم نے ڈاکٹر انصاری کی طرح فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مسلم لیگ میں ہرگز شریک نہ ہوا کریں گے۔ اس کا دستور اساسی اس قدر ناقص ہے کہ اس جمعیت کو کوئی بھی مسلمانوں کا یا کسی جماعت کا نمائندہ نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ اس کے اعضاء کا انتخاب جو اس کی کونسل و اعضاء کی نامزدگی پر کیا کرتی ہے اور کانگریس یا جمعیت خلافت کی ہر طرح عاقل و بالغ ایک مقررہ فیس دے کر اس کا عضو نہیں بن سکتا اسی لئے جمعیت خلافت نے مئی ۱۹۲۶ء کے اسپیشل اجلاس منعقدہ دہلی میں مسلمانوں کے شعبہ سیاسی کو بھی اپنے ذمہ لے لیا تھا تاکہ ہر وہ عاقل و بالغ مسلمان جو اس کے مقاصد کو قبول کر کے سالانہ چندہ دیا کرے اس کا عضو بن سکے اور اس طرح جب اس کے اعضاء ضلعوں اور صوبوں کی جمعیتوں کی طرف سے نمائندے منتخب کریں اور مرکزی کمیٹی اور کانفرنس کے اعضاء چنے جائیں تو وہ ملت اسلامیہ کے صحیح نمائندے ہو سکیں۔

اس کے بعد مسلم لیگ مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کرنے کا کسی طرح بھی اہل نہیں سمجھا جا سکتا تھا اور جمعیت خلافت ہی اس کی اہل کہی جا سکتی تھی تاہم ہم ڈاکٹر انصاری کو اور ہمیں اس کا ضرور احساس تھا کہ جس لیگ کی ہم نے سالہائے گذشتہ میں

خدمت کر کے ایک ساکھ قائم کی تھی، اسی کے جسد بے روح کو چند حکومت پرست
جن کا مسلمانوں کی کسی جماعت نے برسوں سے انتخاب نہیں کیا تھا استعمال کر کے
سائمن کمیشن کے روبرو ملت اسلامیہ کے نمائندے بن کر پہنچ جائیں گے۔ اس لیے
ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس موقع پر اس میں شریک ہوں اور اس کو اس حکومت پرستی
اور غلامی کے مظاہرے سے بچائیں۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری تو صدارت کانگریس کی
مجبوری سے ایک دن اور مدراس میں مقیم رہے، مگر ہم کانگریس کے اس فیصلے کے
بعد ہی جب مالوی جی جیسے ہندو مہا سبھائی نے بھی بالآخر تسلیم کر لیا تھا، عازم کلکتہ ہو گئے
اور مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں شریک ہو کر ہم نے اپنے براہین و دلائل اور اپنی
اکثریت کے زور سے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کو کلکتے ہی میں منعقد کرایا اور اس میں
ہم بھی شریک ہوئے اور ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی۔ گو میں نہیں کہہ سکتا
کہ یہ دونوں حضرات اس کے اعضاء بھی تھے یا نہیں۔ آج جبکہ نہرو کمیٹی کی رپورٹ
کی حمایت میں زبردستی ملت اسلامیہ کا نام لیا جا رہا ہے اور جمعیت خلافت اور مسلم لیگ
دونوں کی اکثریت کو کسی نہ کسی طرح اس نئے ناروا فیصلے کے مؤید ثابت کرنے کی
کوشش ہو رہی ہے اور اگرچہ کلکتے کے کنونشن کو کامیاب نہیں بنایا جا سکا، مگر
امید کی جا رہی ہے کہ گرمیوں میں مسلم لیگ کو کسی طرح کتر بیونت کر کے اس فیصلے
کے موافق ظاہر کیا جا سکے گا، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں مسلم لیگ کی حقیقی حیثیت
کے متعلق اپنے اور ڈاکٹر انصاری اور ان کے رفقاء سب کے ان خیالات کا اظہار
کروں جن کے ساتھ ہم کلکتہ کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں شریک ہوئے تھے۔

اب اس اجلاس کی داستان بھی سن لیجئے، اور سمجھ لیجئے کہ کس دقت کے
ساتھ ہم نے باوجود مسٹر جناح اور ان کے دست و بازو اور وطن پرست مسٹر چاگلا
کے تذبذب بلکہ ایک حد تک مخالفت کے مسلم لیگ کو مشروط مخلوط انتخاب پر راضی

کیا تھا۔ مسٹر جناح سر محمد شفیع کی کارروائی سے سخت پریشان ہو رہے تھے اور جب میں نے مشروط مخلوط انتخاب کی تجویز پیش کرنا چاہی تو انھوں نے مجھے روکنا چاہا اور کہا کہ مسلم لیگ میں یوں ہی تفریق ہو گئی ہے اور اس کا ٹکڑا لاہور میں اجلاس کر رہا ہے، اگر ہم نے مخلوط انتخاب کا نام بھی لیا تو یہاں دوسرے ٹکڑے میں بھی سخت اختلاف واقع ہو جائے گا اور ہماری جماعت بھی منتشر ہو جائے گی، اس وقت مصلحت یہی ہے کہ مخلوط انتخاب کا مسئلہ پیش نہ کیا جائے، صرف سائمن کمیشن کے مقاطعے کی تجویز ہی یہاں پیش کر دی جائے۔ میں نے کہا کہ مسلمان اس وقت ہدایت کے محتاج ہیں، آپ اگر ان کے ہادی ہیں تو ہدایت سے کنارہ کشی نہ کیجیے۔ وہ تمام دلائل و براہین جو گذشتہ مارچ میں سربرآوردہ مسلمانوں کے سامنے دہلی میں پیش کی گئی تھیں اور جنھوں نے سر محمد شفیع تک کو قائل کر دیا تھا آج اعضائے مسلم لیگ کے سامنے بھی پیش کر دی جائیں گی تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی دہلی کی تجاویز کو منظور کر لیں گے اگرچہ مسٹر جناح بھی اس پر مذبذب رائے تھے مگر میں نے وہ پوری تجویز سبجکٹ کمیٹی میں پیش کر دی جس کو مدراس کانگریس منظور کر چکی تھی۔ میں نے اس وقت اس پر تقریر نہ کی اور اپنے حق تقریر کو محفوظ رکھ کر سر علی امام سے اس کی تائید کرائی۔ جناب موصوف نے اس کی تائید میں کوئی پُر زور تقریر نہیں فرمائی تاہم یہ تجویز باضابطہ طور پر پیش ہو گئی۔ پنجاب کے ملک برکت علی صاحب سر محمد شفیع کی جماعت سے کسی بات پر علیحدہ ہو چکے تھے، مگر اس وقت تک وہ اہل پنجاب کی طرح مخلوط انتخاب کے نام سے بھی لرزتے تھے۔ انھوں نے اس تجویز کی مخالفت میں ایک نہایت زوردار تقریر کی۔ چونکہ رات زیادہ گذر چکی تھی میری تقریر دوسرے دن کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ دوسرے دن اعضائے سبجکٹ کمیٹی جلسے کی ابتدا کے وقت بڑی تعداد میں نہ آئے تھے اس لیے مولوی محمد یعقوب صدر اجلاس اور مسٹر جناح نے مناسب سمجھا

کہ میری تجویز پر ابھی بحث نہ کی جائے بلکہ چند اور کم اہم تجاویز پیش کر کے انھیں جلد منظور کر لیا جائے۔ میں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا مگر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اسی وقت ایک تجویز مسٹر جاگلا نے بھی پیش کر دی جو اگر منظور ہو جاتی تو میری تجویز منظور نہ کی جا سکتی تھی۔ اس پر میں نے بے ضابطگی کا اعتراض اٹھایا تو مسٹر جناح نہایت بگڑ کر بولے کہ جس تجویز سے مسٹر محمد علی کو اتفاق نہیں ہوتا اسے وہ بے ضابطہ قرار دے دیا کرتے ہیں۔ میں نے اس انداز گفتگو پر اعتراض کیا اور اصرار کیا کہ صدر اجلاس میرے اعتراض پر فیصلہ صادر کریں۔ اس پر مسٹر جناح نے پھر بگڑ کر کہا کہ یہ مداخلت بیجا ہرگز روا نہیں اور مسٹر جاگلا کی تجویز پر بحث ہونا چاہیے۔ جب میں نے صدر اجلاس سے اجازت چاہی کہ میں اپنے اعتراض کے واجبی ہونے کے ثبوت میں دلائل پیش کروں تو مسٹر جناح نے اور بھی سخت کلامی سے کام لیا اور کہا کہ I do not want to be bullied (میں ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ سینہ زوری کے ساتھ مجھے دبایا جائے) جس کا جواب میں نے بھی اسی طرح دیا کہ I too do not want to be bullied (میں بھی اسے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ سینہ زوری کے ساتھ مجھے دبایا جائے۔) اس تو تو میں میں کے بعد صدر اجلاس نے مجھے اجازت دی کہ اپنے دلائل پیش کروں اور میں نے سبجکٹ کمیٹی کو بتایا کہ جب ایک تجویز ایوان کے سامنے پیش کر دی گئی تو کوئی دوسری تجویز اس کے بعد ایسی پیش نہیں کی جا سکتی جس کے منظور کر دیے جانے کے بعد پہلی تجویز منظور نہیں کی جا سکتی۔ اگر کسی عضو کو بھی پہلی تجویز سے اختلاف ہے تو وہ اس کی مخالفت کر سکتا ہے یا اس میں کوئی ترمیم پیش کر سکتا ہے، اور اگر اس کے خلاف فیصلہ کرنا مقصود نہیں ہے محض اس پہلی تجویز پر مباحثے کو ملتوی کرنا مد نظر ہے تو اس کے لیے ضابطہ یہ ہے کہ ایک تحریک اس تجویز پر مباحثے کے التوا کی پیش کی جا سکتی ہے۔ چونکہ جاگلا

صاحب نے یہ نہیں کیا ہے اس لئے ان کی تجویز پیش نہیں کی جا سکتی اور اب میں اپنی تجویز پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ مولوی محمد یعقوب نے بہ ظاہر اس سے اتفاق کیا اور بہر حال مجھے اس کی اجازت ملی کہ میں شب ماقبل کی پیش شدہ تجویز پر تقریر کروں۔

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ ملک برکت علی بھی میرے ہم رائے ہو گئے اور ظفر علی خاں صاحب اور داؤد غزنوی صاحب نے بھی اتفاق کیا، مگر میری تجویز کے الفاظ میں اس طرح ترمیم کرانا چاہی کہ جب تک وہ تمام شرائط پوری نہ ہو جائیں جو دہلی کی تجاویز میں شامل تھیں اور جنھیں موتی لال جی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں گذشتہ مئی میں باسلوب دیگر منظور کرا چکے تھے اور جنھیں اب مدراس کانگریس نے بھی اسی اسلوب کے ساتھ منظور کر لیا تھا، تب تک مسلمان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر انصاری خود کئی بار اس کو تسلیم کر چکے ہیں کہ مدراس کانگریس نے جس تجویز کو ان کی زیر صدارت مالوی جی کی تائید کے بعد منظور کیا تھا، اس کا منشا بھی یہی تھا کہ تمام تجاویز ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور سب پر ایک ہی وقت عمل ہو گا، یہ نہیں کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی جگہ تو مخلوط حلقہ ہائے انتخاب فوراً قائم کر دیے جائیں مگر سندھ کی علیحدگی یا صوبہ سرحد میں اصلاحات کا اجرا عمل میں نہ لایا جائے یا بعد میں عمل میں لایا جائے۔ مگر تجویز کا یہی وہی جزو تھا جس کی بنا پر لالہ لاجپت رائے اور دوسرے ہندو مہا سبھائیوں نے آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی میں بار بار کہا کہ کلکتہ مسلم لیگ کی تجویز وہ نہیں ہے جو مدراس کانگریس کی تجویز ہے۔ بہر حال میں نے اس لفظی تجویز کو قبول کر لیا اور بالآخر مسٹر جناح بھی راضی ہو گئے اور انھوں نے اس تجویز کے دیباچے میں چند الفاظ اس قسم کے بڑھوا دیے کہ مندرجہ تحت تجاویز کو مد نظر رکھتے ہوئے مسلم لیگ کے نمائندے کانگریس کی مدعو کردہ آل پارٹیز کانفرنس کے مباحثے میں

حصہ لیں۔ میں نے اسے بھی قبول کرلیا اور جب اس طرح ترمیم شدہ تحریک پر جب
میں بحث شروع ہوئی تو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے دل دادہ جلد ہی ہار مان
گئے۔ مسز بیسنٹ نے فرمایا کہ میں اپنے ان رفقائے پارلیمنٹ کو جو میرے کامن ویلتھ بل
کو دارالعوام میں پیش کرچکے ہیں اطلاع دیدوں گی کہ وہ بھی سندھ کی علیحدگی اور
صوبہ سرحد میں اصلاحات کے اجراء کے ساتھ مخلوط انتخاب کو مشروط کردیں ورنہ
میں اس کی منظوری پر راضی نہ ہوں گی۔

پنڈت مدن موہن مالوی نے بھی مسلمانوں کے اس فیصلے پر اظہار خوشنودی
وشکر گذاری فرمایا اور سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس
تجویز کی تائید میں تقریر فرمائی اور میرے اس خیال کی تائید فرمائی کہ مسلم اقلیت کے
حقوق پہلے بھی محفوظ تھے لیکن جب پانچ صوبوں میں ان کو بھی اکثریت حاصل
ہوجائے گی تو ان کے حقوق محفوظ ہوجائیں گے۔ افسوس کہ ہندو اخبارات نے
ہندو مسلم اتحاد کے اس مقبول ترین حامی پر اس کے بعد اعتراضات کرنا شروع کئے
کہ لو اب تو یہ بھی علی برادران اور مسلم لیگ والوں کی طرح مسلم حقوق کی حفاظت کے
خواستگار ہیں اور اس کے لئے مسلمانوں کی بھی پانچ صوبوں میں اکثریت قائم کرانا
چاہتے ہیں تو مولانائے موصوف نے ایک مبہم سی تردید اخبارات میں شائع کرادی۔
بہرحال یہ تجویز مسلم لیگ میں ڈاکٹر انصاری کی موجودگی میں پیش ہوئی اور اگرچہ
سائمن کمیشن کے مقاطعے کے خلاف چار ہاتھ اٹھے تھے مگر اس تجویز کے خلاف باوجود
مسٹر جناح کے خوف کے کسی کا ہاتھ نہ اٹھا۔ اگر اٹھا تو رفیع قدوائی صاحب کا جو
اس تجویز کے ان الفاظ سے اختلاف رکھتے تھے جنہیں اہل پنجاب کے پیش کرنے
پر میں نے قبول کرلیا تھا۔ میں خوش ہوں کہ میری اس تجویز کو مولانا ابوالکلام آزاد،
ڈاکٹر انصاری، مسز بیسنٹ، مالوی جی اور مسٹر جناح اور مسٹر چاگلا نے بھی قبول فرمایا۔

لیکن میں اس کا ادعا کرتا ہوں کہ جن شرائط کے ساتھ بھی مخلوط انتخابات کو مسلم لیگ اور مسلمانوں کی ایک وسیع جماعت نے قبول کیا، ان سے ان انتخابات کو قبول کرانے والا حقیقتاً صرف ایک شخص تھا اور اس کا نام محمد علی ہے۔ مسلم لیگ صوبجات متحدہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ میرٹھ میں بھی اسے میں نے ہی منظور کرایا تھا، حالانکہ میں اس وقت اس کا ایک عضو بھی نہ تھا اور کلکتے میں بھی اسے میں نے ہی منظور کرایا تھا۔ اس کی تائید میں میں نے ہی "ہمدرد" کے کالم کے کالم سیاہ کئے تھے اور بعض مرتبہ تو اس کے روزانہ پرچے صرف اسی وجہ دوسرے دن کی ڈاک میں ڈالے گئے تھے کہ میرا مضمون باوجود پانچ چھ کالم سے بھی بڑھ جانے کے کسی قدر تشنہ رہ جاتا تھا اور میں یہ چاہتا تھا کہ جو مسلمان ایک آنہ دے کر اسی دن کا پرچہ خریدے وہ پوری طرح قائل ہونے سے رہ جائے اور مجبور ہو کر مغرب تک مضمون لکھتا رہتا تھا، اگرچہ میں جانتا تھا کہ اس طرح بہت سے دوسرے ضروری مواد کو اس دن کے پرچے سے نکالنا پڑے گا اور مضمون بے حد طویل ہو جائے گا اور اخبار وقت پر نہ چھپ سکے گا۔

پٹنے میں جس طرح لڑ جھگڑ کر، سمجھا بجھا کر، منت سماجت کر کے، دلائل و براہین دے کر، ہنسا ہنسا کر، رُلا رُلا کر میں نے مخلوط انتخاب کی تجویز کو منظور کرایا، اس سے بھی بعض وہ پرانے احباب اور رفقائے کار ناواقف نہیں جو آج مخالفین ہی نہیں بلکہ اعدا کے زمرے میں نظر آ رہے ہیں اور مجھ پر تبرّا بھیج رہے ہیں۔ پھر کلکتے کی خلافت کانفرنس کا کیا ذکر کروں؟ لیکن ہمارے مخالفین سب اصول کے پابند، حق گو اور حق پرست ہیں اور ہم غدار ہیں، مکار ہیں، اوباش ہیں، غنڈے ہیں، ہندو مسلم اتحاد کے دشمن ہیں، حکومت پرست ہیں اور حکومت پرستوں کے زیر سایہ زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ ہندو اخبارات سے اور زردار "زمیندار" سے تو شکایت

بی کرنا فضول ہے ان کے ایمان اور عمل صالح کا تو قائل ہی کون تھا؟ مگر جب عمر بھر کی دوستیاں کچے دھاگے سے بھی زیادہ کمزور ہوں تو سوائے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے چارہ ہی کیا ہے؟ شکر خدا کہ کم از کم اس پر آج بھی اسی طرح یقین ہے جس طرح کہ پہلے تھا کہ ہمارے ہی صبر و شکر کے لئے یہ صلہ مقرر فرمایا گیا ہے کہ اولئک علیہم صلوات من ربہم ورحمہ واولئک ہم المہتدون ○

(۵) آل پارٹیز کانفرنس اور نہرو رپورٹ

ہمدرد ۱۶ر جنوری ۱۹۲۹ء

میں نے جو سلسلۂ مضامین "روداد چمن" کے عنوان سے "ہمدرد" مورخہ
۱۰ر ۱۳ر ۱۴ اور ۱۵ر جنوری میں شائع کر دیا تھا وہ اس روداد کو اواخر دسمبر ۱۹۲۷ء
تک لے آیا جبکہ ایک طرف تو کانگریس نے مدراس میں اور دوسری طرف مسلم لیگ
نے کلکتے میں "تجاویز دہلی" منظور کردہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء پر اپنی صاد کر دی تھی۔
آج اس روداد کے سلسلے کو ۱۹۲۸ء سے جاری کرتا ہوں جبکہ کانگریس کی مدعو کردہ
آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس صدر کانگریس ڈاکٹر انصاری کے مکان پر منعقد ہونے
لگے۔ اس کانفرنس میں جن جمعیتوں اور انجمنوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی
ان میں سے حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔

نیشنل لبرل فیڈریشن یعنی ماڈریٹ خیال کے لوگوں یا اعتدال پسندوں
کی جمعیت، ہندو مہا سبھا، جمعیت خلافت، مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء، سکھ لیگ،
جنوبی ہندوستان کی لبرل فیڈریشن جس میں غیر برہمنوں کی ایک بڑی جماعت جو
صوبۂ مدراس کی حکومت میں خاصہ حصہ لے رہے ہیں شامل ہے، مدراس کے
زمینداروں کی انجمن ......، ہندوستانی ریاستوں کے باشندوں کی کانفرنس،
ہوم رول لیگ، بمبئی کی سوراج سبھا، ہندوستان کے مزدوروں کی انجمن (ٹریڈ
یونین کانگریس)، ریپبلکن لیگ (جمہوریت پسندوں اور مخالفین ملوکیت کی
جمعیت)۔

ان انجمنوں اور جمعیتوں کا بالخصوص اس لئے ذکر کیا ہے کہ ان کے

نمائندوں یا ان کے بعض سربرآوردہ ارکان نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی ورنہ یوں تو پارسیوں، اینگلو انڈینوں اور برہمیوں وغیرہ کی جمعیتیں اور انجمنیں مدعو کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ آسمبلی کی نیشنلسٹ و مہاسبھائی اور انڈیپنڈنٹ (مسٹر جناح کی پارٹی جس میں دو ہندو اور تقریباً دس مسلمان ممبر ہیں) پارٹیاں بھی مدعو تھیں۔ سنٹرل مسلم پارٹی (نواب سر ذوالفقار علی خاں کی پارٹی) غالباً اس لئے مدعو نہیں کی گئی تھی کہ اس نے سائمن کمیشن کا مقاطعہ نہیں کیا تھا۔

مسلمانوں کی جمعیتوں میں سے جمعیت العلماء نے تو اپنے چند ارکان اس کانفرنس میں شرکت کے لئے بھیجے تھے مگر چونکہ سارا مباحثہ انگریزی ہی میں ہوتا رہا اس لئے وہ ان حالات میں اپنی حاضری کو فضول سمجھ کر بعد کے اجلاسوں میں شریک نہیں ہوئے۔ کلکتہ مسلم لیگ میں باوجود مسٹر جناح اور ان کے رفیق کار مسٹر چاگلا کی اگر مخالفت نہیں تو ان کے بعد تامل کے بعد "تجاویز دہلی" پر لیگ نے ایک ریزولیوشن کے ذریعے سے اپنی صاد بھی کردی تھی اور لیگ کی کونسل کو اس کا مجاز کیا تھا کہ ایک سب کمیٹی مقرر کرے جو کانگریس کی مجلس عاملہ اور اسی قسم کی دوسری جمعیتوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کے لئے دستور اساسی کا ایک ایسا مسودہ تیار کردے جس میں ملت اسلامیہ کا مفاد بھی محفوظ رہے اور "تجاویز دہلی" پر بھی جنھیں لیگ نے منظور کر لیا نظر رکھے" اور اس کے بعد کانگریس کی مجوزہ کنونشن میں بھی شریک ہو۔ یہ ریزولیوشن کلیتہً ان الفاظ میں نہ تھا جن میں اسے میں نے سبجکٹ کمیٹی میں پیش کیا تھا بلکہ مسٹر جناح نے جن کی مخالفت نہیں تو کم از کم ان کے بعد تامل کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جنھوں نے سبجکٹ کمیٹی میں مجھ سے سخت تکرار کی تھی (اور جس کی تفصیل اس عنوان کے مضمون نمبر ۲ میں دی جاچکی ہے) میرے ریزولیوشن کے الفاظ کو اس طرح بدل دیا تھا کہ جو سب کمیٹی لیگ کی

کونسل غور کرے وہ "تجاویز دہلی" پر بھی نظر رکھے' اور ان تجاویز کو اس سے زیادہ اہمیت دینا ان کو اس وقت اس خوف سے گوارا نہ تھا کہ کہیں مسلمان مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کو دہلی کی مجوزہ شرائط کے ساتھ بھی ٹھکرا نہ دیں اور وہ مسٹر جناح کی مسلم لیگ سے بے زار ہو کر کہیں سر محمد شفیع کی لاہور والی لیگ میں شریک نہ ہو جائیں لیکن میرے اصرار کرنے پر انھوں نے اتنا البتہ قبول فرمایا کہ یہ الفاظ بڑھا دیے جائیں کہ لیگ حسب ذیل تجاویز کو جن پر اس کی سب کمیٹی کو نظر رکھنا چاہیے منظور بھی کرتا ہے اور اب وہ صرف تجاویز دہلی نہ رہیں گی بلکہ تجاویز لیگ ہو جائیں گی لیکن باوجود اس کے کہ لیگ کی کونسل کو اس سب کمیٹی کے مقرر کرنے کے لئے پورے چالیس دن ملے اس کی شہرت اور مقبولیت طلب سکریٹری صاحب ڈاکٹر کچلو نے جو بگام کی خلافت کانفرنس میں صدارت کرنے کے لئے ایک ایسا خطبۂ صدارت ہنود اور بالخصوص لالہ لاجپت رائے کی سیاست کے خلاف لکھ کر لائے تھے کہ اس کی اصلاح کا تشنہ رہا تھا اور جنھوں نے اس کے چند ہی ماہ بعد ہم لوگوں سے قطع تعلق کر کے خلافت کی صدارت سے استعفا دے دیا اور سر محمد شفیع اور ان کے ہم خیال وفا شعاروں کی ایک انجمن کے سکریٹری بن بیٹھے اور جن کے اصحاب الفیل والے جلوسوں کے تار اس کے بعد اخبارات کو بھیجے جانے لگے مگر جنھوں نے "تنظیم" کا نام بدنام کرنے کے سوا تنظیم ملت کا خاک کام نہ کیا۔ اس پورے عرصے میں کچھ نہ کیا اور جب ۱۲ فروری ۱۹۲۸ء کو یہ کانفرنس اپنا کام کرنے کے لئے بیٹھی تو اس میں لیگ کا ایک بھی نمائندہ نہ تھا گو تین ممبران اسمبلی جو انڈیپنڈنٹ پارٹی کے اعضاء تھے اور نیز مسلم لیگ کے سربرآوردہ ارکان تھے یعنی مسٹر جناح صدر لیگ' نواب اسمٰعیل خاں صاحب اور راجہ غضنفر علی خاں صاحب تقریباً ہر روز اس کانفرنس میں شریک ہوتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کانفرنس کے کسی

ریزولیوشن کو لیگ کی طرف سے منظور نہ کر سکے اور ایک معنی میں لیگ اس کی شرکت سے محروم رہا۔

میں ابھی ان ریزولیوشنوں کا خلاصہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے والا ہوں لیکن پیشتر اس کے کہ اس خلاصے کو پیش کروں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ۱۲ فروری سے لے کر ۲۲ فروری تک جبکہ اس کانفرنس نے ایک کمیٹی دستور اساسی کے چند خاص اہم مسائل پر غور کرنے کے لئے مقرر کی اور اپنے اجلاسوں کو ۱۰ مارچ تک ملتوی کر دیا لیگ کی کونسل نے اپنا کوئی جلسہ منعقد نہیں کیا اور اگرچہ ۲۶ فروری کو ایک جلسہ منعقد ہوا لیکن اس میں بھی سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ ۵ مارچ کو کونسل کا ایک اسپیشل جلسہ طلب کیا گیا جس میں "حالات موجودہ" پر غور کرنے کے بعد اس کا "آخری فیصلہ" کیا جانے والا تھا کہ کونسی "راہ عمل" ضروری ہے پس "الحمد اللہ خیر صلا" ۵ مارچ کو جو جلسہ منعقد ہوا اس میں بھی کونسل نے کسی "راہ عمل" کو "ضروری" سمجھ کر اس کے اختیار کرنے کا "آخری فیصلہ" نہ کیا۔ ہم نے لاکھ کہا کہ آپ حضرات وہی سب کمیٹی مقرر فرمائیں جس کے مقرر کرنے کے آپ کلکتہ لیگ کے ریزولیوشن کی رو سے مجاز قرار دیئے گئے ہیں، جو پوری طرح با اختیار ہو اور دوسری جمعیتوں اور انجمنوں کے نمائندوں کی طرح آل پارٹیز کانفرنس کے مباحثے میں حصہ لے اور ایک ایسا دستور اساسی وضع کرائے جس میں مسلمانوں کا مفاد محفوظ رہے اور لیگ کی منظور کردہ تجاویز بھی بالفاظ ریزولیوشن کلکتہ لیگ ملحوظ خاطر رہیں مگر ہم ملک پروروں کی اس زمانے میں لیگ کے نام نہاد "ملت پروروں" اور دراصل نفس پروروں کے دربار میں کہاں شنوائی تھی، بڑی مشکل سے اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے نہایت خلوص اور جوش سے اس اظہار کرنے پر کہ اس کانفرنس کے مختلف ارکان ہماری توقع سے کہیں زیادہ....

تجاویز دہلی ۹ اور مدراس کانگریس اور کلکتہ لیگ کے ریزولیوشنوں سے متعلق ہیں اس وقت صرف ایک ہندو مہاسبھا ہے جو اختلاف پر اڑی ہوئی ہے اور اس کو ضد اور ہٹ دھرمی دوسری جمعیتوں اور انجمنوں کے نمائندوں کو اس سے بدظن کئے دیتی ہے۔ اگر اس وقت لیگ نے بھی ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا اور اپنے نمائندوں کو اس کانفرنس میں نہ بھیجا تو ایک نایاب موقعہ مسلمانوں کے واجبی حقوق کو ہندو مہاسبھا کے سوا سارے ملک سے الگ کرکے چھوڑ دینے کا جاتا رہے گا اور ہم بھی ہندو مہاسبھا کی طرح ضدی اور ہٹ دھرم کہلائے جانے لگیں گے اور ہمارے واجبی حقوق کے مطالبے کی طرف سے بھی اور جمعیتیں اس طرح بدگمان ہو جائیں گی جس طرح وہ آج ہندو مہاسبھا کے دعاوی بے تعصبی، ملک پروری اور حق پرستی سے بدگمان ہیں۔

مسلم لیگ کی کونسل نے کثرت رائے سے چند نمائندے منتخب کئے مگر مسٹر جناح اس سے آگے قدم نہ بڑھا سکے کہ یہ نمائندے اس کانفرنس میں شریک ہوں اور ان تجاویز کو جو کلکتے میں لیگ نے میری استدعا پر منظور کی تھیں دوسری جمعیتوں اور انجمنوں کے نمائندوں پر بھی زور ڈال کر ان سے منظور کرائیں اور اس طرح زور ڈال کر منظور کرانے کی جد و جہد کے آخری نتائج کو مسلم لیگ کی کونسل کے سامنے پیش کریں تاکہ دستور اساسی کے وضع کرنے میں کوئی حصہ لینے سے قبل وہ بھی اس پر غور کرے کہ کیا کرنا مناسب ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ مسلم لیگ کے نمائندے اس کے مجاز نہ تھے کہ ان تجاویز میں جو کلکتہ لیگ میں میں نے منظور کرائی تھیں ذرا سا تغیر و تبدل بھی منظور کریں حالانکہ کانگریس کے نمائندے یقیناً اس کے مجاز تھے، کہ اگر ضرورت ہو تو مدراس کانگریس کے ریزولیوشن میں کچھ تغیر و تبدل قبول کرلیں اگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ نہ لیگ کے نمائندوں کا نہ کانگریس کے نمائندوں کا کسی

تغیر و تبدل کو قبول کرلینا لیگ کو یا کانگریس کو اس کے قبول کرلینے پر مجبور کرسکتا تھا کیونکہ کنونیشن تو اس کانفرنس کے بعد منعقد ہونے والا تھا اور اس کے فیصلے بھی ہر جمعیت کے سامنے اس کے مخصوص اجلاس میں پیش ہونے والے تھے اور کسی شے کی آخری منظوری ہر جمعیت کی مخصوص منظوری تھی نہ کہ کانفرنس یا کنونیشن کی منظوری۔ یہ تھا ۵ مارچ ۱۹۲۸ء تک مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد کا "فیصلہ" جسے طوعاً نہیں بلکہ کرہاً میں نے قبول کیا۔ اور یاد رہے کہ میرے ہی ساتھ ڈاکٹر انصاری نے بھی جن کی نہایت پرجوش اور پرخلوص تقریر پر اتنا بھی "فیصلہ" ہوا تھا اسے قبول کیا۔

اب یہ مضمون طویل ہو گیا ہے کل انشاءاللہ میں آل پارٹیز کانفرنس کے وہ ریزولیوشن دوں گا جن پر غور کرکے مسلم لیگ کی کونسل نے یہ "فیصلہ" صادر فرمایا تھا اور پھر تفصیل کے ساتھ عرض کروں گا کہ ہر زیر بحث مسئلے کے متعلق ہنود کا کیا رویہ رہا اور مسلمانوں کا کیا رویہ رہا اور کن دشواریوں سے کانفرنس نے ان مسائل کو اس طرح بھی طے کیا جس طرح وہ اس وقت طے ہوئے اور یہ بھی ظاہر کروں گا کہ خود میرا رویہ کیا رہا اور میں کس حد تک کانفرنس کے ریزولیوشنز سے متفق تھا اور کس حد تک ان سے اختلاف تھا لیکن جو کچھ اس وقت عرض کیا گیا ہے اس سے اس قدر نتیجہ تو بآسانی نکال سکیں گے کہ یا تو مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد کو سال بھر پیشتر ہم جیسے مسلمانوں کی ملت پروری سے بھی اس قدر بدگمانی تھی یا آج وہ یکایک اس قدر "ملک پرور" بن گئے ہیں کہ انھیں ہماری ملت پرستی پر تو ایمان بالغیب ہے لیکن ہماری ملک پروری سے وہ سخت بدگمان ہیں اور ہماری حق پرستی کا ان کو مطلق اعتبار نہیں.... یا آں بے نمکی یا ایں شوراشوری۔

مسئلۂ حجاز

(۱) ملوکیتِ حجاز اور سلطان ابنِ سعود

مہر صاحب کی کھلی چٹھی کا جواب

ہمدرد ۱۰ مارچ ۱۹۲۶ء

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

(۱)

مہر صاحب اور "زمیندار" کا انکسار

برادران مہر نا مہربان۔

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ برطانیہ نے اٹلی کو پھر ترکوں کے خلاف جنگ پر ابھارا ہے تاکہ ادالیہ کا جو وسیع رقبہ اتحادیوں نے اپنے زعم میں ترکوں کے ملک کے حصے بخرے کرتے وقت اٹلی کو دینا تجویز کیا تھا اُس وقت نہیں تو آج اٹلی کو مل جائے اور بطور رشوت کے دس ارب روپیے کے لگ بھگ بھی تتمۂ جنگ کو جو برطانیہ نے اٹلی کو دوران جنگ میں سودی قرضے پرلے کر دیا تھا بالکل مرفوع القلم کر دیا۔ اس پر وزارت اٹلی بڑے مزے سے اعلان کرتی ہے کہ اب ہم پر کسی کا قرضہ نہیں آتا بلکہ ہمارا قرضہ اوروں پر آتا ہے۔

برادرم تم نے بھی اٹلی کی تقلید کی۔ جو قرضہ میرا زمیندار کے ذمے نکلتا تھا اسے تو بالکل مرفوع القلم کر دیا گیا اور میری تحریر کا جواب آج تک نہیں دیتے مگر

میرے نام کھلی ہوئی چٹھی زمیندار میں شائع کر کے جواب کا مجھ
الٹا مجھے اپنا قرض دار قرار دے کر ادائگی قرضہ کا تقاضہ کر
کہ میں کس قدر علیل ہوں اور اس جواب کو بھی بستر مرگ پر
لکھوا رہا ہوں۔ گو تم خود اعلان جنگ کرتے ہو گر مجھ سے الٹا
فضول قلمی پیکار سے اہم اسلامی مقاصد کے صاف اور تاب
بتاتا ہوں، میرے اس مکتوب کی دھجیاں اڑانے کی کوشش
۱۹ر جنوری کے مقالۂ افتتاحیہ کی دروغ بافی سے متاثر ہو
جس کا جواب تار سے یاددہانی کرنے کے بعد بھی مجھے آج
ہوں کہ میرا "عام انداز تحریر جذبات انگیز ہے" اور سا تھ ہی
خلاف واقعہ" "زمیندار" میں "مجادلہ اور مقاتلہ بالقلم" جسے
سے جاری ہے گو میں برابر ضبط و تحمل سے کام لے رہا ہوں
مجالس کی پابندی سے مجبور ہو کر خاموش ہوں لیکن لطف یہ
اپنے ہی ضبط و تحمل کی تعریف کرتے ہو اور میری روش کو جا
"مجادلہ و مقاتلہ بالقلم" کے لئے انتہائی اضطراب دیتے تا
ہو اور سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک عالم کو
وعظ دلوانے کے بعد بھی انکسار کے دعوے دار ہو اور اپنے
فرماتے ہو ؎

از بے کسان شہرم و از ناکسان دہ
گر گشتۂ سر تو سلامت ہر اس کیست

برادرم، تمہاری اس کھلی چٹھی میں حیرانی کی اس
ذوق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل

اس کھلی چٹھی میں کوئی چیز تو ڈھکی ہوتی۔ اس کی عریانی پر شمشیر برہنہ کی تشبیہ بھی صادق نہیں اس لئے کہ عریانی کے ساتھ تلبیس بھی ہے اور کتمان بھی۔ لیکن تلبیس ہے تو وہی تلبیس حق بالباطل، اور کتمان ہے تو وہی کتمان حق۔ اس کھلی چٹھی کو اگر کسی چیز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو وہ یورپ کے ناچ گھروں کا لباس نسوانی ہے جو لباس کا لباس، کتمان کا کتمان اور اعلان کا اعلان ہے۔

سب سے پہلے جس دعوے کی قلعی کھولنا میں اپنا فرض جانتا ہوں وہ جھوٹا انکسار ہے جس کا اتنی بار ادعا کیا گیا ہے کہ خود اسی سے اس کی کیفیت آشکار ہو جاتی ہے۔ تمہاری کھلی چٹھی کی سرخی ہی میں تم اپنے کو "بیکسان شہر" اور "ناکسان دہر" میں شمار کرتے ہو۔ میں جب پہلی بار تم سے ملا تھا تو میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم ایک منکسر المزاج مگر ایک قابل صحیفہ نگار ہو۔ تمہارے حجاز کے مکاتیب نے میرے دل پر تمہاری قابلیت کا اور بھی سکہ بٹھلایا مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمہارے انکسار کے متعلق جو میرا خیال تھا وہ صحیح نہ نکلا بلکہ یا تو پہلے ہی سے تم میں اس چیز کی ایک حد تک کمی تھی یا کم از کم "جمال ہم نشیں در تو اثر کرد" اور "زمیندار" کی کان نمک میں جا کر تم بھی نمک ہو گئے۔ تمہارے اور عملۂ "زمیندار" کے انکسار کے فقدان کا ثبوت خود تمہاری کھلی ہوئی چٹھی اور "زمیندار" کے بیسوں مضامین ہیں۔ تم لکھتے ہو کہ "میں ایک ناچیز اور گمنام فرد ملت ہوں" اور "زمیندار" کے سارے ایڈیٹوریل اسٹاف کی حیثیت یہی ہے۔ اگر تم اس پر راضی ہو کہ جو حیثیت "زمیندار" کے سارے ایڈیٹوریل اسٹاف کی سمجھی جائے وہی تمہاری حیثیت بھی سمجھی جائے تو اس حالت میں تو تمہارا اپنے آپ کو ایک "ناچیز اور گمنام فرد ملت" کہنا اور بار بار اپنی "بے کسی" "ناکسی" "گمنامی" "ہیچ میرزی" کا راگ الاپنا اور بھی برا معلوم ہوتا ہے اور سوائے بناوٹ اور تصنع کے کچھ

وقعت نہیں رکھتا۔

پہلے اپنی کھلی چٹھی ہی کو دیکھو تمہارا اپنے اور "زمیندار" کے سارے ایڈیٹوریل اسٹاف کے متعلق یہ کہنا کہ ان کے ساتھ قیادت و رہنمائی کا طمطراق نہیں، ان کے گرد و پیش انسانوں کی کوئی جماعت نہیں، ان کے قبضے میں بہت بڑا وسیع حلقہ قبولیت نہیں" وغیرہ وغیرہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ تمہارے دل میں اس "طمطراق والی قیادت و رہنمائی" کی کوئی وقعت نہیں اور حقیقتاً تم اسے ذلیل سمجھتے ہو۔ نہ میں نے نہ مولانا محمد عرفان نے نہ مسٹر شعیب قریشی نے اپنے متعلق کبھی اس کا ادعا کیا یا دل میں سمجھا کہ انھیں "مہبط وحی اور منزل الہام" ہونے کا شرف حاصل ہے۔ میں اور وہ دونوں بقول تمہارے انسان ہیں گو شاید تم اور "زمیندار" انہیں شرف انسانیت سے بھی معرا سمجھو یا کم از کم ظاہر کرنے لگو۔ بقول تمہارے ہم سب دو ہی دو کانوں اور دو ہی دو آنکھوں والے انسان ہیں اور غیر معصوم انسان ہیں۔ ہم میں سے کسی نے بھی نہ تین کانوں کا نہ تین آنکھوں کا دعویٰ کیا ہے، نہ مجھے ان دو ارکان وفد خلافت کو بقول تمہارے حق حاصل ہے کہ اپنے ہر قول کو روح الامین کا فیضان قرار دیں یا اپنے رشتے کو غیر معصوم اور خطاکار انسانوں کی مشارکت اور مساہمت سے منقطع سمجھیں لیکن ناچیز اور گمنام اور ہیچ میرز افراد ملت دوسروں کے تخاطب کے لئے یہ طرز اختیار نہیں کیا کرتے، نہ کوئی منکسر مزاج شخص کھلی چٹھیوں میں لکھا کرتا ہے کہ "خدا کرے مسلمانان ہند کی قیادت و رہنمائی کے ذمہ دار اس حقیقت کا احساس فرمائیں"

میں معترف ہوں کہ تم نے اپنے متعلق بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ تم "انسان ہو، معمولی انسان ہو، ہر وقت غلطی اور خطا کے مرتکب ہو سکتے ہو" لیکن برادرم حقیقتاً منکسر المزاج لوگ اس شد و مد سے اپنے مرکب من الخطاء والنسیان

بھی ہونے کے اظہار کو ضروری نہیں سمجھا کرتے۔ میں خود بہت سی خطاؤں سے پُر ہوں اس لیے نہیں چاہتا کہ اپنے متعلق ایک جھوٹا دعویٰ کر کے اور خطا کار بنوں۔ برادرم میں خود بھی منکسر المزاج نہیں ہوں اور گو بہت بڑے بڑے لوگوں سے مجھے بسا اوقات اختلاف کی ضرورت پیش آئی ہے لیکن مجھ جیسے خود پسند نے بھی تمھاری طرح اپنی "گم نامی" "ناچیزی" اور "ہیچ میرزی" کا راگ بار بار نہیں الاپا۔ میں مشکور ہوں کہ تم نے میری "علوئے حوصلہ پاسداری و نگہبانی، ملفوظات و مقولات و رفعت و بلندیِ خیالات و جذبات و عزائم" کا ذکر فرمایا ہے گو صرف اسی غرض سے کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر کرو کہ میرا اعمال کا طرزِ عمل "ان خوبیوں کا قطعاً قابلِ نمونہ نہیں"۔ میں مشکور ہوں کہ تم نے اپنی کھلی چٹھی میں ارشاد فرمایا ہے کہ "دنیا مجھے تقریباً بارہ چودہ سال سے رئیس الاحرار کے لقب سے جانتی ہے اور میری ذات پر آپ سالہا سال سے فخر و مباہات کے خوگر ہیں" گو یہ اظہار بھی بظاہر اس لیے ہے کہ تمھارے نزدیک دنیا نے غلطی کی کہ مجھے اس لقب سے جانا اور میری ذات پر بیجا فخر و مباہات کی خوئے بد تم خود بھی چھوڑنا چاہتے ہو اور اوروں سے بھی چھڑانا چاہتے ہو۔

اس اظہارِ تشکر کے بعد کیا مجھے اجازت ہے کہ میں تم سے کہوں کہ اپنی کھلی چٹھی کو ایک بار پھر پڑھو اور جو کچھ تم نے میرے متعلق لکھا ہے اس کے بعد اپنے بار بار کے ادعائے انکسار پر غور کرو۔ یہی نہیں کہ تمھارے نزدیک میرے الفاظ "محض اخبار نویسیانہ ذمہ داری" کی توہین ہیں بلکہ عام شریفانہ اندازِ تحریر و تخاطب کی بھی صریح توہین ہیں۔ تم مجھے "ہندوستان کا ایک جلیل المنزلت رہنما" بھی لکھتے ہو اور میرے اخبار کو بھی ان الفاظ سے یاد کرتے ہو کہ "وہ محترم اخبار جو اپنے یومِ ولادت سے اس وقت تک مسلسل و متواتر بلند پایہ اصولِ

اخبار نویسی کی تعلیم و تدریس کا بلا شرکت غیرے مدعی و معلن رہا ہے" دگو طعن و طنز ان الفاظ سے بھی صاف ٹپکتا ہے) لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی اظہار فرماتے ہو کہ تمہاری اور "زمیندار" کی بیجا طور پر توقع کے خلاف میں "اچھے اخلاق" سے بھی معرا ثابت ہوا۔ تم میری ایک انتہائی ضبط و تحمل کی حالت میں لکھی ہوئی تحریر کو میرے "انتہائی اضطراب و بے تابی" کا ثبوت بتلاتے ہو اور باوجود میری انتہائی کوشش کے کہ "زمیندار" خواہ میرے متعلق کچھ بھی اور کتنی ہی بار کیوں نہ لکھے میں اس سے نہ الجھوں۔ تم تحریر فرماتے ہو کہ زمیندار کے ساتھ الجھنے کی یہ دوسری کوشش ہے اور میرے "اضطراب و کشمکش" پر بعض طعن کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہو کہ "کاش میں اسلامی مسائل کو اس مبارز طلبی کی اوٹ نہ بناتا اور قوم و اسلام کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنا اور "زمیندار" کا فیصلہ کر لیتا۔ اسی صورت میں اگر ہندوستان کے غریب اور مختلف النوع کشاکشوں کے باعث پریشان مضطرب الحال اور ژولیدہ بخت مسلمان کوئی معتدبہ فائدہ نہ اٹھا سکتے تو کم از کم نقصان سے محفوظ رہتے۔

برادرم کیا اس کے بعد بھی تم اس کا دعویٰ کر سکتے ہو کہ بقول تمہارے دنیا کی طرح تم نے بھی کبھی دل سے مجھے رئیس الاحرار کے لقب سے مانا اور "سالہا سال" میں کبھی ایک بار بھی میری ذات پر دل سے "فخر و مباہات" کا اظہار کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ تم مجھے "ہیچ میرز" اور "ناچیز" سمجھتے ہو نہ کہ اپنے آپ کو اور "گنامی" کا مستحق اپنے آپ کو نہیں سمجھتے بلکہ مجھ کو۔ عزیزم، میں اعتراف کر چکا ہوں کہ میں متکبر المزاج نہیں ہوں لیکن یقین کرو کہ میں بہت سے متکبر المزاج لوگوں سے مل چکا ہوں اور جب کسی متکبر المزاج سے ملتا ہوں تو اسے پہچان لیتا ہوں۔ میں مجبور ہوں کہ تم پر ظاہر کر دوں کہ گو میں نے تم سے

پہلی بار ملاقات کرنے پر تمھیں منکسر المزاج سمجھا ہو مگر تمھاری اتنی طول طویل کھلی چھٹی میں ایک حرف بھی ایسا نہیں جس سے تمھارے حقیقی انکسار کا پتہ لگتا ہو۔ اس لئے مجبوراً اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شاید میں نے تمھیں منکسر المزاج سمجھنے میں غلطی کی تھی یا شاید اب تم منکسر المزاج نہیں رہے اور اگر اپنے کو مہبط وحی اور منزل الہام ابھی تک نہیں سمجھتے ہو تب بھی اس کے تو دعوے دار ہو کہ بقول تمھارے مجھ جیسا "عظیم الشان قائد" اور "جلیل المنزلت رہنما" بھی ہندوستان کے غریب اور مختلف النوع کشاکشوں کے باعث پریشان دماغ، مضطرب الحال اور "ژولیدہ بخت" مسلمانوں کو کوئی معتدبہ فائدہ نہیں پہنچا رہا ہے اور کاش "اہم اسلامی مسائل" کو اپنی مبارزطلبی کی اوٹ نہ بناتا اور قوم اور اسلام کو ان کے حال پر (یعنی خالصۃً تمھارے لئے) چھوڑ دیتا تاکہ "کوئی معتدبہ فائدہ" نہ پہنچ سکتا تو نہ پہنچتا یہ غریب کم از کم نقصان سے تو محفوظ رہتے۔

یہ ہے حقیقت تمھارے انکسار کی۔ اب اپنے ساتھیوں کے انکسار کی حقیقت بھی سن لو۔ افکار و حوادث کے کالم کا ....

جو فرنگی محل کو بجائے "دار العلم والعمل" کے "دار الزنا والحمل" لکھتا ہے شاید تمھاری ہی اصلاح میں منکسر المزاجی ہو، مگر اور لوگ تو اس انکسار کے قائل نہیں ہو سکتے۔ ان لوگوں کی ..... کا اظہار حال ہی میں جس انداز سے کیا گیا ہے اس کا جواب اگر کوئی دے سکتا ہے تو شاید "پیشوا" کا ایڈیٹر ہی دے سکتا ہے۔

پھر اس اعلان ملوکیت ابن سعود ہی کے سلسلے میں جو طرز تحریر مقالاتِ افتتاحیہ میں روا رکھا گیا ہے اسی کو دیکھ لو۔ ۲۶ر جنوری کے مضمون میں جس کی اسی سرخی ہی سے انکسار مترشح ہوتا ہے کہ "مجلس مرکزیہ خلافت ہوش و خرد سے کام لے" مجھے نہایت انکسار کے ساتھ "رجعت پسند"، "مختل یقین"، اور "غیر مآل اندیش" بتایا گیا ہے اور پھر

کس انکسار کے ساتھ ارشاد ہے کہ یہ کیا مصیبت ہے کہ جن لوگوں کا فرض قوم کو صحیح راستہ دکھانا تھا وہی اسے ضلالت کی طرف لے جانے کی نادانستہ کوشش کر رہے ہیں۔ آخر ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ غلامانہ ذہنیت کب تک جاری رہے گی؟ یہ سارا انکسار صرف میری اس "غلامانہ ذہنیت" پر صرف کیا گیا ہے کہ میں ملوکیت کی غلامی میں مرکز اسلام کو مبتلا کرانے کا روادار نہیں لیکن مجھے شکایت کا کب حوصلہ ہو سکتا ہے جب مرکزی خلافت کمیٹی تک کو نہایت انکسار کے ساتھ اس مضمون میں اس طرح یاد فرمایا گیا ہے " ہمارے نزدیک ہمدرد کا یہ غیر مآل اندیشانہ اور قابل اعتراض رویہ (یعنی اعلان ملوکیت کی خبر وحشت اثر کو سیاہ جدول میں شائع کرنا اور بقول زمیندار ہمدرد کا اس طرح رونے پیٹنے لگنا) مجلس مرکزیہ خلافت کی اس حکمت عملی کا نتیجہ ہے جس کے خلاف بارہا آواز بلند کر چکے ہیں۔ سب سے پہلے بزرگان خلافت نے تطہیر حجاز کی اس مقدس کوشش کو فساد نجد و حجاز سے تعبیر کیا اور دونوں فریقوں سے ہمدردی ظاہر کر کے "وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما" کا وعظ کہنا شروع کر دیا کیونکہ شریف حسین اور ان کے لڑکوں کو ساری دنیائے اسلام غاصب اغدار اور دشمن ملت قرار دے چکی تھی۔ اس کے بعد چونکہ "زمیندار" کی صدائے حق سے ملک میں صحیح الخیال مسلمانوں کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا ہو گیا تھا اور امیر علی نے وفد خلافت کو مکہ معظمہ جانے سے روک کر "طائفتان من المومنین" کی حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا تھا اس لیے خداوندان خلافت اور ان کے اخباروں کا لہجہ بھی کسی قدر رو بہ اصلاح ہونے لگا۔ چنانچہ خلافت اور ہمدرد پے در پے سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور خادم الحرمین کے گریبوں کے خلاف مضامین لکھنے لگے۔ لیکن مجلس مرکزیہ خلافت نے اپنی حکمت عملی یہ

قرار دی کہ ہم حجاز میں امرا و سلاطین کا تسلط نہیں دیکھنا چاہیے ہم نہ ابن سعود کے حامی ہیں نہ شریف حسین کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ہماری تو خواہش یہ ہے کہ حجاز میں جمہوریت قائم ہو جائے اور حجاز حجازیوں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ ہم نے بارہا ان بہ ظاہر شاندار لیکن فی الحقیقت مہمل فقروں کی قلعی کھول کر مسلمانوں کو صحیح راہ عمل بتلانے کی کوشش کی ہے اور آج پھر مختصراً اپنے نقطۂ خیال کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

ایک اور جگہ اسی انکسار کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے کہ "مجلس خلافت کے کارپرداز زبان سے جمہوریت جمہوریت تو پکار رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کا کوئی عملی خاکہ کسی کے ذہن و تصور میں نہیں ہے" اور سب سے آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ "آخر میں پھر ایک دفعہ مجلس مرکزیہ خلافت میں گذارش ہے کہ وہ حقیقی صورت حالات کو مدنظر رکھ کر ایسا رویہ اختیار کرے جس میں بعد کو ندامت نہ اٹھانی پڑے اور مجلس کا اقتدار برباد ہونے کے بجائے روزافزوں ہوتا چلا جائے۔ مجلس کے موجودہ رویے سے مسلمانوں کا کوئی طبقہ بھی مطمئن نہیں۔ 'خدام الحرمین' والے تو خلافت کے نام سے کوسوں دور بھاگتے ہی ہیں۔ حامیان ابن سعود بھی اس گومگو کی حکمت عملی کو پسند نہیں کرتے۔ مجلس خلافت کو چاہیے کہ ابن سعود کی دین داری اور نیک نیتی پر تکیہ کرے اور انھیں حکم دینے کی کوشش نہ کرے۔ یہ عہدہ صرف موتمر عالم اسلامی کا ہے۔ ایاز قدر خود بشناس!" یہاں تک تو ۱۶ر جنوری کے لیڈنگ آرٹیکل سے زمیندار کے اڈیٹوریل اسٹاف کے انکسار کی مثالیں اخذ کی گئیں۔ اب ۲۹ر جنوری کا لیڈنگ آرٹیکل ملاحظہ ہو جس میں تمہیدی انکسار کے بعد کہ "ہمارے دلائل کا جواب کسی سے بھی بن نہیں پڑا۔ زمیندار اور مولانا ظفر علی خاں کی

ذات پر معاندانہ حملے تو بہت کیے گئے، لیکن اس امر کی کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی کہ سلطان ابن سعود کا شاہ حجاز منتخب کیا جانا قابل اعتراض اور تشویش انگیز کیوں ہے ؟

مجلس خلافت اور جمعیۃ العلماء دونوں کے اظہار تعجب پر "زمیندار" اس طرح اپنے تعجب کا اظہار فرماتا ہے " یہ نہ کوئی تعجب کا مقام تھا نہ استفسار وجوہ کی کوئی ضرورت۔ رہا یہ امر کہ سلطان نے نمایندگان حجاز کی اس تجویز (تجویز ملوکیت) کو قبول کیوں کیا؟ یہ سوال وہی شخص کر سکتا ہے جس نے عقل و خرد کا دامن ہاتھ سے چھوڑ رکھا ہو اور جسے سیاست ملکی کے مبادی بھی معلوم نہ ہوں" موتمر اسلامی سے اس مضمون میں زمیندار نے نہایت صفائی سے دامن چھڑایا ہے۔ پہلے تو اقبال کیا ہے کہ "سلطان ابن سعود نے موتمر کی جو دعوت پچھلے دنوں شائع کی تھی اس میں صرف تشکیل حکومت حجاز کے مسئلے کا ذکر کیا تھا" اور سلطان کے الفاظ کو اس پیرایے میں دہرایا ہے کہ "مسلمانان عالم حکومت حجاز کی تشکیل میں مجھے ضرور امداد دیں" لیکن چند سطروں کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ " رہا حجاز کے اندرونی انتظامات کا معاملہ تو اس دفعہ ساری دنیا کے مسلمان حج کے موقع پر جمع ہوں گے اگر انھیں حسن انتظام میں کوئی نقص نظر آئے تو سلطان کو اس سے آگاہ کر دیں۔ اس جزوی معاملے کے لیے موتمر کی کیا ضرورت ہے ؟" اس کے بعد وہی بڑھیا کے سوت کا قصہ ہے اور اس بار موتمر اسلامی کے اسال انعقاد کے خیال کو گڑیوں کے کھیل سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کو "جٹ منگنی پٹ بیاہ" کا مصداق ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے بعد مسلمانان ہندوستان کی دو سب سے بڑی جماعتوں کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ " انھیں یاد رہے کہ اس قسم کے عظیم الشان کاموں میں

تعجیل بہت مضر ہوا کرتی ہے۔ انھیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشموں پر اظہار تعجب نہ کریں بلکہ اس کی بارگاہ میں شکر بجا لائیں کہ وہ اپنی رحمت کاملہ سے کام لے کر مرکز اسلام کو غدر و بغاوت اور شرک و بدعت کی تمام آلائش سے پاک کر رہا ہے" اس کے متعلق اتنا ہی عرض کرتا ہے کہ زمیندار نے غلطی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا سب سے بڑا کرشمہ ابن سعود کی ملوکیت حجاز نہیں بلکہ زمیندار کی قیادت و رہنمائی اہل اسلام ہے۔ یہی تکمیل رحمت ہے اور یہی اتمام نعمت۔

برادرم میں تم سے پوچھتا ہوں کہ یہی انکسار کی وہ مثالیں ہیں جن کی بنا پر تم چاہتے ہو کہ میں یقین کر لوں کہ تمھاری اور زمیندار کے سارے اڈیٹوریل اسٹاف کی حقیقت یہی ہے کہ تم سب "ناچیز اور گمنام افراد ملت" ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے سوا ساری دنیا کو ناچیز سمجھتے ہو اور اپنے سوا ساری دنیا کو گمنام رکھنا چاہتے ہو۔ اگر یہ نہ کر سکو تو کم از کم ساری دنیا کو بدنام کرنا چاہتے ہو۔ تمھارے اور بیانات کی کسوٹی بھی تمھارا جھوٹا انکسار ہے۔ میں تمھیں یا زمیندار کو مخاطب کرنے میں بقول تمھارے یہ نہیں سمجھتا کہ میری "قیادت کو کسی حد تک کسر شان گوارا کرنا پڑے گی" نہ مجھے حضرت مولانا ظفر الملت والدین ظفر علی خاں کو درمیان میں لانے کا اضطراب ہے تاکہ ایسے بلند پایہ اور نامور عالم، ادیب، صحیفہ نگار، قائد اعظم کو وہ استقامت، ایثار کے مجسمے اور قربانی کے پتلے سے خواہ مخواہ الجھ کر ذاتی شہرت حاصل کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تمھیں اور "زمیندار" کے مالک کو ایک ہی سمجھتا ہوں۔ تثلیث پرستوں نے تو الوہیت کا اس طرح تجزیہ کر دیا کہ نعوذ باللہ من ذالک ایک کو باپ کہا، دوسرے کو بیٹا، اور تیسرے کو روح القدس۔ میرا عمل اس کے خلاف ہے۔ میں آپ

تینوں کو ایک سمجھتا ہوں اور چاہے مولانا ظفر علی خاں صاحب کی غیر حاضری میں "زمیندار" بار بار ملوکیت ابن سعود کو ہم سے منوانے کی کوشش کرے تاہم اپنے مکاتیب میں ان کی ترتیب کے متعلق تمھیں اصرار ہے کہ حجاز ہی میں ہو گئی تھی اور یہاں کے حالات سے تم اس وقت قطعاً متاثر نہیں ہوئے تھے، "محض انعقاد بیعت کی ضروری تفصیلات" کے نام سے غیر ضروری تاویلات شائع کرو اور اس پر دعویٰ کرو کہ "میرا کام صرف حالات کا بیان کرنا ہے اس لئے میں اپنے حقیقی وظیفے سے تجاوز جائز نہیں سمجھتا" اور اس کے پردے میں سب کچھ کہہ ڈالو دگر عجیب تر ہے کہ اس ایک فقرے پر آپے سے باہر ہو جاؤ کہ اہل حجاز کا بیشتر حصہ مسلک خلافت سے متفق ہے، لیکن میں ان سب کو اسی ایک علت العلل کے ساتھ وابستہ کرتا ہوں جس کے متعلق تمھارا یہ کہنا مضحکہ انگیز ہے کہ "بلاشبہ مولانا ظفر علی خاں زمیندار کے مالک ہیں تاہم انھیں اخبار کی تحریری پالیسی سے عملاً کوئی تعلق نہیں وہ اخبار میں جب کوئی مضمون لکھتے ہیں اپنے نام سے لکھتے ہیں۔" (ایک جملۂ معترضہ کو صاف کرنا مگر کیا ایسا نہیں ہوتا کہ تمھارے لکھے ہوئے مضامین مثلاً بمبئی پر "زمیندار" کے نئے محمود غزنوی کے سترہ حملے بعض وقت حضرت مولانا ظفر الملت والدین کے نام نامی سے "زمیندار" میں شائع ہو جاتے ہیں)، مولانا ظفر علی خاں کو راجہ کا لقب رکھتے ہیں مگر عرف عام میں کوئی راجہ یا نواب کسی کارنامے میں اپنا روپیہ لگاتے ہیں۔ میری اور تمھاری طرح سے ان کا بھی پیشہ صحیفہ نگاری ہے۔ وہ بلاشبہ "زمیندار" کی پالیسی کے ذمہ دار ہیں گو شاید قانوناً ایسا نہ ہو اور خدانخواستہ اگر حکومت کی نظر پھر "زمیندار" سے پھر جائے اور پکڑ دھکڑ ہو تو ان کی بجائے اب کوئی اور جیل بھیجا جائے۔ وہ مصری جرائد اور مولانا ابوالکلام آزاد کی اصطلاح میں آج بھی "زمیندار"

کے مدیر مسئول ہیں اور یقین ہے کہ اس کے بارے میں قیامت میں مہر وسالک سے کچھ زیادہ ہی ان کو مسئول ٹھہرایا جائے۔

حقیقت صرف اتنی ہے کہ جو کچھ شائع ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس میں سلطان ابن سعود کی اور حجاز کے امن و امان کی عام تعریف کے سوا سب کچھ دوسروں کے نام سے شائع ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور اس طرح اس بے جا پروپیگنڈے کے الزام سے وہ بچ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ وفد خلافت کے رکن ہونے کی حیثیت سے میں تو بالکل خاموش رہا اور شعیب و عرفان صاحبان کی طرح میرے منہ پر کی بھی مہر سکوت نہیں ٹوٹی' ہاں وہ بہ حیثیت زمیندار کے نامہ نگار کے آزاد تھے۔ میں اس چال سے ناواقف نہیں لیکن اس کے متعلق میرا اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ تم بھی زمیندار کے نامہ نگار کی حیثیت سے وفد خلافت کی معیت میں نہیں گئے تھے بلکہ ایک رکن وفد خلافت کے معتمد اور سکریٹری کی حیثیت سے گئے تھے۔ اس لئے جہاں جہاں وفد خلافت کو بار ملا وہاں تم بھی بار ملا' اور جو راز ظفر علی خاں کے لئے راز کی حیثیت رکھتا ہے وہ ان سے زیادہ تمہارے لئے راز کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ سکریٹری رازداری کا ترجمہ ہے لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ اس پروپیگنڈے کی نیت ساحل ہندوستان سے وفد کی روانگی سے پہلے ہی کر لی گئی تھی اس لئے یہی مناسب ہے کہ تم ارض پاک حجاز میں ملوکیت کی بدعت سئیہ کو ہندوستان میں جامۂ قبولیت پہناتے رہو اور شعیب و عرفان صاحبان اور بہ ظاہر مولانا ظفر علی خاں بھی اس وقت تک خاموش رہیں جب تک کہ خلافت کمیٹی کے صدر ہندوستان واپس آ کر مجلس مرکزیہ کا انعقاد کر کے ارکان وفد کی رپورٹ ان سے نہ حاصل کر لیں۔ یہ سچ ہے کہ نیتوں کا حال خدا جانتا ہے لیکن انسانوں کا تمام کاروبار اسی طرح

چلتا ہے کہ لوگوں کے افعال سے ان کی نیتوں کا پتہ چلایا جائے ورنہ ہم ناگریزی حکومت کے متعلق کچھ کہہ سکتے تھے اور نہ خدام الحرمین کی نیت کے متعلق۔ حالانکہ زمیندار کے کالم روز نیتوں کے پرکھنے سے سیاہ کئے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر تمہارے پروپیگنڈے کے متعلق میں بھی رائے دہی اس سے کام لوں تو اس پر اظہار تعجب کی ضرورت نہیں۔

برادرم آج تمہارے جھوٹے انکسار کا پردہ فاش کر دیا گیا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اور حقیقتیں بھی آشکارا کی جائیں گی لیکن کیا اچھا ہو ایک پردہ تم خود ہی اٹھا دو اور وہ یہ کہ کتمان حق اور تلبیس حق بالباطل کو چھوڑ کر ایک سچے مسلمان کی طرح جو ابھی طواف کعبہ اور زیارت رسولؐ کا شرف حاصل کر کے آیا ہے میرے خط اور تار کا جواب جو زمیندار کو بھیجا گیا تھا مجھے دے دو اور بتا دو کہ اعلان ملوکیت سے قبل زمیندار کے کس کس پرچے میں خلافت کمیٹی کے مسلک جمہوریت کے خلاف دلائل و براہین کا انبار لگایا گیا تھا اور بقول زمیندار کے اس نے بارہا ان بظاہر شاندار لیکن فی الحقیقت مہمل فقروں کی قلعی کھول کر مسلمانوں کو صحیح راہ عمل بتانے کی کوشش کی تھی۔ میں اور بھی ممنون ہوں گا اگر یہ بتا دو کہ موتمر اسلامی بقول "زمیندار" کے کوئی بڑھیا کا سوت نہیں کہ کاتا اور لے دوڑی۔ تو پھر تم نے اور "زمیندار" نے ظفر علی خاں صاحب کو اس زحمت کشی سے کیوں نہ روکا کہ وہ اسی بڑھیا کے سوت کو کات کر بہ تعجیل تمام سوئے حجاز لے دوڑیں۔ میں ان افراد میں سے ہوں جنھوں نے وفد خلافت کو اسی غرض سے اس بار حجاز بھیجنے کی تجویز خلافت کی ورکنگ کمیٹی سے منظور کرائی تھی کہ ، ، جیسے وہاں رہ کر سلطان ابن سعود کو اپنے صلاح و مشورے سے اور نیز دیگر طریقوں سے

بھی مدد دے کر موسم حج میں موتمر اسلامی کا انعقاد کرائے۔ میں نہیں سمجھتا اگر زمیندار کی رائے میں اس کام میں دو سال لگنا ضروری ہیں تو پھر مولانا ظفر علی خاں صاحب وفد کے ساتھ حجاز کیوں تشریف لے گئے تھے۔ مسلک خلافت جمہوریت اور مؤتمر اسلامی دونوں کے لئے مشہور ہے اور ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء سے بغیر تبدیل و تحویل کے اسی طرح چلا آتا ہے۔ اس وقت ظفر علی خاں صاحب رہا نہ ہونے پائے تھے مگر تم اور زمیندار رہا تھے۔

پھر اُس وقت اس مسلک کی مخالفت کیوں نہیں کی گئی؟ کیا اس سوال کا کوئی جواب تمہارے پاس ہے؟ بلگام خلافت کانفرنس میں مولانا ظفر علی خاں خود بہ نفس نفیس شریک تھے اور ان کی موجودگی بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے خود ان کی تائید سے وہ رزولیوشن پاس کیا گیا تھا جس میں مرکزی خلافت کمیٹی اور خلافت کانفرنس دونوں نے ورکنگ کمیٹی کی تجویز پر مہر تصدیق ثبت کی تھی۔ اسوقت نہ انھوں نے نہ تم نے نہ "زمیندار" نے اس مسلک سے اختلاف کیا۔ پھر آج جبکہ سلطان ابن سعود اپنے متعدد وعدوں کو توڑ کر اپنی ملوکیت کا اعلان کرتے ہیں یکایک تمہارا اور زمیندار کا اور شاید مولانا ظفر علی خاں صاحب کا بھی خلافت کے مسلک سے یہ اختلاف کس بنا پر ہے؟ کیا اس کا کوئی جواب تمہارے پاس ہے؟ اگر ہے تو پھر کیوں خاموش ہو؟ ضرور تمھیں بات کرآتی ہے مگر وہ کچھ ایسی ہی بات کیا ہے کہ نہ میرے خط کا جواب دیتے ہو نہ تار کا۔ زمیندار یہ تو بار بار پوچھتا ہے کہ نہ معلوم مخالفین زمیندار کو جھوٹ بولنے میں کیا مزا آتا ہے مگر خود نہیں بتاتا کہ اسے جھوٹ بولنے میں کیا مزا آیا کہ اس نے مسلک خلافت کی بار ہا قلعی کھولی جبکہ بہ ظاہر جمہوریت کے خلاف اس نے ایک بار بھی اس وقت تک کچھ نہیں کہا جب تک کہ سلطان ابن سعود یکایک ملک الحجاز

نہ بن بیٹھے۔

مجھے معاف کرنا میں زمیندار کے اڈیٹوریل اسٹاف کی طبیعت نہیں رکھتا لیکن میرے ملک کی ایک سیدھی سادی مثل ہے جسے تم شاید "اچھے اخلاق" کے خلاف سمجھو مگر اس سے زیادہ بین اور واضح کوئی چیز مجھے اس وقت یاد نہیں آتی اور پنجاب چونکہ تصنعات و تکلفات سے آزاد ہے اس لئے اس ٹھیٹ اردو کی مثل شاید وہاں کچھ قدر کی جائے وہ یہ ہے کہ "کمہار کا کتا جس کے چوتڑ پر مٹی لگی دیکھتا ہے اسی کے پیچھے ہو لیتا ہے۔" برادرم میں خود ایک سگ دنیا ہوں دوسروں کو کیا کہوں لیکن کم سے کم کمہار کا کتا نہیں ہوں کہ جس کو برسر اقتدار دیکھا اسی کی سی کہنے لگا۔ باوجود مصطفےٰ کمال پاشا کی ہمت، قابلیت اور وطن پوری کی پوری داد دینے کے میں نے آج تک ان کے الغائے خلافت کے فیصلے کو زمیندار کے ایک مضمون نگار کی طرح اس نیت سے سراہنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ جمہوریت ترکیہ کے صدر ہیں اور ایک بڑی طاقت رکھتے ہیں اور ان کے ہر عیب کو ہنر کہنا ہی تقاضائے مصلحت ہے۔ ہاں میں ان کی جمہوریت پسندی کا قائل ہوں اسی طرح مجھ سے یہ تو ہرگز نہ ہوگا کہ سلطان ابن سعود کے اعلان ملوکیت کو ان کی طاقت و جبروت سے ڈر کر سراہنے لگوں اور وہ بھی یہ کہہ کر کہ یہ تمسک بالکتاب والسنت ہے گو دل یہی کہتا ہو ع

ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند

اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ تمسک بالکتاب والسنت نہیں ہے بلکہ صریح بدعت یزیدیہ ہے اور یزید کے نام کا بھی سکہ اسی طرح رائج ہوا تھا کہ میدان کربلا میں سبط رسول ؐ کے حلقوم پر شمشیر چلائی گئی تھی۔ اچھا اب کل پرسوں تک رخصت، یار زندہ صحبت باقی۔

(۲) موتمر حجاز اور خلافت

ہمدرد ۱۵ مئی ۱۹۲۶ء

مولانا محمد علی صاحب نے بمبئی کرانیکل کے نمائندے کو حسب ذیل بیان دیا ہے :-

سلطان ابن سعود کو ملوکیت حجاز سے زیادہ ان انعام و اکرام کی خواہش کرنی چاہیے جو دین و دنیا دونوں میں ملنے والے ہوں اور ہمیں یقین ہے کہ جب ایک مرتبہ ہندی عازمانِ دار الامان سے مل لیں گے تو تسلیم کر لیں گے کہ ہم لوگ ارض مقدس میں صرف قرآن و حدیث کی حکومت قائم کرنے میں ان کے زبردست معاون و حامی ہیں۔ اسلام صرف اوامر و نواہی کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں سیاسیاتِ عالم شامل ہیں۔ اس کا مقصد ساری دنیا میں اسوۂ حسنہ جاری کرنا ہے لیکن جبر و قوت سے نہیں بلکہ ترغیب، معقول دلائل اور محبت و پیار سے ۔ اس نظام عالم کا شخصی مرکز خلیفہ یعنی جانشینِ رسول اکرمؐ ہوتا ہے اور ارضِ مرکز جزیرۃ العرب ہے بالخصوص حجاز جس میں مکہ و مدینہ کے حرمین شریفین واقع ہیں۔ حضرت رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد ۳۰ برس خلافت راشدہ کا سلسلہ اسی اصول پر جاری رہا۔ ان خلفاء نے جمہور اسلام کی رہنمائی کی۔ جمہور اسلام میں مذہب اور حکومت دو جداگانہ شعبے نہیں تھے ۔ جمہوریت کا بادشاہ سوائے خدا کے اور کوئی نہ تھا۔ تمام لوگ آپس میں مساوی درجہ رکھتے تھے اور خلیفہ ان مساوی لوگوں میں صرف ایک "اولین" کا درجہ رکھتا۔ اس طرح اسلامی سلطنت میں جہاں تک خدا کا تعلق تھا خدائی حکومت

تھی یعنی خدا ہی ان کا بادشاہ تھا، خدا ہی ان کا نگران و محافظ تھا اور سلطنت اسلامیہ اصل میں خدائی سلطنت تھی۔

اسلام میں مسولینی کی کوئی جگہ نہیں ہے

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا اسلامی حکومت جمہوری حکومت تھی دوسری جمہوری حکومتوں اور اسلامی جمہوریت میں اتنا فرق تھا کہ بعض بنیادی قوانین ایسے تھے جسے کوئی مجلس قانون ساز نہ ترمیم کر سکتی تھی نہ تنسیخ۔ اس سے اس قسم کے تغیرات کا انسداد ہو جاتا تھا جو جمہوری حکومت کو عوام کی حکومت کی شکل میں منتقل کر دیتے اور پھر رفتہ رفتہ ایک غیر ذمہ دار خود مختاری کی صورت اختیار کر لیتی۔ اسلامی جمہوریت میں حکومت عمومی کو ذرا دخل نہیں نہ اس میں مسولینی کے لئے کوئی جگہ ہے۔ خدا ہی اس کا خود مختار فرماں روا ہے اور اس کی تمام مخلوق ایک دوسرے کے ساتھ درجہ مساوات رکھتی ہیں اور اس حق سے انھیں نہ تو کوئی بادشاہ محروم کر سکتا ہے نہ کوئی مختار کل حاکم۔ ہاں وہ خدا کے سامنے ایسے غلام ہیں جن کا کسی چیز پر کوئی حق نہیں۔ پس اسلام میں جو آزادی ہے وہ یونان کو بھی نصیب نہیں اور اسلام میں قانون کا جس درجہ احترام ہے وہ روما کو بھی حاصل نہیں۔

مگر افسوس ہے کہ سلطنت کا یہ تخیل صرف ایک نسل یعنی ۳۰ برس تک (آنحضرتؐ کے بعد) باقی رہا اور صد حیف کہ ۳۰ برس کا زمانہ بھی تنازعات سے مبرا نہیں رہا۔ حضرت عثمان خلیفہ سوم کے خلاف جو بغاوت ہوئی وہ آپ کی جان ہی لے کر فرو ہوئی اور وہ بھی اس طرح کہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے اور کتاب مقدس پر بھی خون کے قطرے گرے۔ اس کے بعد جنگ جمل ہوئی جس میں

حضرت عائشہؓ حرم رسول اکرمؐ یعنی بنت حضرت ابوبکرؓ کی فوجیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفۂ چہارمؓ داماد رسول اللہؐ کے مقابلے میں صف آرا ہوئیں جس میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان قتل ہوئے اور ہزاروں صحابی سپرد خاک ہوئے۔ اسی طرح جنگ صفین ہوئی اور حضرت معاویہؓ کی فوجیں خلیفۂ چہارم کے مقابلے میں آگئیں۔ اس کے بعد آپ شہید کئے گئے اور حضرت معاویہؓ کسی طرح بچ نکلے۔ ایسے ہی فاتح اور گورنر مصر کی بغاوت۔ ان سب سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تیس برس کے دور اول میں بھی سارے مسلمان مخلص اور سچے نہ تھے بلکہ سنی عقیدے کے مطابق تو خلفاء بھی مثل حضرت رسول مقبولؐ یا شیعہ عقائد کے مطابق ائمہ کی طرح معصوم نہ تھے۔ خلیفۂ سوم کی رائے کی غلطیاں جن پر ان کے خاندان والے ضرورت سے زیادہ حاوی ہوگئے تھے اور خلیفہ سوم کا ان کی رائے اور مشورے کو اس طرح مانتے رہنا کہ تمام مناصب اور عہدوں پر انھی کا قبضہ ہوگیا، پھر خلیفہ چہارم کی سخت گیری اور بعض اوقات اپنی رائے پر اڑے رہنے کے اصول نے ان دو آخر خلفاء کو اتنا کامیاب نہ ہونے دیا جتنے اول دو گذرے ہیں۔ آخری دو خلفاء بھی اول دو خلفاء کی طرح پاک طینت، نیک دل اور متدین تھے۔ ان کو بھی اسلام سے اسی قدر محبت تھی جس قدر ان دونوں کو۔ وہ جو کچھ کرتے تھے نیک نیتی اور اسلام کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھ کر کرتے تھے، ذاتی یا خاندانی مفاد کی خاطر سازشوں یا جماعت بندیوں میں نہیں پڑے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان چاروں خلفاء کا زمانہ باوجود باہمی جنگ و قتال کے بھی "راشدہ" کہا جاتا ہے۔ لیکن خلیفۂ سوم کے خاندان والوں نے بہت کچھ قوت حاصل کر لی تھی اور خلیفہ چہارم کے انتقال کے بعد مرکز حکومت پر قابض ہوگئے اور اپنی قوت سے یہ کام لیا کہ اپنے بعد اپنے بیٹے کو اپنا جانشین نامزد کر دیا جس کے بعد اسلام کا تنزل مذہبی اور سلطنتی دونوں

حیثیتوں سے شروع ہو گیا۔

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین اس طرح نامزد کرنے میں بڑی دقتیں نظر آئیں جس طرح آپ کو خلیفۂ اول نے نامزد کیا تھا تو آپ نے بستر مرگ پر فیصلہ سنا دیا کہ میں ایک کمیٹی بناتا ہوں جو اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرے گی۔ اس کمیٹی میں آپ نے اپنے بیٹے کا نام بھی لیا لیکن شرط یہ لگا دی کہ اس کو خلیفہ نہ بنایا جائے۔ آپ نے اپنے خاندان کا کوئی دوری رشتہ دار بھی منصب خلافت کے لئے نامزد نہیں کیا بلکہ کہہ دیا کہ سارے خاندان میں کسی ایک کا اس بار عظیم کو سنبھال لینا اُس کل خاندان کے لئے کافی ہے بلکہ کافی سے زیادہ ہے۔ حقیقت میں یہی اسلام کی اصلی روح تھی۔ جب سے یہ روح نکل گئی خلافت بھی آنحضرت صلعم کی پیشین گوئی کے مطابق محض بادشاہت اور خاندانی وجاہت ہو کے رہ گئی۔

زمانۂ زوال

کربلائے معلی کا سانحۂ عظمیٰ جس سے مسلمانوں کا نیا سال شروع ہوتا ہے وہ روحانی نہیں بلکہ دنیاوی طاقت کے زوال کی تمہید ہے۔ ہم آج تک محرم کے دنوں میں حضرت امام حسینؓ اور آپ کے خاندان کی شہادت کا غم مناتے ہیں۔ یہ ماتم اس لئے نہیں ہوتا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نواسۂ رسول صلعم تھے یا حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادے تھے اور دریائے فرات کے کنارے رہ کر پانی کے لئے ترستے رہے اور تین دن کے بھوکے پیاسے شہید ہوئے اور یزید کے حاکم عراق کے حکم سے اس کے بزدل سپاہیوں نے آپ کی لاش کو خاک و خون میں غلطاں کر دیا بلکہ ہم اس لئے ماتم کرتے ہیں کہ حسین (رضی اللہ عنہ) وہ بزرگ تھے جنھوں نے خلافت راشدہ کے نمونے پر منصب خلافت قائم رکھنا چاہا تھا اور جن کے

مقدس دل میں اپنے خاندان سے زیادہ اسلام کی محبت تھی۔

سرگردانی

وہ بنی اسرائیل جنھوں نے حضرت موسیٰ کا کہنا مصری غلامی سے آزادی دلانے کے بعد بھی نہیں مانا تھا ۴۰ برس تک نئے کپتان اور نئے رہنما کی تلاش میں سرگرداں رہے اور ارض موعود میں پہنچے بھی تو اس وقت جب اس نسل کا خاتمہ ہوگیا جسے حضرت موسیٰ نے غلامی سے خلاصی دلائی تھی بلکہ خود حضرت موسیٰ بھی حیات نہ رہے تھے اسی طرح بدقسمت مسلمان بھی چالیس برس نہیں بلکہ چالیس نسلوں میں اور ۱۳ سو برس سے سرگردان و پریشان پھرتے ہیں۔

تبلیغ

یہ سچ ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ نے جزیرۃ العرب کو غیر مسلم حکومتوں کے زیرنگیں چھوڑا تھا لیکن اموی، عباسی، فاطمی، عثمانی خلفاء نے نصف دنیا فتح کرلی تھی۔ ہاں انھیں یہ یاد نہ رہا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نصف دنیا فتح کرنے کے لئے نہیں بھیجا ہے بلکہ ساری دنیا کو مسلمان بنانے کو بھیجا ہے۔ انھیں اس وقت تک چین نہ لینا تھا جب تک ساری دنیا کو دائرۂ اسلام میں لاتے۔ بانیان خاندان اور سلاطین اسلام نے پیغمبر اسلام کے کارناموں سے ہمت و جرأت ضرور حاصل کی تھی لیکن تیرہ سو برس کے بعد تو یہ بات بھی جاتی رہی۔ فقدان جوش عمل نے مسلمانوں کے زوال کو کمال تک پہنچا یا۔ اب جزیرۃ العرب کا جو حصہ غیر مسلم قبضہ و اقتدار میں ہے وہ اس حصہ سے زیادہ ہے جو آں حضرت صلعم کی وصیت کرتے وقت غیر مسلم قبضے میں تھا۔

خلافت کانفرنس کا مقصد

تلخ تجربات کے تسلسل نے مسلمانوں کو اتنا تو ضرور سکھا دیا کہ انھیں اپنے قدم روک کر غور و فکر کرنا چاہیے اور جمعیت خلافت ہند نے اعلان کر دیا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ۱۳ سو برس کے بعد جنگ کربلا کا فیصلہ مسترد کر دیا جائے اور خلافت راشدہ کا نقشہ از سر نو کھینچا جائے۔ امید تھی کہ جنگ گذشتہ کے تلخ تجربے اور محمد وحید الدین کی غداریوں سے سبق سیکھیں گے اور خلافت کو پھر زندہ کریں گے۔ اس امید کو اس وقت اور بھی تقویت پہنچی جب انھوں نے عبد المجید خاں کو سلطان نہیں بنایا صرف خلیفہ تصور کیا۔ لیکن ترکوں نے پھر ان کو بھی اپنی جائز طور پر حاصل کی ہوئی قوت سے معزول کر دیا۔ یہ خلیفہ مقرر کر سکتے تھے اور اسے معزول بھی کر سکتے تھے مگر افسوس انھوں نے ایک خلیفہ کو معزول تو کر دیا مگر اس کی جگہ کسی کو مقرر نہیں کیا۔ یہی نہیں انھوں نے سرے سے خلافت ہی کو مسترد کر دیا حالانکہ ایسا کرنے کا ان کو کوئی حق نہ تھا۔ خلافت ایک خدائی انسٹی ٹیوشن ہے اور کوئی شخص خواہ وہ کسی جمہوریت کا مختار کل ہی کیوں نہ ہو اسلامی قانون اور اس کی قائم کی ہوئی خلافت کو مسترد نہیں کر سکتا۔ قانونِ حنفیہ کے مطابق خلافت ہر زمانے میں قائم رکھی جائے۔ ترک اس کے لئے تیار نہیں کہ وہ اس بار عظیم کو سنبھال سکیں۔ اس حالت میں مسلمانانِ عالم ایک موتمر اسلامی منعقد کر کے منصب خلافت خلافت راشدہ کے نمونے پر قائم کریں گے۔ ترکوں کے انکار کے بعد مسلمانانِ عالم کے لیے اس کارروائی کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اس وقت کوئی شخصیت نظر نہیں آتی جو بلا اختلاف منصب خلافت کی مستحق سمجھی جائے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مسلمانانِ عالم میں تیرہ سو سالہ ذہنیت بدل کر

۳۰ سالہ زمانہ خلافت راشدہ کی ، نوعیت پیدا کرتی ہوگی ۔ آج یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ اس وقت تو مسلمانان عالم اپنی اندرونی نیز بین الاقوامی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

موتمر حجاز

مسئلہ خلافت کے تصفیے کے لئے اس وقت موتمر اسلامی کا انعقاد خاطرخواہ کامیابی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ موتمر مصر سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں رکھتی کہ مصری شہنشاہیت میں خلافت کا اضافہ کرکے چار چاند لگا دیئے جائیں اور برطانیہ عظمٰی کے ہاتھ اور بھی مضبوط کر دئیے جائیں کہ وہ اسلامی ممالک میں فتنہ برپا کرتی ہے۔ موتمر اسلامی کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ حکومت شریفی کا ظالمانہ استبداد تھا جس کا ارض حجاز پر دعویٔ ملوکیت اس بنا پر تھا کہ وہ عرب ہے اور حجازی ہے۔ اس حق کے مقابلے میں وہ مسلمانان عالم کی کوئی بات بھی سننا گوارا نہ کرتا تھا۔ سلطان ابن سعود کی فتوحات سے یہ دور استبداد تو ختم ہو گیا۔ ابن سعود نے ابتدا ہی سے اعلان کرنا شروع کر دیا تھا کہ ارض حجاز میں حکومت کے قیام وتشکیل میں مسلمانان عالم کا مشورہ لیں گے کیونکہ ارض مقدس پر تمام مسلمانان عالم کا حق ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ خود حجازیوں کو اپنے ملک کے انتظام وانصرام میں رائے دینے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ ابن سعود نے خلافت کمیٹی کا یہ اصول بھی تسلیم کرلیا تھا کہ ارض حجاز میں ایسی حکومت قائم کی جادے جو اسلامی حکومتوں کا نمونہ ہو۔ ہم ارض حجاز کو خاندانی حرص و آز یا ذاتی مفاد کی جنگ کا مرکز بنانا نہیں چاہتے۔ اب اس پر کسی بادشاہ یا سلطان کی حکومت نہیں رہ سکتی۔ اس میں حقیقی جمہوریت قائم کی جائے گی جو امریکہ اور فرانس جیسی نہ ہوگی جہاں زنگ اور سرمایہ داری کی پرستش ہوتی ہے بلکہ خلافت راشدہ کے نمونے پر جمہوریت ہوگی جس میں بلال حبشی

(غلام) کا درجہ وہی ہوگا جو ایک قریشی خاندان کے خلیفہ کا۔ جہاں کی فضا ایسی ہی ہوگی جو خلیفۂ دوم کے زمانے میں تھی کہ آپ نے فرمایا کہ ابوحذیفہ کا غلام سالم زندہ ہوتا تو میں اپنا جانشین اسی کو منتخب کرتا اور علیؓ اور عثمانؓ اور دیگر حضرات کی کمیٹی کے سپرد انتخاب خلیفہ کا کام نہ چھوڑتا۔ ابن سعود نے خود بھی کئی بار اعلان کیا ہے کہ وہ حجاز پر حکومت کرنا نہیں چاہتے مگر علی کے جدہ روانہ ہونے کے بعد مسلمانانِ ہند کو یہ حیرت انگیز خبر ملی کہ وہ شاہ حجاز منتخب ہوگئے اور شاہانہ منصب قبول کرلیا۔ چونکہ ابن سعود نے بار بار کہا تھا کہ حکومت حجاز کی تشکیل موتمر اسلامی کرے گی اور اسی بنا پر جمعیت مرکزیہ کا ایک وفد بھیجا تھا کہ موتمر اسلامی کے جملہ مبادیات طے ہوجائیں اور تمام اسلامی ممالک و خطے میں ایلچی بھیجے جائیں اور ان کو دعوتیں دی جائیں کہ اپنے اپنے نمائندے بھیجیں کہ جنوری کے واقعات نے ان سب امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس اعلان ملوکیت پر جمعیت خلافت اور جمعیت العلماء نے بذریعہ تار ملی موتمر پر گفتگو کی۔ نامہ و پیام کے بعد مسلمانان عالم کی موتمر کا انعقاد جس میں تشکیل حکومت حجاز طے ہوسکے نامنظور ہوا۔ البتہ ابن سعود نے ایک موتمر طلب کرلی جو اصلاح حجاز کے مسئلے پر غور کرے گی۔ امید نہیں ہے کہ اس موتمر میں تمام اسلامی حکومتوں اور اسلامی ممالک کے نمائندے شریک ہوسکیں گے کیونکہ وقت بہت کم ملا ہے۔ پھر بھی مکہ معظمہ میں مختلف بلاد اسلامیہ سے آئے ہوئے نمائندوں کا جمع ہونا اور ارض مقدس کی ترقی و اصلاح پر تبادلۂ خیالات کرنا گویا منزل مقصود کا پہلا زینہ طے کرلینا ہے۔ کئی صدیوں کے بعد امسال کا حج موتمر اسلامی کی شان کا ہوگا۔ مسلمانانِ ہند کے نمائندے ابن سعود سے بے ضابطہ طور پر حکومت حجاز کی تشکیل کے متعلق یقیناً گفتگو کریں گے اور امید ہے کہ اس موتمر کے بعد دوسری نمائندہ موتمر کے لئے راستہ صاف ہوجائے گا بلکہ شاید ابتدائی مراحل بھی طے

ہو جائیں۔ کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ ابن سعود کو اس کی فوجوں سمیت حجاز سے نکال دیا جائے گا یا محض کاغذ پر جمہوری حکومت حجاز میں قائم کردی جائے گی۔ جو کچھ ہمارا ارادہ ہے وہ یہ ہے کہ ابن سعود کو سمجھا بجھا کر راضی کریں کہ وہ ارض حجاز میں خلافت راشدہ کے نمونے کی حکومت قائم کریں جس کا خاکہ یہ ہوگا کہ اندرونی معاملات میں اہل حجاز کی رائے مانی جایا کرے اور اسلامی خارجی معاملات مثلاً زائرین و حجاج کی آرام و آسائش، غیر مسلم اثرات کا دفعیہ، قرآن و حدیث کی تعلیم کا اجرا ان نمائندوں کے ذریعے سے تکملہ کو پہنچایا جائے جو تمام حکومت و بلاد اسلامیہ سے منتخب کردہ ہوں۔ ایسی حکومت کو دنیائے اسلام کی مالی و فوجی امداد حاصل ہوگی۔ روپیہ تو ہر مسلمان دے سکتا ہے مگر ہمیں امید ہے کہ اسلامی ممالک حکومت حجاز کی اعانت آدمیوں سے بھی کریں گے۔

مکہ کا مستقبل

ہمیں اس دن کا انتظار ہے جب ہر ایک تعلیم یافتہ چاہے وہ انجینیر ہو یا ماہر زراعت، ڈاکٹر ہو یا ماہر حفظان صحت، چاہے وہ دنیا کے کسی خطے میں رہتا ہو حجاز کی ترقی میں اپنا حصہ بدرجۂ امکان ادا کرے گا اور مکہ و مدینہ کو متمدن شہروں کے مقابلے میں اسلامی تمدن کا نمونہ بنا دے گا جہاں زمانۂ حاضر کی مفید ایجادات کے ساتھ ہی ساتھ امن و تقدس، حرمت و عظمت بھی خالص اسلامی اور حرمین شریفین کے شایانِ شان ہو۔

ہنگامۂ افغانستان

(۱) شاہ امان اللہ خاں اور بچہ سقا

ہمدرد ۱۰ فروری ۱۹۲۹ء

ایک سال سے کچھ ہی زائد عرصہ ہوا کہ اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں کے سفر یورپ کے موقع پر میں نے بمبئی کے ایک روزانہ اخبار میں ان کے سفر پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ حیرت کا مقام ہے کہ ایک شہزادہ جو اپنے والد مرحوم کی اولاد میں سب سے بڑا نہ تھا ان کے قتل اور ان کے چھوٹے بھائی کی تخت نشینی کے بعد یکایک افغانستان پر حکمرانی حاصل کر لیتا ہے پھر برطانیہ جیسی زبردست دولت کا میدان جنگ میں مقابلہ کر کے اپنے ملک کو اس پنجۂ استعمار سے جس میں وہ مدتوں سے دبا ہوا تھا چھڑا لیتا اور آزاد کرا لیتا ہے اور جب حسب معمول اجانب کی سازشیں اور دسیسہ کاریاں زوروں اور منگل جیسے قبائل کو اس کے خلاف ابھارنے میں کامیاب ہو چکتی ہیں تو وہ پھر انھیں راہ راست پر لے آتا ہے اور اتنی سرعت کے ساتھ تمام ملک میں امن و امان پھیلا دیتا ہے کہ اپنی تخت نشینی کے نو برس کے اندر اندر ممالک یورپ کی سیاحت کی ہمت کر سکتا ہے اور خدا کا نام لے کر کھڑا ہوتا ہے آج وہی عزم و ہمت والا بادشاہ تخت و تاج سے دست برداری کا اعلان اور اپنے پایۂ تخت سے ہجرت کر چکنے کے بعد وہاں سے دور اپنے ملک کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا پھر ملک گیری کے منصوبے کر رہا ہے۔ افغانستان میں جو یہ ہنگامہ یکایک بپا ہو گیا یقیناً حیرت انگیز ہے۔ اگر یقیناً یہ ہنگامہ اس قدر حیرت انگیز نہیں جس قدر شاہ امان اللہ خاں کا آج سے دس برس پیشتر اپنے والد مرحوم کے قتل کے بعد اپنے چچا کو معزول و مقید

کرکے اور اپنے بڑے بھائی کو تخت و تاج سے محروم رکھ کر خود یکایک افغانستان کا حکمراں بن جانا، دولت برطانیہ کے مقابلے میں جنگ آزما ہو کر اپنے ملک کو اور اس کی حکومت کو صحیح معنوں میں اپنے دادا کے دیئے ہوئے لقب کے مطابق "خداداد" کرالینا اجانب کی دسیسہ کاریوں اور بعض قبائل کی سرکشی کے مقابلے میں کامیاب ہو کر سارے ملک میں امن و عافیت قائم کر دینا اور پھر اس کے قیام کی طرف سے بالکل مطمئن ہو کر سفر یورپ حیرت انگیز تھا۔

سال گذشتہ کے ماہ اپریل میں انگلستان سے رائٹر کا ایک عجیب تار آیا تھا جس سے شاہ امان اللہ خاں کے عزم سفر روس پر برطانوی بے زاری صاف ظاہر ہو رہی تھی اور اسی کے ساتھ سردار اعلیٰ محمود طرزی وزیر خارجہ افغانستان و والد ماجد ملکہ ثریا کی یورپ سے واپسی کے متعلق اس کا بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ شاید ان کی مراجعت کا باعث افغانستان میں کسی باغیانہ ہنگامے کا ڈر کرنا تھا۔ جس وقت یہ تار ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوا کون اخبار بیں شخص ایسا تھا جس کا ماتھا اسی وقت نہ ٹھنکا ہو اور جس نے اسی وقت یہ نہ کہا ہو کہ خدا خیر کرے، آثار و قرائن تو اسی کے پائے جاتے ہیں کہ اجانب و اغیار کی دسیسہ کاریاں اب کچھ رنگ لائے بغیر نہ رہیں گی۔ جب یہ ہنگامہ شنواریوں اور دیگر قبائل کی طرف سے برپا ہوا تو اسی وقت سب کے ذہن استعماری سازش کی طرف گئے اور حکومت ہند اس ملک کے اخبار نویسوں پر بیہ ظاہر اس لئے مقدمے چلا رہی ہے یا ان کو محبوس کر رہی ہے کہ برطانیہ کے جو تعلقات افغانستان کے ساتھ ہیں وہ خراب نہ ہو جائیں۔ لیکن اگر حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کو خدا نے ذرا سی بھی سمجھ دی ہوتی تو وہ بجائے علامات مرض کا مقابلہ کرنے کے اصل مرض کا مقابلہ کرتیں اور اس کا علاج سوچتیں کہ بقول داغ ؎

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

بالخصوص جب کبھی مشرقی ملک میں کوئی نیا فتنہ اٹھتا ہے تو خدا کی ساری مخلوق برطانیہ ہی کے مرقد منور کی طرف اشارہ کرتی نظر آتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان مقدمات کا کیا نتیجہ ہوگا مگر یہ تو یقینی ہے کہ ان مقدمات کے ملزموں کی سزایابی نہ ان سے زیادہ تعداد میں دوسرے اخبار نویسوں کی تنبیہہ لوگوں کے دلوں سے اس خیال کو دور کر دے گی کہ برطانوی استعمار کا ہاتھ بھی افغانستان کے ہنگامے میں کسی نہ کسی قدر ضرور ہے۔ اسی سلسلے میں گذشتہ جنگ عمومی میں حجاز میں فتنہ بپا کرنے والے کرنل لارنس اور حال کے کراچی کے ہوا باز "شا" وبقول بعض لاہور کے "پیر کرم شاہ" کا نام اس زور شور سے لیا گیا ہے کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس کو یقینی سمجھتا ہے کہ ہنگامۂ افغانستان بھی انھیں حضرت کی کارستانی ہے۔ جو تعلق ہندوستان کا افغانستان کے ساتھ سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس سے رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کسی کو ذرا سا بھی اس پر تعجب نہ ہوا ہوگا کہ آج کل ہندوستان کے ہر گوشے میں ہنگامۂ افغانستان ہی کا چرچا ہے اور ہر وقت اسی کا ذکر چھڑا رہتا ہے اور اخبار نویسوں پر کون اعتراض کر سکتا ہے۔ اگر آج اُن کے اخباروں کے کالم کے کالم افغانستان ہی کے متعلق خبروں اور افواہوں اور ہندوستان میں منعقد ہونے والے جلسوں کی رودادوں سے بھرے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اس معاملے میں تو ایک اخبار نویس ہی غالب کا سب سے زیادہ ہمنوا ہو سکتا ہے ؎

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے بعد جنگ عمومی نے کتنے ہی اخبار نویسوں کو مالا مال کر دیا تھا اور اس کے بعد تحریک ترک تعاون کی فصل بھی اچھی رہی مگر اس کے بعد سے تو کال ہی پڑ گیا۔ البتہ نہرو رپورٹ نے پھر کسی قدر ہنگامہ بپا کیا اور وہ کھیتیاں جن پر حجاز میں سلطان ابن سعود اور مدم آثار روتیوں نے اس طرح آب پاشی کی تھی کہ وہ شبن برسانے کی مرادف ہو گئی تھی مگر جو پھر بھی ایک حد تک سوکھی ہی کھیتیاں تھیں ہری بھری نظر آنے لگیں تاہم ہندوستان کی زمین پر جو زر پاشی افغانستان میں خوں ریزی کر رہی ہے وہ تو جنگ بلقان، جنگ عمومی اور جنگ استقلال ترکی کی یاد کو تازہ کر رہی ہے مگر گیا ایک فقیر بے نوا جو معنوی طور پر ہی نہیں بلکہ یورپ میں بصرف کثیر علاج کرا چکنے کے بعد لغوی طور پر بھی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور جس کی اب یہی دعا ہے کہ اس کا حشر اخبار نویسوں کے زمرے میں نہ کیا جائے، اس اخبار نویس برادری کی خدمت میں جس کے گھر کی رونق آج ہنگامۂ افغانستان پر موقوف ہے التماس کر سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ اس پر بھی غور کرے کہ یہ ہنگامہ نوحۂ غم کا ہنگامہ ہے نغمۂ شادی کا ہنگامہ نہیں اور اگر اس نوحے کے بعد کسی دوسرے نغمے کے سننے کی ان ادی کو خواہش ہے تو بہتر ہو کہ ان سطحی قیاسات سے گذر کر جو ہر اخبار میں کیا ہندوستان کے بچے بچے کے قیاسات ہیں اس پر بھی کسی قدر غور کر لیا جائے کہ آخر اغیار و اجانب کی دسیسہ کاریاں جن پر سب کو ایمان بالغیب ہے کارگر کس طرح ہو گئیں اور اگر افغانستان کو آزاد رکھنا ہے اور غیروں کی غلامی سے بچانا ہے تو جو کچھ ہندوستان میں آج کیا جا رہا ہے وہ ہرگز کافی نہیں ہے۔ ہندوستان میں جو وبا بھی آتی ہے وہ پائدار مرض بن کر رہ جاتی ہے چنانچہ ہیضہ آ کر نہ گیا تھا کہ طاعون آئی اور وہ پھر آ کر سفر کو اقامت کی شکل میں بدل گئی

جوں ہی طاعون نے اقامت اختیار کی انفلوانزا نمودار ہوا اور اب وہ بھی مسافر نہیں ہے بلکہ مقیم کی حیثیت رکھنے لگا ہے۔ یہ وبائیں کیا کم تھیں کہ "ایلیکشنائٹس" اور "ریزولیوشنائٹس" کی وبائیں ہر سمت پھیل گئیں اور سارے ملک کو اپنا شکار بنا رہی ہیں۔

صدیوں میں شاعروں نے بادشاہوں کے درباروں میں اتنی جھوٹی تعریف کے قصیدے نہ پڑھے ہوں گے اور نہ بھاٹوں نے نامردوں کو مرد بنانے کے لیے ان کی جھوٹی تعریفوں کے اتنے پل باندھے ہوں گے جتنے کہ ایک انتخاب میں امیدواروں کی تعریف میں پڑھے اور باندھے جاتے ہیں اور وہ شریف خاندان والے جن کے آباواجداد نے بادشاہوں تک کی "مزاج دانی" میں ان کی خوشامد سے احتراز و اجتناب کیا تھا آج اپنے انتخاب کی خاطر ایک ایک رلئے وہندے کے گھر جا کر اس کی خوشامد درآمد کرتے پھرتے ہیں۔

یہ تو وہ "ایلیکشنائٹس" کی وبا ہوئی اب ذرا "ریزولیوشنائٹس" کا حال سن لیجیے۔

جس شخص نے "تجویز" کے لیے "ریزولیوشن" کا لفظ انگریزی میں وضع کیا وہ یقیناً انگریزی قوم کی طرح ایک عملی کام کرنے والا انسان ہوگا اور خوب سمجھتا ہوگا کہ جب تک کوئی انسان یا انسانوں کی کوئی جماعت عزم بالجزم نہ کرے اُس وقت تک کوئی مرحلہ طے نہیں کیا جا سکتا اور اس نے خیال کیا ہوگا کہ وہی تجویز کارگر ہو سکتی ہے جس کے کرنے کا کوئی انسان یا انسانوں کی کوئی جماعت تہیہ کرے۔ اسی لئے اس نے عزم بالجزم اور تہیہ کو "تجویز" کا مرادف سمجھ کر "ریزولیوشن" کے لفظ کو اس لئے وضع کیا ہوگا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی قوم بساطیوں کی پیٹی سر پر رکھ کر سات سمندر پار کر کے ہندوستان اور ۳۲ کروڑ انسان تک مخلوقِ خدا پر ایک دن حکمرانی کرے گی اور دوسروں کی زبانیں سیکھنے میں بعید غبی

اورکند ذہن اور خراب حافظے والی ہونے کے باعث اپنی رعایا کو اپنی زبان سکھلائے گی اور اس طرح "ریزولیوشن" کا لفظ بھی ہندوستان کے ۱۹۰۰ میل کے طول اور ۱۵۰۰ میل کے عرض میں ہر گلی کوچے میں بولا اور سنا جائے گا اور یہاں اس کے معنی نہ قرآنی اصطلاح میں "عزم الامور" کے ہوں گے نہ مستقل ارادے اور تہیّے کے بلکہ صرف چند الفاظ یا چند سطور یا صفحات کے ہوں گے جو بکواس کرنیوالوں کی لایعنی بکواس کا مختصر یا طولانی عنوان ہوا کریں گے اور جو ۳۲ کروڑ غلاموں کو بے کسی کے پٹی بنانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ یہ ہے وبائے "ریزولیوشنیت"۔ آج اسی ہنگامۂ افغانستان کے سلسلے میں ہر طرف سے خبروں اور افواہوں کے علاوہ ریزولیوشنوں کی صدائیں کانوں میں آرہی ہیں جو بہت سی افواہوں سے بھی کم قابل اعتبار و اعتماد ہیں۔ اگر شاہ امان اللہ خاں کے ساتھ اس زور شور سے اظہار ہمدردی اتنا ہی کرے کہ برطانیہ افغانستان میں دست اندازی کرنے سے رک جائے تب بھی میں اس وبا کے پھیل جانے کو باعث زحمت سمجھوں گا لیکن آج جہاں ہر شخص قیاسات ہی سے کام لے کر حقیقت سے بالکل بے نیاز ہو رہا ہے خلاف فیشن تو ہرگز نہ سمجھا جائے گا اگر میں بھی اپنے قیاس سے کسی قدر کام لے کر کہوں کہ شاید ان ریزولیوشنوں سے کہیں زیادہ عناں گیر روس کی وہ فوجی تیاری ہے جس کا سوویٹ گورنمنٹ نے چھوٹتے ہی اعلان کر دیا تھا کہ برطانیہ کا اگر ایک سپاہی بھی افغانستان کی زمین پر قدم رکھے گا تو روس کی حکومت اس کو اپنے خلاف اعلان جنگ سمجھ کر اپنی فوج کو بھی افغانستان میں داخل کر دے گی

دوسرے سچ پوچھئے تو مجھے دیوان چمن لال صاحب کی بھرتی کی ہوئی فوج پر جسے وہ شاہ امان اللہ صاحب کی کمک کے لئے لیجانے کا عزم بالجزم فرما چکے ہیں کچھ زیادہ اعتماد بھی نہیں ہے آخر وہ "افغانستان ہوگی" (افغانی

ہوا یا یہ جس نے پنجاب کے ہندو سورماؤں کو لرزہ براندام کر دیا تھا اسی افغانستان کا باشندہ تھا یا کسی دوسری ولایت کا اور علی برادران پر جو یہ سو رماشبہہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ امیر کابل کو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے بلالیں گے وہ امیر کابل اعلیحضرت شاہ امان اللہ صاحب ہی تھے یا کوئی اور۔ جب دسمبر ۱۹۲۷ء میں مدراس کانگریس اور کلکتہ مسلم لیگ کے ان جلسوں سے چند ہی روز پیشتر جن میں ہندو مسلم اتحاد از سر نو قائم ہوا تھا اور اس عاجز نے مالوی جی کی اتحاد افزا تقریر کی اس قدر تعریف کی کہ اس کے اختتام پر جہاتما گاندھی کو کسی نے یقین دلایا تھا کہ میں نے نعوذ باللہ من ذالک مالوی جی کو سجدہ کیا تھا۔ اس ثمر تو بہار کے پھلنے سے چند ہی روز پیشتر دنہ کہ پکنے سے اس لئے کہ یہ پھل ادھ کچرا ہی آنندبھون اور قیصر باغ میں ٹوٹ پڑا) کیا یہی اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں بمبئی آئے تھے یا کوئی دوسرے وارث تخت و تاج افغانستان جن کا استقبال ہم خلافت والوں نے باوجود حکومت کی بیزاری کے اس شان سے کیا تھا کہ ہمارے اللہ اکبر کے نعروں سے انھوں نے خود قبول فرمایا کہ ان میں کئی پلی خون بڑھ گیا مگر جن کے لئے ہندو مسلمانوں کی طرف سے ایک مشترکہ گارڈن پارٹی بھی باوجود پوری کوشش کے شوکت صاحب نہ دلوا سکے۔ پھر کیا وہ یہی افغانستان ہے یا کوئی اور جس کے باشندے اسی بمبئی میں انھیں دیوان چمن لال کی پارٹی کے ہندو مل والوں کے ہاتھ سے میری آنکھوں کے سامنے اس بے دردی سے مارے گئے کہ توبہ ہی بھلی۔ دیوان چمن لال کی بھرتی کی ہوئی فوج کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس سے کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے مگر مصلحتاً اعلان سرحد افغانستان کو سکھوں کی غلامی سے چھڑانے ہی کا کیا تھا۔ کاش ہمارے

کرم دیوان چمن لال صاحب بجائے افغانستان کو بیچے سقے سے آزاد کرانے کے پنجاب ہی کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے فوج بھرتی کرنا شروع فرمائیں۔ شیخ سعدی نے شاید انھیں کے لیے لکھا تھا کہ ؎

دوستاں را کجا کنی محروم

تو کہ با دشمناں نظر داری

ابھی پشاور سے خبر آئی ہے کہ صوبہ سرحد کی خلافت کمیٹی کے زیر انتظام وہاں ایک جلسہ ہوا جس میں ہندو ہمدردوں کے اس اظہار ہمدردی پر ان کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ میں اپنے بھائیوں سے پوچھ سکتا ہوں کہ وہ ایسا نا کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس اظہار ہمدردی پر اعتماد کرتے ہیں اور اس پر مطمئن ہیں تو یہ انھیں یقین واثق ہے کہ یہ ہمدردی افغانستان کی پرداخت اور اس کے استقلال و آزادی اور ان کے بقاؤ قیام اور ترقی کے ساتھ ہے۔ میں صاف پوچھتا ہوں کہ کیا یہ حُبِ علی ہے یا بغض معاویہ ہے؟ کیا یہ اظہار ہمدردی اس شخص کے ساتھ کیا جا رہا ہے جس کے زمانے میں افغانستان آزاد ہوا اور اس کی سلطنت سے دست برداری پر اور اس کے بڑے بھائی کی معزولی پر ان حضرات کو اندیشہ ہے کہ افغانستان اب کہیں اپنی آزادی نہ کھو بیٹھے اور ہندوستان کی طرح غلام نہ بن جائے یا اس لیے کہ وہ صحیح یا غلط گمان کرتے ہیں کہ یہ شخص بھی مصطفےٰ کمال کی طرح دین کا دشمن اور شریعت اسلامیہ کی توہین کرنے اور کرانے والا ہے اور جن لوگوں نے اسے اور اس کے بھائی کو کابل سے نکال باہر کیا۔ وہ کم از کم منہ سے تو احترام شریعت اسلامیہ ہی پر زور دے رہے ہیں۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے میں صاف طور پر اس کا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے آزادی عزیز ہے خواہ وہ ایک اسلامی ملک کی آزادی ہو یا کفرستان

کے کسی حصے کی اور میں جاپان کو بھی آزاد دیکھ کر خوش ہوں اور چین کو بھی کلیتہً آزاد دیکھنے کا آرزومند ہوں اور نیپال کو بھی اسی طرح آزاد دیکھنا پسند کرتا ہوں جس طرح افغانستان شاہ امان اللہ کے عہد میں آزاد ہو گیا۔

میرا جی دمشق میں ایک نصرانی کے اخبار "الاحرار" کے نام کے نیچے یہ عبارت دیکھ کر باغ باغ ہو گیا کہ "کیا تم ان کو غلام بناؤ گے حالانکہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا ہے" کیونکہ یہ عبارت ایک سچے مسلمان اور رسول اکرمؐ (روحی فداہ) کے خلیفہ حضرت عمرؓ کی جھڑکی تھی جو انھوں نے اپنے ایک مسلمان گورنر کو دی تھی۔ اگر افغانستان سارے کا سارا کافر بھی ہو جائے تب بھی میرے اسلام کا یہ تقاضا ہے کہ میں اس کی آزادی کا خواہاں ہوں نہ کہ اس کے استعباد اور اس کی غلامی کا۔ اس لئے یہ ہنگامہ جو افغانستان میں آج بپا ہے اگر جلد از جلد فرو نہ ہوا تو مجھے خوف ہے کہ اس کی آزادی بھی اعلیٰحضرت شاہ امان اللہ خاں کی حکومت کی طرح ختم ہو جائے گی اور اگر اعلیٰحضرت کی تخت و تاج سے دست برداری اسی سبب سے عمل میں آئی تھی کہ انھوں نے "احترام شریعت" میں کچھ کوتاہی کی تھی اور ان کا جانشین صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہی کی غرض سے تخت نشین ہوا ہے تب بھی میں اعلیٰحضرت کے مخالفین اور ان کے جانشین کے موافقین سے پوچھوں گا کہ کیا غیروں کی غلامی میں احترام شریعت باقی رہ جائے گا۔ خود احترام شریعت کے افغانستان میں قائم کرنے اور رکھنے کے لئے اس کی اشد ضرورت ہے کہ یہ ہنگامہ فرو کیا جائے۔ یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یا تو کابل کے موجودہ حکمراں اور اس کے حامیوں کا قلع قمع کیا جائے یا پھر اعلیٰحضرت شاہ امان اللہ خاں اور ان کے حامیوں کا یا ان دونوں میں مصالحت کرائی جائے۔ ان تین صورتوں کے علاوہ چوتھی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔

کیا اب میں ان حضرات سے جو روز جلسے کر کے لمبے چوڑے یا کم از کم نہایت پر زور اور شان دار الفاظ میں ریزولیوشن پاس کر رہے ہیں پوچھ سکتا ہوں کہ دیوان چمن لال صاحب نے یا کبھی خود انھیں نے کوئی فوج غدار طلاؤں کے خلاف تیار کر لی ہے جسے کردہ کابل پر چڑھائی کریں گے۔ خود مجھ سے بمبئی کے افغانی قنصل صاحب نے جو میرے دلی کے قیام ہی کے زمانے میں یہاں کی قنصلات جنرل سے قندھار بھیجے گئے تھے اور میرے بمبئی کے قیام ہی کے زمانے میں وہاں سے واپس آئے مکرر سہ کرر فرمایا کہ سردار علی احمد جان خود شاہ افغانستان ہرگز بننا نہیں چاہتے بلکہ اپنے پھوپی زاد بھائی شاہ امان اللہ خاں ہی کی طرف سے کابل پر چڑھائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ جلال آباد کا جو حشر ہوا ہے کیا اس سے بھی ہمیں عبرت نہیں ہوتی اور کیا ہم اب تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ شاہ امان اللہ خاں کے خلاف صرف ایک بشئی کا لونڈا ہے جو محض اتفاقیہ اور انھیں دھوکا دے کر اور قرآن کریم پر ایک معروضہ تحریر کر کے اپنی جان کی اماں پا کر اور انھیں سے دو ہزار بندوقیں اور چند ہزار کارتوس شنواریوں کی گوشمالی کے لئے لے کر حربیہ کالج اور اسلحہ خانے اور مخزن پر یکا یک چھاپہ مار کر قابض ہو جانے کے باعث کابل پر قبضہ کر بیٹھا اور انھیں نہ صرف قندھار کو بھگا سکا بلکہ انھیں تخت د تاج سے دست برداری پر بھی مجبور کر سکا اور نہ صرف انھیں بلکہ ان کے بھائی تک کو جنھوں نے بہ ظاہر کوئی شئے احترام شریعت کے منافی نہیں کی تھی قندھار بھجوا کر چھوڑا۔

کیا ہمیں اب بھی یقین ہے کہ سب نہیں تو اکثر سرداران قبائل شاہ امان اللہ خاں ہی کے ساتھ ہیں اور صرف محمود طرزی صاحب ہی جن کی صاحبزادی نہ صرف ملکہ ثریا ہیں بلکہ سردار عنایت اللہ خاں صاحب کی زوجہ محترمہ بھی ہیں

اس ہجرت میں ان کے شریک وسہیم ہیں بلکہ اور وزرار سلطنت مثلاً سردار محمد خاں، سردار عبدالہادی خاں وغیرہم بھی دل سے ان کے ساتھ ہیں اور علالت یا قید یا کسی اور ایسے ہی سبب کے باعث قندھار جانے سے معذور ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو مگر قرائن سے تو یہ امر کم از کم مشتبہ ہے۔ بہر حال اس میں تو شک نہیں کہ خواہ دین اسلام کی محبت میں سرشار ہو کر یا استعماری رشوت کا شکار ہو کر یا اپنے مریدوں کی نذر و نیاز سے محروم ہو کر یا ایک متمدن اور ترقی پذیر حکومت کے مصارف کے بوجھ سے دب جانے پر پریشان ہو کر افغانستان کے ملا شاہ امان اللہ کے خلاف ہیں اور یہ بھی یقینی ہے کہ وہ افغانستان میں ابھی تک بہت کچھ اثر رکھتے ہیں اور اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ شاہ غازی نے تخت و تاج سے دست برداری کے اعلان سے پیشتر ایک فرمان جاری فرمایا تھا جس پر بعض اکابر علمار کے بھی دستخط تھے جس میں بعض اصلاحات کو واپس لیا تھا گو مجھے قنصل صاحب بمبئی سے یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ ایسا کوئی فرمان جاری نہیں کیا گیا تھا بلکہ اعلیٰحضرت نے صرف اس کا وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی رعایا کی شکایات پر غور کریں گے اور اگر کوئی اصلاح خلاف شریعت حقہ ہوئی تو اسے منسوخ کر دیا جائے گا مگر ملاؤں کا اعلیٰحضرت کے خلاف ہونا اور ان کا اب تک افغانستان میں بہت با اثر ہونا یقینی ہے، تو میں ان مسلمانوں سے جو "ہندو ہمدردوں" کی طرح ان ملاؤں کو گالیاں دے رہے ہیں پوچھتا ہوں کہ آپ نے کوئی لشکر ان ملاؤں کے قلع قمع کرنے کے لئے تیار کر لیا ہے، اگر نہیں کیا تو کیا آپ مصالحت کی کوئی امید رکھتے ہیں۔ اگر آپ مصالحت کے آرزومند ہیں تو یہی سب وشتم کا طریقہ مصالحت کا طریقہ ہے؟

جہاں تک آثار و قرائن سے پایا جاتا ہے اور سب قیاسات ہی سے کام لے رہے ہیں اور اکثر لوگوں کا مبلغ علم تو وہی خبریں اور افواہیں ہیں جنھیں برطانوی

استعمار ہم قیدیوں کے قید خانے میں آنے دیتا ہے ایسی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف سے غلطیاں ہوئی ہیں کسی طرف سے کم یا بہت ہی کم سہی اور کسی طرف سے زیادہ یا بہت ہی زیادہ اور افغانستان کا یہ ہنگامہ ہرگز اس وقت تک فرو نہ ہوگا جب تک اس کا حکمراں اور اس کی رعایا دونوں صدق دل سے توبہ کرکے احترام شریعت حقہ کا حتمی وعدہ نہ کرلیں گے اور اس کے ایفا کی پوری جدو جہد نہ کریں گے ۔ افغانستان کی آزادی اسی وقت مستحکم ہوسکتی ہے جب وہاں اسلامی حکومت مستحکم ہو اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ذمہ دار، سمجھ دار اور باثر مسلمانوں کا ایک وفد قندھار بھی جائے اور کابل بھی اور فریقین کو احترام شریعت اسلامیہ پر آمادہ کرے اور مسلمانوں کے ہاتھ سے مسلمانوں کا کشت وخون نہ ہونے دے ۔ میں اب بھی سرڈینس برے سکریٹری محکمۂ خارجہ سے بالکل مایوس نہیں ہوں اور مجھے پھر ایک حد تک امید بندھ چلی ہے کہ وفد خلافت کو آیۂ کریمہ " انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم " پر عمل کرنے کا موقع دیا جائے گا ۔ میری حکومت ہند سے درخواست ہے کہ ؎

من نمی گویم زیاں کن یا بہ فکر سود باش
اے زفرصت بے خبر! در ہر چہ باشی زود باش

مانا کہ ہنگامۂ افغانستان کا آخری نتیجہ استعمار کے لیے مفید ثابت ہو مگر بدنظمی جب تک رہے گی استعمار سے کہیں زیادہ اشتمالیت کے نشر وتبلیغ میں ممد معاون ثابت ہوگی ۔ افغانستان اور اسلام کے فائدے کے لیے نہ سہی استعماری کے فائدے کے خیال سے اس بدنظمی اور ہنگامے کا جلد سے جلد خاتمہ کرانا چاہیے اور پیشتر اس کے کہ برف گھلنا شروع ہو اور فوجوں کی کوچ کے لیے راستہ صاف ہوجائے وفد خلافت کو قندھار جانے دیا جائے اور اس کے بعد کابل

خواہ کابل کے لئے حکومت ہی کے ہوائی جہاز کیوں نہ استعمال کرنا پڑیں۔ اگر ایک بار فوجیں بڑھنا شروع ہوگئیں اور طبل جنگ بجنا شروع ہوگیا تو پھر حضرت ناصح کی کون سنتا ہے اور وہ بھی افغانستان جیسے جنگجو ملک میں؟ مگر وفد خلافت گیا بھی تو کیا حاصل ہوگا جب تک مسلمانانِ ہندوستان سب وشتم کو بند نہ کریں گے اور مصالحانہ رویہ اختیار نہ کریں گے۔ آج کل "سردی کی لہر" بھی خداوند کریم کی طرف سے ایک آیۂ رحمت ہے اور جو برف پڑ رہا ہے وہ آتشِ جنگ کو بھڑکنے سے ایک حد تک روکے ہوئے ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے پرجوش مقررین اور محررین کی زبانوں اور ان کے قلموں پر بھی کچھ دن کے لئے کم سے کم پالا ہی پڑ جائے تاکہ افغانستان میں پھر امن وامان قائم ہو اور آزادی اور اسلام کا جھنڈا وہاں ہمیشہ ہمیشہ آزاد رہے وما توفیقی اِلا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

(۲) جنرل نادر خاں صاحب کی آمد

ہمدرد ۲۲ فروری ۱۹۲۹ء

"ہمدرد" کے قارئین کرام کی خدمت میں اڈیٹر "ہمدرد" کے ذریعے سے ایک عرصہ ہوا اس کا اظہار کرا چکا تھا کہ نہ کارکنان جمعیت خلافت نہ اس کا صدر افغانستان کے ہنگامے کی طرف سے غافل تھے گو خود میں نے حالات موجودہ وقت میں سکوت کو ترجیح دے رکھی تھی۔ سب سے پہلی بار میں نے یہ مہر سکوت بمبئی میں مسلمانوں کے ایک عام جلسے میں توڑی اور ایک بسیط تجویز کو اس جلسے میں مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کے روبرو منظوری کے لئے پیش کیا اور اپنے دستور کے مطابق میں حاضرین سے ہر جزوی مسئلے کے متعلق پوچھتا رہا کہ انھیں میرے خیالات سے اتفاق ہے یا اختلاف تا کہ اگر اختلاف ہو تو ان کے دلائل معلوم کر کے انھیں اپنے خیالات سے اتفاق کرنے پر دوبارہ آمادہ کروں یہاں تک کہ اس تجویز کے تمام اجزا سے حاضرین کو پورا اتفاق ہو گیا اور بہ طیب خاطر انھوں نے پوری تجویز بلا اختلاف منظور کی۔ وہ تجویز اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ گو اپنی سخت علالت کے باعث اسپتال جانے اور وہاں قیام کے دوران میں بمبئی کے فسادات نے اتنی فرصت نہ دی کہ اس تجویز کا ترجمہ ہی انگریزی اخبارات کو ارسال کر سکتا چہ جائیکہ اپنی تقریر کا خلاصہ بھی ان میں شائع کرا سکتا۔

بمبئی کے اخبارات میں تقریروں کی رپورٹیں مدراس تو درکنار کلکتے کے اخبارات سے بھی بدتر شائع ہوا کرتی ہیں اور پھر سیاسی اور ملی تعصبات تو رپورٹروں کی ناقابلیت پر اڈیٹوریل عملے کی عصبیت اور "حمیت الجاہلیۃ" کا اضافہ کر دیا

کرتے ہیں اسی مسئلے پر شوکت صاحب کی چند روز پیشتر کی تقریر کو "ٹائمز آف انڈیا" نے
جس طرح مسخ کرکے اور رنگ آمیزی کے ساتھ شائع کیا ہے اس طرح کی رپورٹیں
دیکھ کر تو بعض وقت جی چاہتا ہے کہ انسان تقریر ہی نہ کرے، وقت ملے تو اپنے
خیالات کا خلاصہ خود ہی لکھ کر اخبارات کو بھیج دیا کرے گو اس پر بھی یقین نہیں کہ
بہت سے اخبارات آج کل کی عصبیت کی فضا میں کسی تحریر کو بھی شائع کریں گے
خلاصہ جریدۂ "خلافت" نے شائع کیا تھا جس کے لیے میں اس کا ممنون ہوں۔ مگر
حقیقت یہ ہے کہ اکثر رپورٹر جو شارٹ ہینڈ نہیں جانتے (اور سی۔ آئی۔ ڈی کے سوا
اردو کا شارٹ ہینڈ جانتا ہی کون ہے) اور ساری تقریر بجنسہٖ شائع کرنا چاہتے ہیں
چند الفاظ اور جملے تو صحیح لکھ پاتے ہیں اور ان فروگذاشتوں کے باعث مقرر کا
سارا مطلب خبط ہو جاتا ہے اور عبارت بالکل بے ربط اور مہمل ہو جاتی ہے۔
اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ایک اچھی سمجھ اور حافظے کا رپورٹر ایک تقریر کو غور
سے سن لے اور ترتیب کے لئے مختصر سے نوٹ لیتا جائے اور اس کے بعد ساری
تقریر کا خلاصہ بالمعنی لکھ دے اور جہاں تک مقرر کے اصلی الفاظ بالیقین یاد ہوں
انھیں کو استعمال کرے لیکن اپنے الفاظ میں خلاصہ لکھنے سے نہ ڈرے، کوشش
اس کی کرے کہ مقرر کے تمام نکات کا صحیح مفہوم اس کی رپورٹ میں مل جائے
اور جو نقش اس تقریر کا خود اس کے دل و دماغ پر ہوا ہے وہی اخبار کے
پڑھنے والوں کے دلوں اور دماغوں پر ڈال دیا جا سکے۔

میرے کلکتہ خلافت کانفرنس کے خطبۂ صدارت کو اڈیٹر صاحب "خلافت"
نے باللفظ شائع کرنے کی کوشش کی اور خود ہی نہایت محنت برداشت کرکے
جلسہ گاہ میں اس کا لفظ لفظ لکھنا چاہا مگر افسوس کہ کامیابی نہ ہوئی۔ اس بمبئی کے
جلسہ عام کی تقریر کی رپورٹ انھوں نے بالمعنی شائع فرمائی ہے لیکن حقیقتاً ایک

اخبار کا اڈیٹر اگر اس طرح رپورٹر کے فرائض بھی انجام دے اور اڈیٹری کا کام بھی کرے تو وہ دونوں کاموں میں ایک حد تک ناکام رہے گا۔ میں تو بدر جلالی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے میری اس تقریر کو اپنا اڈیٹری کا کام ایک حد تک چھوڑ کر شائع کر دیا مگر ان کو اڈیٹری سے ذرا بھی اور فرصت مل ہوتی تو وہ اس تقریر کی رپورٹ کو حسب دلخواہ شائع کراتے مگر وہ اڈیٹری کے فرائض سے بالکل سبک دوش نہیں ہو سکتے تھے اور ان کی رپورٹ نہ ان کے حسب دل خواہ شائع ہو سکی نہ میرے حسب دل خواہ۔ انھیں مشکلات کے باعث مجھے "ہمدرد" کے اڈیٹوریل عملے کو بھی اپنی مسجد جامع کی تقریروں کے شائع کرنے سے روکنا پڑا حالانکہ میں دیکھ رہا تھا کہ بعض معاصرین کے نامہ نگار جاسوس میری تقریروں کو مسخ کر کے میرے خلاف لوگوں کو ابھار رہے تھے اور خود جیب کما رہے تھے۔

افغانستان کے ہنگامے کے متعلق بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات کو "ہمدرد" کے ذریعے سے بھی ظاہر کروں اور مسجد جامع میں بھی نماز کے بعد اس پر کچھ عرض کروں۔ چنانچہ میں نے ۱۵ فروری کو مسجد جامع میں ایک مختصر سی تقریر کی اور "ہمدرد" مورخہ ۱۵ فروری میں انھیں خیالات کو اور بھی اختصار کے ساتھ شائع کرایا مگر اس تقریر کے بعد بھی حاضرین میں سے چند نوجوانوں کو جن کا مبلغ علم زیادہ تر پشاور کی خبریں اور افواہیں اور ان پر جریدہ نگاروں کی گرم گرم اور چیت پٹ سرخیاں تھیں یا اردو اخبارات کے مقالات افتتاحیہ میرے خیالات کے متعلق غلط فہمی ہوئی اور بعض کو تشفی حاصل نہ ہو سکی۔ ہر شخص کی تشفی کرا دینا تو آسان نہیں لیکن غلط فہمی دور کرنا ہی پڑتی ہے اور اسی کوشش میں مجھے تقریباً نصف گھنٹہ اور لگ گیا اور میں اور میرے چند ساتھی جو اسمبلی کے اعضا تھے اسمبلی کے اجلاس میں بہت دیر سے پہنچے اور موم ممبر صاحب اور چند اور

مقررین کی اہم تقریریں کو نہ سن پائے البتہ گذشتہ جمعہ کو یعنی ۲۲ فروری کو میں نے پھر مسجد جامع میں تقریر کی اور اس بار تمام غلط فہمیوں کو دور کرنے ہی میں کامیاب نہیں ہوا بلکہ حاضرین میں سے بظاہر ہر شخص کی تشفی خاطر کر سکا اور تمام جماعت نے میرے خیالات سے اتفاق کیا، میرے رویئے کو مستحسن قرار دیا اور مجھے اپنی محبت اور خلوص کے اظہار سے سرشار کر دیا۔ کاش تمام دنیا کے مسلمان کم سے کم ہندوستانی مسلمان اسی طرح کسی ایک جماعت میں شریک ہو سکتے اور میں ان کے سامنے بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا اور ان کی تشفی خاطر کر سکتا بلکہ میرا بس چلے تو ساری دنیا کی مخلوق کو یا کم از کم اپنے سب ہم وطنوں ہی کو اس طرح مخاطب کر سکتا اور اپنے خیالات کا ان کی خدمت میں بالفاظ خود اظہار کر سکتا اور ان کی تشفی خاطر کی کوشش کر سکتا۔ زائد سے زائد اس وقت یہی کر سکتا ہوں کہ اس ہنگامے کے متعلق "ہمدرد" میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گو اس سے سوائے اس کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا کہ اس کے قارئین کرام کی مختصر سی جماعت میرے خیالات کا نہایت ہی مختصر خلاصہ پڑھ لے اور میری جریدہ نگار برادری میں سے بعض میرے خیالات کا غلط مفہوم سمجھ کر یا ان کو عمداً خلاصۂ مفہوم کا جامہ پہنا کر اپنے قارئین کرام کی بڑی جماعت کو مجھ سے بدظن کر دیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ بعض خیالات کا اظہار بھی اس وقت خلاف مصلحت ہوگا۔ ہماری اخباری برادری کو یا تو اس مصلحت کا احساس ہی نہیں یا اس نے جریدہ نگاری کو محض حصول زر کا ایک ذریعہ سمجھ لیا ہے اس لئے اس کا جو جی چاہے وہ لکھے میں تو اس پر بھی اگر شاکر نہیں تو کم از کم صابر ہوں کہ خدا کی مخلوق اور مسلمان میرے متعلق بدظنی سے کام لیں مگر کام بگڑنے نہ پائے اور کسی نہ کسی طرح انجام پا جائے۔ میرے متعلق ان کی بدظنی کی یہ پہلی مثال نہ ہوگی۔ بارہا انھوں نے

اسی اخباری برادری کی تہمت تراشیوں کے باعث میرے بارے میں اس آیہ کریمہ کا کہ لولا اذ سمعتموہ ظن المومنون والمومنت بانفسہم خیرا وقالو ھذا افک مبین دکیوں نہ جب تم نے اس کو سنا تھا ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں نے اپنے لوگوں کے متعلق بھلا خیال کیا ہوتا اور کہا ہوتا کہ یہ صریح طوفان ہے۔)

بہر حال میں آج کسی قدر مزید وضاحت کے ساتھ ظاہر کیے دیتا ہوں کہ میں نے اس تمام عرصے میں کیا کیا اور اب کیا کر رہا ہوں اور اس شخص سے جس کی طرف آج ساری دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں میرے رویے کو کیا داد تحسین ملی ہے اور اس کی خدمت میں آج میرا کیا معروضہ ہے۔ اگر پنجاب کی اخباری برادری کو اس پر بھی مجھ سے اختلاف ہے تو میں مجبور ہوں۔ واقعات خود ان قیاسات پر فیصلہ صادر فرمادیں گے۔ جب میں کلکتے میں تھا تو صوبہ سرحد کے کارکنان خلافت نے وفد خلافت بھیجے جانے پر اصرار کیا تھا اور چونکہ میں بھی اُن سے متفق تھا اس لئے میں نے بھی وفد خلافت کے بھیجے جانے کی تائیدکی اور یہ تجویز منظور رہوئی، البتہ میں خود ایک عرصے کے بعد وطن واپس آیا تھا خود بھی علیل تھا اور میری لڑکی بیگم ماجد علی علیل ترتھی اس لئے خود اس وفد میں اپنا نام نہ رکھا۔ ابھی اس وفد کے متعلق افغانی قنصل جنرل ہی سے سلسلہ جنبانی ہو رہی تھی کہ اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں نے تخت و تاج سے دستبرداری کا اعلان فرمادیا اور اپنے بھائی عنایت اللہ خاں صاحب کو وارث تخت و تاج کی حیثیت سے چھوڑ کر خود قندھار چلے گئے۔ صوبہ سرحد سے وفد کے متعلق تقاضا ہوا تو میں نے شوکت صاحب سے تار پر دریافت کیا کہ پاسپورٹ کے متعلق اب کیا ہو رہا ہے جس پر انھوں نے تار پر جواب دیا کہ ایسی حالت میں

ہم کہاں جا سکیں گے اور کیا کر سکیں گے۔ واقعی ایسی حالت میں وفد خلافت کے متعلق کوئی کارروائی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن جب اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں نے قندھار سے اعلان کیا کہ وہ پھر بادشاہ بننے کی کوشش کریں گے اور میں جا کر افغانی قنصل جنرل صاحب سے ملا اور میں نے معلوم کیا کہ وہ بمبئی کے افغانی قنصل صاحب کو حالات دریافت کرانے کے لئے قندھار بھیج رہے ہیں اور قندھار جانا ہمارے لئے بھی ممکن ہے تو میں نے اسی وقت نہ صرف وفد خلافت کے لئے پاسپورٹ حاصل کرنے کی ٹھان لی بلکہ باوجود اپنی اور اپنی لڑکی کی سخت علالت کے خود بھی اپنا نام وفد میں بڑھا دیا اور حکومت ہند کو تحریری درخواست سے بھی پیشتر سر ڈینس برے معتمد محکمۂ خارجہ کے ذریعے سے ٹیلیفون پر درخواست دیدی اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کو بھی اسی شب میں اس کی اطلاع کر دی اور ان کو بھی قندھار اور پھر کابل چلنے پر آمادہ پایا۔ دوسرے دن سر ڈینس برے سے ملنا چاہا اور انھوں نے تحریر کو گفتگو پر ترجیح دی تو ایک لمبی چوڑی تحریر ان کی خدمت میں ارسال کر کے بمبئی گیا اور اس سے پیشتر ہی شوکت صاحب کو ٹیلیفون پر تمام حالات سے مطلع کر دیا۔ بمبئی جا کر حکومت ہند کو خط اور تار دونوں کے ذریعے پاسپورٹ کے لئے باضابطہ لکھا اور اپنے مطالبے کی مسلمانوں کے ایک عظیم الشان جلسۂ عام سے تائید کرائی اس لئے کہ سر ڈینس برے کا انکاری تار آچکا تھا اور ہمارا دوسرا تار اس کے جواب میں بھیجا جا رہا تھا کہ جن وجوہ سے انھوں نے انکار کیا ہے وہ معقول نہیں ہیں۔ یقیناً افغانوں میں باہمی جنگ ہو رہی ہے لیکن اگر جنگ نہ چھڑی ہوتی تو مصالحت کے لئے کسی وفد خلافت کے جانے ہی کی کیا ضرورت ہوتی۔ راستہ یقیناً خراب ہے لیکن ہم پروانۂ راہداری مانگتے ہیں، حکومت ہند سے راستہ صاف نہیں کراتے۔ جب راستہ صاف

ہو جائے گا ہم بھی روانہ ہوں گے۔ پروانۂ راہداری دینے میں اسے کیوں عذر ہے۔ رہا جان و مال کا خطرہ ہم نے کب اس سے بچنے کی کوشش کی ہے ع

دشمن اگر قویست نگہباں قوی تراست

ہمارا اسی پر توکل اور بھروسہ ہے۔ بہرحال ہم اگر مارے بھی گئے تو ایک غیر اسلامی حکومت سے نہ قصاص کا مطالبہ کریں گے نہ دیت کا۔ اتنی بار دشمنوں کے نرغے میں ہماری جانیں معرض خطر میں رہی ہیں۔ ایک بار اپنے ہم مذہب بھائیوں کے نرغے میں اگر معرض خطر رہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ رہا حکومت ہند کی ناطرف داری کا سوال تو اس سے بڑھ کر اس کی ناطرف داری کا کیا ثبوت ہوگا کہ اس نے ہم جیسے لوگوں کو بھی جو اس کے استعمار کے کھلے دشمن ہیں ایک اسلامی ملک میں مصالحت کے لئے بھیج دیا۔ اس تار پر بھی حکومت کی طرف سے انکار ہی ہوا لیکن میں نے بمبئی سے واپس آکر سر ڈنیس برے کو پھر سمجھانے کی کوشش کی ہے اور میں "ہمدرد" میں شائع کر چکا ہوں کہ میں اب تک ان سے بالکل مایوس نہیں ہوا ہوں اور برابر کوشش کر رہا ہوں کہ ان کو بھی اس کا قائل کر دوں کہ ان کے استعمار کے مصالح کے لحاظ سے بھی افغانستان کا موجودہ ہنگامہ مفید نہیں ہے وہاں ایک آزاد اور مستقل اور مضبوط اسلامی حکومت کا قیام اور دوام اگرچہ ان کے استعمار کے لئے اتنا مفید ثابت نہ ہوگا جتنا ہمارے ملک و ملت کے لئے۔ تاہم موجودہ ہنگامہ ان کے لئے بھی یقیناً مضر ثابت ہوگا اور مانا کہ ہم ان کے دوست نہیں لیکن آج اتفاق سے دونوں کے اغراض ایک حد تک مشترک اور یکساں ہیں۔

اب اسے چھوڑیئے اور دوسری داستان سنیئے۔ سر ڈنیس برے سے اسمبلی میں ملاقات کے بعد مجھے ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ جنرل نادر خاں صاحب

فرانس سے چل دیئے اور ہندوستان آرہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان کے اخبارات راجہ مہندر پرتاپ اور ہمایوں صاحب کا نام لے رہے تھے کہ وہ ان کے بلانے کے لئے تشریف لے گئے ہیں اور یہ کہ جنرل صاحب موصوف ماسکو سے پرواز کر کے قندھار پہنچیں گے۔ میں اس سے قبل جنرل صاحب موصوف کی فرانس سے روانگی کی خبر کی تصدیق کر چکا تھا اور مجھے اس کا علم بھی تھا کہ اس کے بعد کی خبریں بھی کہ صاحب موصوف کا سفر ایک چیستاں اور معمہ ہے اور زیر زمین مدفون خزانے کی طرح مخفی ہے، اخباروں کی اور افواہوں کی طرح بالکل بے سروپا اور بے بنیاد ہیں اور وہ ۹ر فروری کو پی اینڈ او کمپنی کے جہاز "قیصر ہند" میں ساحل فرانس سے روانہ ہو چکے ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ ۲۲ر فروری کو بمبئی پہنچ جائیں گے، جہاں اُن کے بعض افغان دوست ان سے ملنے کے لئے پہلے ہی سے چلے جائیں گے۔

میں نے اس کے معلوم ہوتے ہی انہیں اور ان کے چھوٹے بھائی سردار علی شاہ ولی صاحب کو جو مجھے جنرل صاحب موصوف کے پاس ان کی تیمارداری کے لئے سوئٹزرلینڈ جاتے وقت دہلی کے اسٹیشن پر مل چکے تھے اور مجھے اپنی تصویر اور ایک قلم عطا فرما چکے تھے عدن کو ایک ارجنٹ بحری تار اس مضمون کا ارسال کیا کہ میں ان سے ملنے کا بے حد خواہش مند ہوں، براہِ کرم وہ مجھے مطلع فرمائیں کہ دہلی کس تاریخ کو پہنچیں گے اور کتنی دیر تک قیام ہوگا۔ مجھے دوسرے ہی دن اس کا بذریعہ لاسلکی جواب ملا کہ ہم آپ کے بحری تار کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور بمبئی پہنچ کر آپ کو اطلاع دیں گے۔ میں نے شوکت صاحب کو بھی بحری تار بھیجنے کے لئے بذریعہ ٹیلیفون مشورہ دیا تھا اور جب میرے پاس جنرل صاحب اور سردار علی شاہ ولی خاں کا جواب آگیا تو میں نے شوکت صاحب کو تار دیا کہ بذریعہ لاسلکی تینوں محترم بھائیوں کو بمبئی اور دہلی میں جمعیت خلافت کا

مہمان بننے کی دعوت دے دیجئے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور شب جمعہ میں سحری کے وقت مجھے شوکت صاحب کا تار ملا کہ معزز مہمانوں نے جمیعت خلافت کی دعوت قبول فرمائی اور دار الخلافت میں جو خلافت کے مکان کا تاریخی نام ہے ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

میں نے اس خیال سے کہ غالباً ہمارے معزز مہمان وقت کی نزاکت کے خیال سے ہجوم سے گھبرائیں ان کے لئے کسی مکان کا انتظام کرنے کی بجائے میڈنس ہوٹل میں کمروں کا ایک سیٹ اور چند خواب گاہیں روک لی تھیں سحری کے وقت میں نے شوکت صاحب کو ٹیلیفون دیا اور دریافت کیا کہ دہلی کے قیام کے متعلق کیا اطلاع ملی ہے جس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ میں ۸ بجے کے بعد گودی پر جا کر اپنے معزز مہمانوں کا استقبال کروں گا اور ان سے دریافت کرنے کے بعد میں ٹیلیفون پر مطلع کروں گا۔ کل جمعہ کے دن سحری کے بعد سے میں برابر ٹیلیفون پر بیٹھا رہا اور شوکت صاحب کی اطلاع کا انتظار کیا جب نماز جمعہ کا وقت قریب آیا اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور میں وہاں جانے لگے تو مجبور ہو کر خود میں نے پھر بمبئی کو ٹیلیفون دینا چاہا مگر معلوم ہوا کہ صبح کے ساڑھے سات بجے سے لائن خراب ہے ؎

جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا
وہی پر گر پڑا کبوتر کا

اس کے بعد میں نے ٹیلیفون والوں سے کہا کہ اگر ڈھائی بجے تک بمبئی سے "ٹیلیفون کال" آئے تو بند رکھئے گا جب میں بعد نماز و تقریر واپس آجاؤں تو بمبئی سے ملا دیجئے گا۔ جب نماز سے گھر واپس آیا تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اب تک لائن بگڑی ہوئی ہے۔ مغرب تک درستی کا انتظار کرنے

کے بعد ایک جگہ افطار کے لئے گیا وہاں ایک مقامی اخبار کے مالک اور اڈیٹروں سے معلوم ہوا کہ فری پریس نے جنرل نادر خاں صاحب کے ورود کی خبر بھیجی ہے اور حکومت بمبئی کے ایک نمائندے نے ان کا استقبال جہاز پر جاکر کیا تھا اور وہ افغانستان قنصل کے ہمراہ تاج محل ہوٹل روانہ ہوگئے۔ چونکہ شوکت صاحب یا کسی اور خلافت والے کا مطلق کوئی ذکر نہ تھا مجھے اس رپورٹ پر اور ہمارے مہمانوں کے تاج محل ہوٹل میں قیام پر تعجب ہوا اگرچہ یہ سنا کہ انھوں نے اپنی اور اپنے خاندان کی طرف سے تخت و تاج افغانستان کے حصول کی کوئی خواہش یا ہوس رکھنے کا قطعی انکار فرمادیا ہے تو مجھے بے حد مسرت ہوئی اس لئے کہ مسجد جامع میں میری تقریر میں جنرل صاحب موصوف کے حالات سن کر ایک صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ پھر وہی کیوں شاہ افغانستان نہ بن جائیں اور میں نے عرض کیا تھا کہ میں تو سوائے خدا کے کسی کی بادشاہت کا قائل ہی نہیں ہوں میں ان کو اس گناہ کی طرف کیوں مائل کروں، ان کے لئے اور مسلمانوں کے لئے اور افغانستان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ فریقین میں ثالث بالخیر بن کر مصالحت کرادیں اور ایک مستقل اور آزاد اور مضبوط اسلامی حکومت وہاں پر قائم کرادیں بجائے اس کے کہ خود دعوے دار سلطنت بن کر اس ہنگامے کو اور بڑھائیں۔ گھر آکر میں نے ایک ارجنٹ تار شوکت صاحب کو روانہ کیا اور معزز مہمانوں کے دہلی آنے اور یہاں قیام فرمانے کے متعلق پھر دریافت کیا اور چونکہ فری پریس کے تار میں درج تھا کہ وہ فرنٹیر میل سے جمعہ ہی کو روانہ ہوگئے اور سیدھے پشاور چلے جائیں گے اس لئے میں نے تار میں یہ بھی لکھ دیا کہ یہاں کا قیام ان کے مصالح کے خلاف ہو تو میں راستے ہی میں کہیں ان سے ملاقات کرلوں اس لئے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا

اور میرا ارادہ تھا کہ ایسی حالت میں یہی مناسب ہوگا کہ وفد خلافت کے اعضا ان سے اسی طرح راستے میں کچھ گفتگو کریں۔

سحری کے وقت مجھے شوکت صاحب کا مفصل تار ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ تینوں محترم بھائی جنرل نادر خاں صاحب، سردار محمد ہاشم خاں صاحب اور سردار اعلیٰ شاہ محمد ولی خاں صاحب "قیصر ہند" جہاز میں جمعہ کی صبح کو تشریف آور ہوئے۔ کارکنان خلافت گودی پر ان کا استقبال کرنے کے لئے حاضر تھے۔ جہاز ہی پر کارکنان خلافت کی ان سے ملاقات ہوئی اور نہایت مزیدار گفتگو ہوتی رہی۔ جنرل صاحب موصوف کی صحت اچھی نہیں رہی ہے اور اپنے آبا و اجداد کے ملک میں اس ہنگامے سے سخت صدمہ ہوا ہے۔ وہ مجھ سے اور دوسرے احباب سے دہلی کے اسٹیشن پر ملاقات کرنے کے مشتاق ہیں اس لئے کہ وہ راستے میں کہیں قیام کئے بغیر پشاور جانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کارکنان خلافت سے جن کی میزبانی وہ قبول فرما چکے تھے اس کی درخواست کی اور چونکہ وہ آرام اور سکون کے بیحد محتاج ہیں اس لئے کم سے کم ایک دن تو تاج محل ہوٹل ہی میں قیام کی اجازت دے دی جائے۔ وہ پریس کو ایک بیان دے رہے ہیں جس میں وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ہر دوست کو معلوم ہو جائے کہ وہ افغانستان کو صرف اسلام اور اپنے آبائی وطن کی خدمت کرنے کی غرض سے واپس جا رہے ہیں اور تمام دوستوں کو ان پر اتنا تو اعتماد کرنا چاہئے کہ انھیں اپنے ہی طریقے پر اس فتنے کے فرو کرنے کی مہلت دی جائے۔ اس نہایت اہم اور پر معنی فقرے کے بعد شوکت صاحب لکھتے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو امن و امان قائم کرا دے گا کیونکہ حب وطن کے ساتھ اس میں اس سے زیادہ محبت اسلام اور احترام اسلام بھی مجتمع ہے۔ وہ کارکنان خلافت

کے ساتھ نہایت بے تکلفانہ محبت سے پیش آئے اور خلافت والوں اور تمام مسلمانانِ ہند کا اس مہماں نوازی پر جو ان کے ساتھ کی گئی ہے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ وہ کل یا پرسوں بمبئی سے رخصت ہونگے اور صحیح وقت کی اطلاع بعد کو تار سے دی جائے گی۔ (ابھی شوکت کا دوسرا تار آیا کہ یہ محترم اور معزز بھائی آج ہفتے کے دن فرنٹیر میل سے روانہ ہو گئے اور ان کی خواہش ہے کہ میں چند اسٹیشنوں تک ان کے ہمراہ سفر کروں۔ چنانچہ میں اور غالباً مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا شفیع داؤدی صاحب اور سید مرتضیٰ صاحب حسب الارشاد ان کے ہمراہ چند گھنٹے کے لئے سفر کریں گے۔) شوکت صاحب یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ انھوں نے باوجود اپنی ناسازیٔ طبع مسجد جامع میں نماز جمعہ ادا کر کے مسلمانانِ بمبئی کے دل موہ لئے اور مسلمانوں کی طرف سے ان کا نہایت ہی زبردست استقبال ہوا۔ آخر میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ اسلام اور وطن کی خدمت کے بارے میں ایک ایسی ہستی سے اتنا پرجوش خراج تحسین ملنے پر ہم لوگوں کو بہت ہی مسرت ہوئی۔

اس سے بھی زیادہ اور مشرح بیان بمبئی کے حسب ذیل تار میں ہے جو ایک مقامی اخبار میں آج صبح شائع ہوا ہے۔ ایم۔ آر۔ نادر کے نام سے مارسیلز سے سفر کرتے ہوئے اور اپنے دو بھائیوں کو ہاشم اور ولی خاں کے ناموں سے سفر کر کے جنرل نادر خاں افغانستان کا اس گھڑی کے لئے موزوں ترین شخص آج صبح بمبئی میں "قیصر ہند" نامی جہاز میں تشریف آور ہوئے یہ تو ایک راز عیاں تھا کہ افغان جنرل افغانستان کے لوگوں کی دعوت پر اپنے دو بھائیوں کے ساتھ جو ایک زمانے میں اپنے ملک میں اہم حیثیت اور عہدے رکھتے تھے تشریف لا رہے ہیں۔ گذشتہ دو روز میں سب طرف سے لاسلکی مبارکبادیں اور

مرحبائیں آتی رہی ہیں اور ان کے جوابات جاتے رہے ہیں۔ مرکزی خلافت کمیٹی
کی جانب سے مولانا شوکت علی صاحب نے خلوص دل سے "خوش آمدید" کا پیغام
ارسال کیا تھا اور ان محترم مہمانوں کے ان کے قیام بمبئی کے زمانے میں میزبانی
کرنا چاہی تھی۔ جہاز کے آنے سے بہت پہلے ہی سے افغان قونصل اور ان کا
اسٹاف اور مولانا شوکت علی کی سرکردگی میں خلافت والے اور اخبارات کے
رپورٹروں کی ایک اچھی خاصی تعداد گودی پر منتظر تھی۔ انھیں کے ساتھ ساتھ
حکومت افغانستان کی رعایا کا ایک جم غفیر بلیرڈ پیر اور اس کے ارد گرد جمع تھا۔
حکومت بمبئی کی طرف سے مسٹر سی۔ ایف۔ کریک آئی۔ سی۔ ایس جہاز پر جنرل
نادر خاں صاحب کے کمرے ہی میں جاکر ان سے ملے اور دیر تک ان سے
گفتگو کرتے رہے۔ اس عرصے میں ان کے دونوں بھائی ہاشم خاں اور شاہ ولی خاں
نے جہاز کی بڑی نشست گاہ میں نہایت گرمجوشی کے ساتھ وفد خلافت سے
ملاقات کی اور رواں اردو میں ان سے فرمایا کہ انھیں ہندوستان اور مسلمانانِ
ہندوستان سے عشق ہے اس لئے کہ خود ان کی تربیت دہرہ دون میں ہوئی تھی
وہ اسلام اور اپنے آبائی وطن افغانستان کے خادم ہیں۔ وہ اپنی خدمات اپنے
ملک کو پیش کرنے والے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد جنرل نادر خاں صاحب اس
نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ یہ ایک طویل القامت دبلے پتلے بزرگ
ہیں جن کی عمر کوئی ۵۵ سال کی ہوگی۔ لباس سیاہ رنگ کا چھوٹے کوٹ والا
سوٹ تھا اور اپنے بھائیوں کی طرح وہ بھی افغانی ٹوپی اوڑھے تھے۔ نہایت
گرمجوشی کے ساتھ وفد خلافت سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ مولانا شوکت علی
صاحب کے ساتھ بغل گیر ہوئے اور ان کے رخسار کو اسلامی طریقے کے مطابق
بوسہ دیا۔ اس کے بعد مولانا شوکت علی صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور جمعیت خلافت

کا اس کی میزبانی کے لئے شکریہ ادا کیا مگر استدعا کی کہ انھیں ہوٹل ہی میں جانے کی اجازت دی جائے اس لئے کہ حال ہی میں وہ ذات الجنب مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور ذرا سی محنت کے باعث بھی اب تنفس میں دقت ہونے لگتی ہے اور پشاور کا لمبا سفر شروع کرنے سے پہلے وہ پورے سکون اور آرام کے سخت محتاج ہیں۔ حاضرین کو خطاب کر کے انھوں نے فرمایا کہ وہ سب کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے آبائی وطن کے بلاوے پر محض ایک مصالحانہ دعوت الی الخیر کی غرض سے آئے ہیں اور انھیں امید ہے کہ بفضل ایزدی سے وہ اس آگ کو جو افغانستان میں مشتعل ہے بجھانے میں کامیاب ہوں گے۔

انھوں نے حاضرین کو یقین دلایا کہ کوئی ذاتی غرض یا کوئی اور پوشیدہ غایت اس سفر میں ان کی محرک نہیں ہے۔ وہ اسلام اور اپنے ملک کی خدمت کرنے کے لئے واپس جا رہے ہیں۔ مولانا شوکت علی نے ان سے درخواست کی کہ آج جمعہ کی نماز میں شریک ہوں کیونکہ ہزاروں مسلمان ان کی ملاقات کے منتظر ہیں۔ اس پر جنرل نادر خاں صاحب فوراً مولانا ابو العارف محمد عرفان صاحب کی طرف مڑے اور ان سے دریافت فرمایا کہ ان کے بارے میں شریعت اسلام کا کیا حکم ہے۔ مولانا عرفان نے جواب دیا کہ مسافر اور مریض کے لئے نماز جمعہ فرض نہیں ہے لیکن اگر ممکن ہو تو وہ ہزاروں مسلمانوں کی آرزو کو پوری کریں اور انھیں مایوس نہ فرمائیں۔ اس پر جنرل صاحب موصوف کے بھائی شاہ ولی خاں بول اٹھے کہ ہاں ہمیں ضرور نماز جمعہ میں شریک ہونا چاہئے۔ جنرل صاحب نے دفعتے فرمایا کہ انھوں نے مولانا محمد علی کی اس دعوت کو کہ دہلی میں بھی کچھ قیام کیا جائے مجبوراً رد کر دیا ہے اور انھیں افسوس ہے کہ اس وقت اس دعوت کا قبول کرنا ان کے امکان میں نہیں۔

اس کے علاوہ ایک تار ایسوشی ایٹڈ پریس نے بھی ارسال کیا ہے جس میں ذیل کے فقرے خاص طور پر قابل ملاحظہ و غور و فکر ہیں "جو آگ میرے وطن میں کچ لگی ہوئی ہے اس پر پانی ڈالنا ہی میرا مقصد ہے، اسلام اور اپنے وطن کی خدمت کے مخلصانہ ارادے کے سوا کوئی چیز بھی مجھے اس وقت واپس نہیں لائی ہے، اپنی ذات یا اپنے خاندان کے متعلق ذرا سا بھی خیال اس نازک موقع پر ایک انتہائی خود غرضی ہوتی۔ میں کلیتہً ایک دعوت الی الصلح والخیر کے لیے احرام سفر باندھ کر نکلا ہوں اور کوئی ذاتی غرض یا نیت نہیں رکھتا۔ میں مکرر عرض کرتا ہوں کہ میری غرض اپنے ملک اور اپنے مذہب کی خدمت کرنا ہے اور میں آگ بجھانے کے لیے خداوند کریم کی مدد کا طالب ہوں۔ میرے پاس بہت سے تار تحیۃ و ترغیب کے آئے ہیں (اور یہ کہہ کر انھوں نے لاہور کا ایک تار دکھایا) مجھ سے کہا گیا ہے کہ تم قندھار جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ میرے دوست مجھے باور فرمائیں گے اگر میں عرض کروں کہ میں اپنے وطن کو خوب جانتا ہوں، میں اس کا مستحق ہوں کہ مجھ پر اعتماد کیا جائے کہ میں اس راستے کو پسند کروں گا جسے میں سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔ جو چیز میں سب سے پہلے ملحوظ خاطر رکھتا ہے وہ اس آگ کو جو افغانستان میں اس وقت دہکی ہوئی ہے بجھانا ہے"۔ جو بیان جنرل صاحب موصوف نے پریس کو دیا ہے وہ حسب ذیل ہے :-

"افغانستان میں جس غلط فہمی نے موجودہ اندرونی نفاق اور فساد پیدا کر دیا ہے وہ نہایت افسوس ناک ہے اور اگر ان حالات کو دیر تک قائم رہنے دیا گیا تو نہ صرف افغانستان کی آزادی اور اس کے استقلال کی بنیادیں ہل جائیں گی بلکہ بیرونی دنیا کا امن و امان بھی جس کا قیام و دوام تمام آزاد اور مستقل اقوام کا

اولین مقصد ہے خواہ وہ جمعیۃ امم کے اعضاء ہوں یا نہ ہوں معرض خطر میں پڑ جائے گا۔
میں باوجود اپنی صحت کی خرابی کے اپنے ملک کو ایک وفا شعار افغان کی طرح
واپس جا رہا ہوں اور میرے دونوں بھائی اسے اپنا فرض محسوس کرتے ہیں کہ
اس نازک موقع پر جو کچھ خدمات ہم کر سکیں اسے کرنے میں دریغ نہ کریں۔ یہ میری
خشوع و خضوع کے ساتھ خدائے بزرگ و برتر سے التجا ہے کہ وہ افغانستان کو
بچائے اور اسے ہمیشہ ایک ایسے آزاد اور مستقل ملک کی حیثیت سے قائم و
محفوظ رکھے جس کے تعلقات تمام دیگر ممالک سے خوش گوار ہوں اور ہمیں توفیق
عطا فرمائے کہ ہم وہ سچی اور مناسب اور بے لوث خدمات اپنے ملک کے لئے
پیش کریں جس کا وہ محتاج ہے۔ میں اور میرے اعزہ و اقربا افغانستان پر
حکومت کرنے کی ذرا سی بھی خواہش نہیں رکھتے نہ وہ اس کے تخت و تاج کے
لئے کسی قسم کا دعویٰ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری ایک ہی خواہش ہے اور وہ یہ
ہے کہ فوراً صلح ہو جائے اور تمام جنگ و جدل فوراً روک دی جائے اور ہم
افغانستان کو صرف اپنی خدمات اور اپنا مشورہ پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم لوگوں
کے ذاتی اختلافات کا خاتمہ ہو جائے اور ہم سب مل کر اپنے ملک کی عزت و احترام
کو ترقی دیں اور اسے اس وقت کے اندرونی بغض و عناد سے نجات دلائیں اور
اس ذریعے سے ایک بابرکت اسلامی حکومت کی بنیاد رکھیں جو اتنی مضبوط ہو
کہ افغانستان میں امن و آزادی کی ضامن ہو سکے۔"

میں نے ان تاروں کو آج خبروں میں شائع نہیں ہونے دیا ہے بلکہ
ان کو اپنے خیالات کا ترجمان سمجھ کر اسے مقالۂ افتتاحیہ میں درج کر رہا ہوں۔
ٹیلیفون پر بھی اس کی تصدیق کر دی گئی ہے کہ اس نازک گھڑی میں خداوند کریم
جس بطل عظیم کو اپنے وطن مالوف کو پھر بھجوا رہا ہے اس کے بھی ہنگامۂ افغانستان

کے متعلق لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف وہی خیالات ہیں جن کا ہم دبی زبان سے اظہار کر چکے ہیں اور میری اس بطل عظیم کی خدمت میں جس نے جنگ استقلال کے زمانے میں غیروں کے ملک کے ایک حصے پر ٹھیک اسی وقت قبضہ کر لیا تھا جب ڈکہ پر غیروں کا قبضہ ہو رہا تھا اور کابل میں بعض لوگ غیروں کے ہوائی جہاز کے خوف سے "گم شو" "گم شو" کہتے ہوئے ہر طرف کو سراسیمہ اور پریشان ہو کر بھاگ رہے تھے اور جس کے ٹھل پر قبضہ کر لینے ہی نے افغانستان کو اعلیٰحضرت شاہ امان اللہ خاں کے عہد کے شروع ہوتے ہی استقلال اور آزادی کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا صرف یہی استدعا ہے کہ وہ ہندوستان کے کسی تار پر توجہ نہ کرے خواہ وہ دہلی کا ہو یا لاہور کا یا پشاور کا بلکہ خدا سے دعا کرے کہ اسے اپنے مذہب، اپنی ملت اور اپنے ملک کی بہترین خدمت کی توفیق عطا ہو اور تائید ایزدی کے ساتھ اللہ کا نام لے کر آگے قدم بڑھائے، اپنے کافی وافی تجربے سے کام لے اور ان جدیدہ نگاروں کی بکواس سے بے نیاز و مستغنی رہے جو ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنے ملک کو آزاد نہ کرا سکے حالانکہ اس نے اور اس کے بادشاہ نے خداوند کریم کی مدد اور اپنی قوت دماغ و قوت بازو سے ڈیڑھ کروڑ باشندگان افغانستان کو آزادی کی دولت دلوا دی اور مدتوں کی ہجرت کے باعث اگر ملک کے موجودہ حالات سے کسی قدر بے خبر ہے تو خود جا کر تحقیقات کرے، اخبار و اجانب کی اجازت سے ہم تک پہنچے ہوئے متضاد افواہوں پر ایمان بالغیب نہ لائے اور اس آیۂ کریمہ پر عمل کرے خواہ پنجاب کے اخبارات "فاصلحوا بین اخویکم" کے دائرۂ عمل سے "بچہ سقہ" کو لاکھ بار باہر نکال کر کیوں نہ پھینک دیں اور اپنی بے دینی کا کیوں نہ ثبوت دیں کہ "یا ایہا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنباءٍ فتبینوا

ان تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نٰدمین" (اے ایمان والو اگر تمہارے پاس کوئی گنہگار خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو کہیں کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو، پھر کل کو لگو اپنے کیے پر پچھتانے)

نہ شاہ امان اللہ خاں کافر ہیں نہ "بچہ سقہ" اور دونوں مسلمان ہیں اور ایک دوسرے کے بھائی اور چاہے شاہ امان اللہ خاں کے "بچہ سقہ" کا خروج جائز ہو یا جائز، چاہے شاہ حبیب اللہ خاں کے خلاف آج امان اللہ کا خروج نا جائز ہو یا جائز تمہارے لئے صرف ایک حکم ہے اور وہ یہ ہے کہ :-

"وان طائفتٰن من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینہما فان بغت احدٰہما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیٓء الیٰ امر اللہ فان فاءت فاصلحوا بینہما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین ۝ انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون ۝" (اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو، پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھ جائے تو تم سب اس چڑھائی والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے اور اگر پھر آئے تو ان میں عدل کے ساتھ ملاپ کرا دو اور انصاف کرو، بیشک اللہ انصاف والوں سے محبت فرماتا ہے، جو بھی مسلمان ہیں سو بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کرا دو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔)

یقیناً افغانستان میں مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ رہے ہیں لیکن کون ہے جو اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ خود ثالث بالخیر بن کر صلح کی دعوت ان دونوں گروہوں کو دے چکا ہے اور اب اس کا فیصلہ کرے گا کہ حق سے روگردانی کس گروہ نے کی اور کونسی جماعت "فئۃ باغیہ" ہے۔ اب تک ہندوستان والوں کو تو سارا دار و مدار نبا فاسق پر رہا ہے، تبیّن کی نوبت

اس وقت آئے گی جب کوئی وفد مصالحت کے لیے جاکر تحقیقات کرے گا یا جب جنرل نادر خاں صاحب ثالث بالخیر کا فرض انجام دیں گے۔ یقیناً جنرل نادر خاں صاحب لاہور والوں سے افغانستان کا راستہ بہتر ہی جانتے ہیں اور ہمیں ان پر اعتماد ہے کہ وہ اس اعلان کے بعد وہی راستہ اختیار کریں گے جو امن و صلح کا راستہ ہوگا اور افغانستان میں ایک مضبوط حکومت اور آزادی کے قائم رکھنے کا۔ وہ اللہ کا نام لیں اور اسی راستے پر قدم بڑھائیں بقول شاعر ؎

عظمت بڑے بڑے ہیں نخرے راہ عشق میں
چل تو سہی بڑھا تو قدم، دیکھ تو سہی

(۳) نادر موقع اور نادر مرد

سپہ سالار نادر خاں سے ملاقات

ہمدرد ۔ ۷ر فروری ۱۹۲۹ء

جیسا کہ میں "ہمدرد" مورخہ ۴ر فروری میں ظاہر کر چکا ہوں کہ مولانا شوکت علی کا یہ تار ہفتہ کے دن ملا تھا کہ جنرل نادر خاں صاحب اور ان کے دونوں بھائی اسی دن فرنٹیر میل سے روانہ ہو رہے ہیں اور دہلی سے اتوار کے دن بعد دوپہر گذریں گے اور ان کی خواہش یہ ہے کہ میں بھی چند اسٹیشنوں تک ان کے ہمراہ سفر کروں۔ اسی دن میں نے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کا بھی جنرل صاحب موصوف کے ہمراہ تشریف لے چلنا مناسب ہوگا۔ چنانچہ باوجود طبیعت کی سخت ناسازی کے مولانا نے میری درخواست قبول فرمالی۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب ممبر اسمبلی بھی اسی دن مجھ سے ملے اور میں نے انھیں بھی اپنا ہمسفر بننے پر آمادہ کیا اور ان سے مولوی محمد شفیع داؤدی اور مولوی سید مرتضےٰ صاحب ممبران اسمبلی کو بھی اس پر آمادہ کرنے کا وعدہ لیا۔ اتوار کو بارہ بجے میں اسٹیشن کی طرف چلا اور اگرچہ وہاں پہنچ کر چند افغانوں اور چند مسلمانوں کو سپہ سالار غازی کا منتظر پایا مگر نہ مفتی صاحب موصوف اس وقت تک تشریف لائے تھے، اس اندیشے سے کہ تھوڑی ہی دیر میں اسٹیشن پر بڑی بھیڑ ہو جائے گی اور ٹرین تک راستہ ملنا آسان نہ رہے گا میں نے اپنے لئے ٹرین کی آمد کے وقت معینہ سے دس پندرہ منٹ پیشتر ہی

ٹکٹ خرید لیا اور اس خیال سے کہ سپہ سالار غازی کی طبیعت ناساز ہے دہلی کے اسٹیشن کے ہجوم کے بعد ہی چند اسٹیشنوں تک ان کو اپنی صحبت سے پریشان کرنا مناسب نہ ہوگا فیصلہ کر لیا کہ ٹکٹ لاہور تک کا لے لیا جائے اور راستے میں کسی مناسب موقع پر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ملاقات کرنی چاہیئے۔

جناب مفتی صاحب ساڑھے بارہ بجے سے کچھ ہی پیشتر تشریف لائے اور میرے عرض کرنے پر آپ نے بھی لاہور تک کا ٹکٹ منگوا لیا۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب، مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی اور مولوی سید مرتضیٰ صاحب عین اس وقت تشریف لائے جبکہ ٹرین باوجود پندرہ منٹ لیٹ ہونے کے آرہی تھی اور جلد جلد ان سے عرض کیا گیا کہ وہ سب حضرات بھی لاہور تک ہم لوگوں کے ہمراہ چلیں۔ اتنے میں ٹرین آگئی اور اب کوئی سو آدمیوں کا پلیٹ فارم پر ہجوم ہوگیا جو سپہ سالار غازی کے دیکھنے کے لیے بیقرار تھے اور مجھے پتہ نہیں چلا کہ مذکورہ بالا ممبران اسمبلی نے بھی ٹکٹ خریدے یا نہیں اور خریدے تو کہاں تک کے اور کس کمرے میں انھیں جگہ ملی۔ خود میں نے سپہ سالار غازی کے قریب ایک کمرے میں جہاں دو انگریز پہلے سے موجود تھے ایک اوپر کے "برتھ" پر اپنا سامان رکھوا دیا اور اس کے بعد صاحب موصوف کے کمرے کی طرف بڑھا۔ افسوس ہے کہ مشتاقان دیدار و گفتار مصافحہ و دست بوسی نے حسب دستور اہل ہند کے فقدان نظم کا پورا مظاہرہ کیا حالانکہ خلاف توقع ان کی جماعت اس قدر مختصر تھی کہ اگر نفسا نفسیت اور خواہش امتیاز کے باعث اتنی کش مکش نہ ہوتی تو ہر شخص اچھی طرح دیدار بھی کر سکتا تھا، گفتار بھی سن سکتا تھا بلکہ کر بھی سکتا تھا، مصافحہ بھی کر سکتا تھا بلکہ دست بوسی اور معانقہ بھی، مگر اتنا صبر کہاں، اتنا ضبط کس میں اور نظم کا اتنا شعور کسے۔ تاہم ان بھائیوں کا مشکور ہوں کہ میرے لئے پھر بھی اتنا

راستہ نکال دیا کہ میں سپہ سالار غازی کو مطلع کرسکوں کہ میں پاس کے کمرے ہی میں سفر کر رہا ہوں اور لاہور تک جا رہا ہوں جب مناسب خیال فرمایا جائے میں حاضر ہوسکوں گا۔ مگر میں جوں ہی سپہ سالار غازی کے کمرے کے دروازے پر پہنچا انھوں نے مجھے پہچان لیا اور اندر بلالیا۔ ان کے کمرے میں علاوہ ان کے دونوں بھائیوں کے کم از کم آٹھ دس شائقین اور موجود تھے اور میں بعض کا تعارف بھی کراسکا۔ اس کے بعد سپہ سالار غازی نے اسی قسم کے چند الفاظ حاضرین کو مخاطب کرکے فرمائے جو بمبئی کے تاروں میں شائع ہوچکے تھے اور اپنی بیماری اور نقاہت اور تنفس کی دشواری کا عذر کرکے زیادہ طویل تقریر کرنے سے معافی چاہی۔ اب گاڑی چلنے والی تھی اور اسٹیشن ماسٹر نے مجھ سے کہا کہ شائقین کو ٹرین سے کسی قدر ہٹا دیا جائے ورنہ حوادث کا اندیشہ ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان حضرات کو جو اس ٹرین میں سفر نہ کرنے والے تھے سپہ سالار موصوف کے کمرے سے چلے جانے پر راضی کیا اور اس سے زیادہ مشکل سے ان حضرات کو پلیٹ فارم کی دوسری طرف کی کھڑکیوں کو چھوڑنے اور نیچے اترنے پر راضی کیا جو ان کھڑکیوں کو پکڑے ہوئے تھے اور سپہ سالار غازی کے کمرے سے چمٹے ہوئے تھے۔ میں خود بھی پلیٹ فارم کی طرف سے دوبارہ راستہ کرانے سے مایوس ہوکر دوسری طرف سے نکلنا چاہتا تھا تاکہ اپنے کمرے میں چلا جاؤں مگر یہ بھی آسان نہ تھا اور سپہ سالار غازی اور ان کے بھائیوں نے اصرار فرمایا کہ انھیں کے پاس بیٹھا رہوں۔

چنانچہ جب ریل چلی تو مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور میں دونوں اسی کمرے میں تھے مگر جو میرا ن اسبلی تشریف لائے تھے وہ اتر چکے تھے۔ ہمارا قیاس تھا کہ وہ ہمارے کمرے میں جا بیٹھے تھے مگر دوسرے اسٹیشن پر ان کو پکارا تو صدائے برنخاست؛ اور رہتک پر جب ہم اتر کر ایک اور کمرے کی تلاش میں

گاڑی چھوٹ چکے تو مہر صاحب اور سالک صاحب کو تلاش کر کے ان کے ہمراہ دفتر "انقلاب" جائیں اور ناخواندہ مہمان بنیں یا پھر ڈاکٹر اقبال کے ہاں چلے جائیں۔ ٹرین وقت مقررہ سے پورے گھنٹے بھر بعد پہنچی تھی اور لطف یہ ہے کہ اب تک سپہ سالار غازی اور ان کے بھائیوں نے کھانا بھی تناول نہیں فرمایا تھا۔ میں نے جاکھل کے اسٹیشن پر جانے سے انکار کر کے ریسٹورنٹ کار کے خانساماں سے بٹھنڈے پر افطار کے لئے چائے منگائی تھی اور اسی وقت اس سے مفتی صاحب کے لئے چپاتیوں اور قلیے کی بھی فرمائش کر دی تھی اور اپنے محترم ہم سفروں کے لئے بھی ایک بڑی میز پہلے ہی سے رکوالی تھی مگر اسی اسٹیشن پر سید حبیب شاہ صاحب "ایڈیٹر سیاست" کے بھائی مفتی صاحب سے سپہ سالار غازی کو پوچھتے ہوئے ان کے کمرے تک گئے تھے اور جب ہم فیروزپور پر کھانا کھانے کے لئے ریسٹورنٹ کار میں جانے کے لئے اترے تو معلوم ہوا کہ وہ سپہ سالار غازی اور ان کے بھائیوں کو مدعو کر چکے تھے اور لاہور کے اسٹیشن پر کھانا آنے والا تھا۔ گیارہ بجنے میں تھوڑی ہی سی دیر تھی کہ ٹرین لاہور سے چلی اور اس وقت تک سپہ سالار غازی اور ان کے بھائیوں نے کھانا نہیں تناول فرمایا تھا اور جب گاڑی چھوٹ چکی تو ہمیں معلوم ہوا کہ چند حضرات لاہور کے اسٹیشن پر انہیں کے کمرے میں نزول فرما چکے تھے اور جب گاڑی چھوٹی تب بھی اسی میں موجود تھے۔ نہ معلوم ذات الصدر کے اس مریض کو جس کی ناسازیِ طبع کو اور جس کی نقاہت کو ہم خود اپنی آنکھوں سے اچھی طرح دیکھ چکے تھے کھانا کس وقت نصیب ہوا اور آرام اور سونا کب میسر آیا۔ میرا قیاس ہے کہ سپہ سالار نادر خاں کو ٹھل تک پہنچنے میں اس قدر دقت محسوس نہ ہوئی ہوگی جس قدر پشاور تک پہنچنے میں لیکن جس حسن اخلاق سے وہ سب کے ساتھ راستے بھر پیش آتے رہے

اس سے ان کے تدبر کا ہمارے دلوں پر ایک گہرا نقش بیٹھ گیا اور ہم نے دیکھ لیا کہ نادر خاں ایک غازی سپہ سالار نہیں ہے بلکہ ایک زبردست مدبّر بھی ہے اور اگر ان کے لئے حسن تدبیر اور ہمت و شجاعت دونوں سے کام لینے کا یہ ایک نادر موقع ہے تو اس نادر موقع کے لئے ایک نادر مرد بھی ہے۔

میں لاہور اسٹیشن کی کشاکش کے متعلق زیادہ نہیں لکھنا چاہتا لیکن چونکہ لاہور کے ایک اخبار نے اپنی ۷ ؍ فروری کی اشاعت میں "علی برادران کی اسلام دشمنی" کے عنوان سے ایک طول طویل اور حسب معمول سراسر دروغ بیانی اور افترا پردازی سے معمور مضمون کے خاتمے پر اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ مجھ پر لاہور اسٹیشن پر آوازے کسے گئے اور میرے "ہم خیال" کی نوجوانوں کے ہاتھوں بُری گت بنی اس لئے مجبور ہو کر اتنا اور عرض کئے دیتا ہوں کہ نہ میں ان صاحب کا ہم خیال ہوں نہ وہ میرے ہم خیال ہیں جن کی پگڑی لاہور کے اسٹیشن پر "پنجابی ٹولی" کے ہم خیال چند لفنگوں نے اچھالی۔ یہ جماعت ہم پر بھی الزام تھوپنے کی پوری کوشش کر چکی ہے کہ ہم نے اسی طرح کلکتے میں مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے میں اس کی بری گت بنوائی۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے اور حسب دستور اس کی افترا پردازی ہے لیکن اگر کسی کو اس کے اور اس کے کارفرما حضرات کے اس طول طویل بیان پر جو کلکتے کے تمام اخبارات میں شائع کرنے کے لئے اواخر دسمبر میں ارسال کیا گیا تھا اور ان میں حرف بحرف شائع کیا گیا اعتماد ہو تو یقیناً وہ آج اس مضمون کے حسنِ خاتمے سے زائل ہو جائے گا کیونکہ یہ "ٹولی" جس طرح دوسروں کی شکایت کرنے کی عادی ہے اسی طرح خود لفنگے پن کی بھی عادی ہے اور ان گم کردہ راہ نوجوانوں کی علی الاعلان حمایت کرتی ہے جنھوں نے اس اخبار کے مالک کے ایک رقیب کی پگڑی اچھالی اور جنھوں نے میری ٹیکسی کے اسٹیشن سے

روانہ ہوتے وقت "کومی غدار" "محمد علی کومی غدار" کے آوازے کسے۔ دوسرے دن افطار کے وقت بھرے مجمع میں لاہور ہی کے ایک صاحب نے فرمایا کہ اس اخبار کے "آقائے نامدار" سپہ سالار غازی کی ٹرین کے آنے سے پہلے اسٹیشن پر ایک دہلی کے پرچے میں سے کوئی چیز پڑھ کر سنا رہے تھے جسے میری مسجد جامع کی تقریر کہا جاتا تھا اور جو ان کے پرچے میں بھی شائع کی گئی ہے اور جو میری طول طویل تقریر کا حسب معمول ایک ناقص خلاصہ ہے نہ کہ بالفاظہ میری تقریر ہے۔ کاش ان صاحب کو اس کی بھی خداوند کریم توفیق دیتا کہ وہ اپنی "ٹولی" کو یہ بھی بتا دیتے کہ مسجد جامع کی تقریر کے تمام سامعین نے میری رائے سے کامل اتفاق کیا تھا اور میں نے حالات موجودہ افغانستان کے تمام پہلوؤں کو سمجھا کر اور مختلف رایوں کو ان کے سامنے پیش کر کے ان میں سے ہر جماعت کی رائے دریافت کی تھی اور سب کو بلا کسی انتشار کے اپنی رائے کا حامی پایا تھا۔ یہ تو ٹرین کے آنے سے پیشتر کا اور والد بزرگوار کا حال تھا اب ٹرین کے جانے کے بعد کا اور فرزند خوردار کا حال سنیے۔ انھیں راوی کا بیان ہے کہ وہ لاہور کے ایک انگریزی اخبار کے مالک کے ہمراہ موٹر میں روانہ ہونے سے پیشتر اس "ٹولی" کے چند نوجوانوں سے بہت کچھ میرے متعلق طنزآ فرماتے گئے اور ان کے جاتے ہی ان لوگوں نے زمین پر سے کوئی چیز اٹھالی خاک تھی یا غلاظت؟ یہ وہ اندھیرے کے باعث نہیں کہہ سکتے لیکن جوں ہی وہ میری ٹیکسی پر اسے پھینکنا چاہتے تھے ایک شخص نے چھڑی نکال کر ان کو روکا اور وہ کوئی افغان تھا۔ یہ لاہور ہی کے ایک مسلمان کی روایت ہے ع

یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

یہ مضمون بہت طویل ہو گیا ہے اور میں سپہ سالار غازی سے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور اپنی دو تین گھنٹوں کی ملاقات کے متعلق ابھی اس سے

زیادہ کچھ نہیں کہنے پایا ہوں کہ انھوں نے دہلی کے اسٹیشن سے نکلتے ہی اہل ہند کے ضبط و نظم کے فقدان کا دکھڑا ہمارے سامنے رو دیا اور اسی سلسلے میں میں یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ وہ ہمارے اخبارات کے سب دشنام اور گالم گلوج کا نوحہ پڑھتے ہوئے پشاور گئے ہیں اور ان دونوں باتوں میں وہ مجھ سے بھی زیادہ اہل ہند اور بالخصوص مسلمانان ہند سے اگر مایوس نہ بھی ہوں تو شاکی ہیں۔ میں اس ملاقات کا ذکر انشاء اللہ کل کے "ہمدرد" میں بھی کروں گا گو اتنا تو آج ہی عرض کر دوں کہ سب گفتگو ہرگز نہ دہرائی جائے گی۔ سپہ سالار غازی اور ان کے بھائیوں کو ہماری معاملہ فہمی پر یقیناً اتنا اعتماد ضرور تھا کہ انھوں نے کھل کر گفتگو فرمائی اور سمجھ لیا کہ ہم اس کی اس سے کچھ زیادہ ہی قدر کریں گے کہ اس کو "الجمعیۃ" یا "ہمدرد" میں شائع کر کے چند پرچے زیادہ بیچ لیں۔ لیکن ان کے دو اہم ترین فیصلے ضرور اس کے مستحق ہیں کہ ان کا آج ہی ذکر کر دیا جائے۔ ایک یہ ہے کہ وہ باوجود اس سلوک کے جو خود ان کے ساتھ کیا گیا تھا ہرگز اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں کے خلاف نہیں ہیں مگر وہ پہلے خدمت اسلام، پھر افغانستان اور اس کے استقلال و آزادی کے قیام کی کوشش کرنے جا رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ کسی کا نام لے کر کہیں کہ وہ صرف اسی کو افغانستان کا حکمراں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا دوسرا اہم ترین فیصلہ یہ ہے کہ خواہ کوئی بھی افغانستان کا حکمراں ہو وہ شخص ہرگز نادر خاں یا اس کا کوئی عزیز نہیں ہوگا۔ اس پر انھوں نے اس قدر جوش و خلوص کے ساتھ میرے سامنے اظہار رائے فرمایا کہ میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور میں نے ان کے ہاتھ کو پکڑ کر چوم لیا اور آنکھوں سے لگایا اور عرض کیا کہ گذشتہ جمعہ کو جب مسجد جامع میں میں نے ان کے اوصاف حمیدہ حاضرین کو سنائے تھے اور ایک صاحب نے چند اخبارات کی تقلید کر کے کہا تھا کہ پھر انھیں کو کیوں نہ شاہ افغانستان بنا دیا جائے۔

تو میں نے کہا تھا کہ مجھے ان کا بدخواہ نہ بناؤ۔ آپ شاید کسی کو افغانوں کا بادشاہ بنانا اس کی خیر خواہی سمجھیں لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں ملوکیت کو خلاف اسلام اور مسلمانوں کے زوال کا ایک بہت بڑا سبب سمجھتا ہوں اور صرف خدا ہی کو "ملک الحق"، "ملک القدوس" اور "ملک الناس" سمجھتا ہوں اور "ان الحکم الا للہ" ہی پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں کیوں نادر خاں صاحب کو گنہگار بنانا چاہوں گا۔

میں نے تو اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں کی تعریف میں بھی دسمبر ۱۹۲۷ء میں ان کے سفر یورپ کے لئے بمبئی میں ورود کے وقت ایک انگریزی اخبار میں شائع کرایا تھا کہ وہ اگر افغانستان کی بادشاہت کو اپنے آباء و اجداد کا ترکہ تسلیم نہ کریں اور اس سے دست بردار ہو کر جمہوریت کا اعلان کر دیں تو مجھے یقین ہے کہ ان کی رعایا ان کو صدر جمہوریت منتخب کرے گی۔ افسوس کہ آج وہ افغانستان میں اس قدر ہر دل عزیز نہیں جتنے کہ ان اصلاحات سے پیشتر تک باوجود خوست کی بغاوت کے وہ ہر دل عزیز تھے لیکن میری تو ان کے لئے اب بھی یہی دعا ہے کہ وہ اور باشندگان افغانستان پھر شیر و شکر ہو جائیں اور افغانستان میں انھیں کی حکومت پھر قائم ہو اور اسلام اور آزادی دونوں کا وہاں ہمیشہ ہمیشہ جھنڈا اونچا رہے۔ قارئین کرام کل کے مفصل تر مضمون کا انتظار فرمائیں اور آج اسی پر کفایت کریں کہ ہمارے قلوب پر سپہ سالار غازی کے تدبر اور معاملہ فہمی کا بے حد اثر پڑا ہے اور ہم کو ان پر پورا اعتماد ہے کہ وہ بہ تائید ایزدی افغانستان کے فتنے کو ضرور فرو کر سکیں گے اور انھیں ہم سے "قندھار چلو" یا "کابل جاؤ" کے احکام لینے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ میں تنا اور بھی عرض کر دوں کہ انھوں نے صاف الفاظ میں فرمایا کہ اعلیحضرت شاہ امان اللہ کی تائید میں جو طریق کار ہمارے اخبارات نے اور ان کی اندھی تقلید میں عوام کے ایک حصے نے اختیار کیا ہے

وہ اعلیحضرت کے لیے سخت مضر ثابت ہوگا اور خدا اعلیحضرت کو ان کے ان نادان دوستوں سے بچائے۔ کاش یہ اخباری دنیا اصولی دنیا بننے کی کوشش کرتی اور سپہ سالار غازی سے جو محض کچھ اس سے متاثر نہیں ہوسکتے نہ صرف قلم چلانے والوں کے مداح ہوسکتے ہیں بلکہ جو صاحب قول ہی نہیں صاحب عمل بھی ہیں اور اہل زبان و قلم ہی نہیں اہل سیف بھی ہیں صبر اور ضبط اور نظم قائم کرنے اور قائم رکھنے کا سبق سیکھتے اور بے کار ہی نہیں مضرت رساں طرف داری سے محترز رہ کر ان لوگوں کو جو ان سے بدرجہا زیادہ افغانستان کے صحیح واقعات اور حالات اور افغانوں کے عادات و خصائل سے واقف ہیں اس آگ کو بجھانے دیتے اور اس پر اپنی طرف داری کا تیل اور نہ چھڑکتے نہیں ان کے تدبر ہی کا قائل نہیں ہوا بلکہ ان کی بے نفسی اور حب وطن کا بھی بے حد قائل ہوا لیکن جن لوگوں سے اس کی بھی بمشکل توقع ہوسکتی ہے کہ وہ تدبیر سے کام لیں ان سے بے نفسی اور خود غرضی و بے لوثی کی کیا خاک امید ہوگی۔ خدا ان پر، ہم پر، افغانستان پر اور عالم اسلام پر رحم فرمائے۔

(۴۱) سپہ سالار نادر خاں سے گفتگو

ہمدرد یکم مارچ ۱۹۲۹ء

اس عنوان سے کل کے "ہمدرد" میں میں نے سپہ سالار غازی اور ان کے دونوں بھائیوں سے ملاقات کے متعلق ظاہر کیا تھا کہ سب سے پہلی بات جو سپہ سالار غازی کے منہ سے دہلی اسٹیشن سے گاڑی کے روانہ ہونے کے بعد ہی نکلی تھی وہ ہماری بے صبری اور ہمارے ضبط و نظم کے فقدان پر جو مشتاقانِ دیدار و گفتار کے مظاہرے سے ان پہ عیاں ہوئے تھے ان کا بے حد افسوس تھا اور اسی سلسلے میں میں نے عرض کیا تھا کہ ان کے بھائی سردار شاہ ولی خاں صاحب ہمارے اخبارات میں سب و شتم کی بوچھار اور گالم گلوچ پر بھی نوحہ خواں تھے۔ آخر میں باوجود مضمون کی طوالت کے، میں نے قارئین کرام کے اشتیاق کو مدنظر رکھ کر سپہ سالار غازی کے دو اہم ترین فیصلوں کو پورے اختیار کے ساتھ شائع کر دیا تھا تاکہ ان کے اور ان کے مساعی کے متعلق کسی کو غلط فہمی نہ ہونے پائے اور ان سے نہ کوئی ایسی توقعات رکھے جن کے پورا کرنے کی انھوں نے کوئی ذمہ داری نہیں لی ہے، نہ ان پر اس قسم کی کوئی بدگمانی ہی کرے جن سے ان کی مساعی جمیلہ کے ناکام رہ جانے کا اندیشہ ہو۔

پنجاب کے بعض اخبارات میں لاہور کے اسٹیشن پر سپہ سالار غازی کی تقریر کی جو رپورٹیں کل اور آج نظر سے گذریں انھوں نے اور بھی مجبور کر دیا ہے کہ صاف صاف اس کا اظہار کر دیا جائے کہ اگرچہ باوجود اس سلوک کے جو خود ان کے ساتھ کیا گیا تھا سپہ سالار غازی ہرگز شاہ امان اللہ خاں کے خلاف نہیں ہیں تاہم وہ پہلے خدمت اسلام، پھر خدمت افغانستان اور اس کے استقلال و آزادی کے قیام

کی کوشش کرنے جارہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ کسی کا نام لے کر کہیں کہ وہ صرف اسی کو افغانستان کا حکمراں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر واقعی پنجاب کے بعض اخبارات کی وہ رپورٹیں صحیح ہیں جن میں سپہ سالار غازی سے اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں کو تخت افغانستان پر بٹھانے کا مصمم ارادہ صاف صاف ظاہر فرمایا ہے تو مجبوراً یہی قیاس کرنا پڑے گا کہ لاہور اسٹیشن کی "پرجوش" جماعت نے سپہ سالار غازی کو معذبہ دیا اور ان سے زبردستی وہ چیز کہلوادی جو وہ کہنا نہیں چاہتے تھے۔ طلبائے اسلامیہ کالج پشاور اور سرحدی افغانوں کی ایک جماعت کے سامنے سپہ سالار غازی نے جو کچھ فرمایا وہ اسی کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ اپنے تئیں اس کا پابند ظاہر کرنا نہیں چاہتے، کہ فلاں شخص ہی کو وہ افغانستان کا حکمراں دیکھنا چاہتے ہیں اور کسی اور کی حکومت پر وہ ہرگز راضی نہ ہوں گے اور ان کے چھوٹے بھائی سردار ہاشم خاں صاحب نائب سالار نے بھی جو بیان ایسوشی ایٹڈ پریس کے نمائندہ کو اس صاف اور سیدھے سوال کے جواب میں دیا ہے وہ بھی سپہ سالار غازی کے ان الفاظ کی تصدیق کرتا ہے جو ریل کے سفر میں انھوں نے فرمائے تھے اور جن کا خلاصہ میں نے کل کے "ہمدرد" میں نہایت ضروری سمجھ کر شائع کر دیا ہے۔ ان کے دوسرے اہم ترین فیصلے پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اس کے متعلق کسی نے اب تک شک و شبہے کا اظہار ہی نہیں کیا ہے، اگر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں جس جوش اور خلوص کے ساتھ انھوں نے فرمایا کہ خواہ کوئی بھی افغانستان کا حکمراں ہو وہ شخص ہرگز نادر خاں یا اس کا کوئی عزیز نہیں ہوگا۔ اس نے مجھ پر بے حد گہرا اثر کیا اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسمی انکسار نہ تھا بلکہ اس مدبر اور محب وطن نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ وہ اس مصیبت کے وقت اپنے ملک کی اور اسلام کی بہترین خدمت اسی ذقت کر سکتا ہے جب کہ وہ ہر شخص کو اپنی بے نفسی اور خود غرضی سے بالکل بے لوثی

کا پوری طرح یقین دلا سکے۔

سپہ سالار غازی کے یہ صریح الفاظ تھے کہ اگر سارا افغانستان متفق ہو کر بھی مجھ سے کہے کہ ہم تو صرف تمھیں کو پسند کرتے ہیں اور تمھارے سوا کسی کی بھی اطاعت نہ کریں گے تمھیں شاہ افغانستان بن جاؤ تو میں ان سے کہہ کر کہ "تم جانو تمھارا کام جانے" میں اب تم سے ہاتھ دھوتا ہوں اور افغانستان کو چھوڑ کر چلا جاتا ہوں " افغانستان سے پھر ہجرت کر جاؤں گا۔ اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں کے اعلان دست برداری کے بعد جو طوائف الملوکی بظاہر افغانستان کے مختلف قبائل اور اس کی مختلف سمتوں میں رونما ہوئی یقیناً اسی نے سپہ سالار غازی کو ان صریح الفاظ میں اور اس قدر شد و مد کے ساتھ ہر حالت میں افغانستان کی حکومت قبول کرنے سے انکار کرنے پر آمادہ کر دیا۔

یہ عاجز مسلمانان ہندوستان اور بالخصوص اپنی اخباری برادری سے بار بار اور بصد التجا عرض کر چکا ہے کہ اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں کی جس طرح طرفداری کی جا رہی ہے وہ اسی فتنے کو فرو کرنے کا کوئی اچھا اور سریع الاثر طریقہ نہیں اور صرف اسی بنا پر بعض پرانے کرم فرماؤں نے کوئی ایسی دروغ بیانی اور افترا پردازی نہیں کی ہے جس سے میرے خلاف کام نہ لیا ہو۔ سب و شتم کا تو ذکر ہی کیا ہے لیکن بعینہٖ وہی رویہ سپہ سالار غازی نے اختیار فرمایا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کے چھوٹے بھائی سردار محمد ہاشم خاں صاحب کے خلاف بھی دروغ بیانیاں اور افترا پردازیاں شروع ہو گئیں اور ان کو اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں سے ذاتی پرخاش رکھنے کی بنا پر ان کے خلاف کوشش کرنے والا ظاہر کیا جا رہا ہے اور بظاہر چند ہی دن کی بات ہے کہ یہ قومی غداروں کی ٹولی جو دوسروں کی طرح نہ صرف بے صبر اور جلد باز اور زود چشم ہے بلکہ نفسانیت میں بالکل غرق ہے اور

ہمیشہ زرگری کی فکر میں لگی رہی ہے، جس طرح محمد علی کو شرک کے لونڈوں سے "قومی غدار" کہلوانے پر اتر آئی ہے سپہ سالار غازی کو بھی "قومی غدار" کہلوانا شروع کر دے گی۔

غازی موصوف نے مجھ سے بالفاظ صریح فرمایا کہ اس وقت جو رویہ ہندوستان میں اعلیٰحضرت شاہ امان اللہ خاں کی تائید میں اختیار کیا گیا ہے وہ بجائے ان کو مدد پہنچانے کے الٹا ان کے لئے مضر ثابت ہو رہا ہوگا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو میں بار بار کہہ چکا ہوں مگر جس ملک اور جس ملت میں عقل کی جگہ بھی توں نے غصب کر لی ہو وہاں غور و فکر، تدبر اور معاملہ فہمی کا قحط نہ ہو تو کیا ہو؟ آج "اسی قوالی" کی بدولت تو ہندوستان غلامی میں مبتلا ہے لیکن یہ 'قوال' سمجھتے ہیں کہ وہ افغانستان پر جس کو چاہیں گے حکمراں کر سکیں گے۔ میں نے اور میرے ہم خیالوں نے ایک لفظ بھی آج تک اس غرض سے منہ سے نہیں نکالا کہ اعلیٰحضرت شاہ امان اللہ خاں تخت پر سے اتار دئے جائیں، اپنی دست برداری کے اعلان کے بعد پھر تخت نشین نہ ہو سکیں۔ نہ میں نے کوئی لفظ حبیب اللہ خاں "بچہ سقہ" کی حمایت ہی میں آج تک منہ سے نکالا ہے مگر یہ تو اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہماری جبہ واری کسی کے بھی کام نہ آئے گی بلکہ جس کی ہم حمایت کریں گے اس کو غالباً نقصان ہی پہنچے گا۔ جیسا کہ سپہ سالار غازی اور ان کے بھائی نے بیان فرمایا ہے اس کا فیصلہ کہ کون تخت افغانستان پر بیٹھے باشندگان افغانستان ہی کر سکتے ہیں اور یہ انھیں کا حق بھی ہے۔ ہم بحیثیت انسان ہونے کے یہی کہہ سکتے ہیں کہ افغانستان کو آزاد ہونا چاہیے اور اس کی حکومت کو مستقل اور پائدار اور قیام امن کے قابل باقوت و اقتدار اور بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ حکومت افغانستان کو اسلامی ہونا چاہیے اور شریعت اسلامیہ کا احترام کرنے والی، یقیناً ہم نہ علماء کی،

ناموں کی، نہ بچہ سقہ کی، نہ کسی اور کے بچے کی ایسی حکومت چاہتے ہیں جو افغانستان کو ہماری طرح غیروں کی غلامی میں مبتلا کر دے اور ہم افغانستان کے علمائے کرام سے بھی باادب عرض کریں گے کہ اگر افغانستان غیروں کے پنجے میں پھنس گیا تو کیا خاک شریعت اسلامیہ کا احترام ہو سکے گا، لیکن ہم اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں سے بھی اس قدر عرض کر دینے کے لئے تیار ہیں کہ ہم نہیں چاہتے کہ افغانستان کی حکومت مصطفیٰ کمال پاشا کی نام نہاد حاکمیت ملیہ کی طرح حدود شریعت سے باہر نکل جائے، ہمیں حقیقتاً پوری طرح اس کا علم ہی نہیں ہے کہ حکومت افغانیہ نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا، اور ظن و قیاس ہمیں تحقیق حق سے بے نیاز نہیں کر سکتے۔ اسی لئے ہم نے اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں کی حکومت کے خلاف ایک حرف بھی منہ سے نہیں نکالا البتہ جن بدعات کی شہرت عام تھی اور جن میں سے بعض کا ثبوت مطبوعہ تصاویر سے ملتا تھا ان کے متعلق ہم مجبور تھے اور ہمارا حق ہی نہیں بلکہ ہمارا فرض تھا کہ صاف صاف کہہ دیں کہ وہ خلاف شریعت ہیں اور جو کوئی بھی ان کا مرتکب ہوا اس نے غلطی کی اور اس لئے ہم یہی نہیں کہتے کہ ان کے کرنے والے نے جلدی کی بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ انھیں بدعات کا ہزار برس کے بعد بھی مرتکب ہوتا تو غلطی کرتا اور یہ اس بنا پر نہیں کہ کوئی "ملا" ان کو خلاف شریعت سمجھتا ہے بلکہ خدا اور رسول نے انھیں خلاف شریعت بتلایا ہے، ہمارا ضمیر بھی انھیں قبول نہیں کرتا اور قرآن حدیث بھی انھیں حدود اللہ سے خارج ظاہر کرتے ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ افغانستان میں بعض علمائے سو رکٹ حجتی کی بنا پر اور بعض تنگ پرور اور نفس پرور غداری از خود یا اغیار کی دسیسہ کاریوں اور رشوت ستانی کے باعث اعلیحضرت شاہ امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ

بھگ گئے ہوں۔ اگر ایسا ہوا ہے تو خدا افغانستان کو اور ساری دنیا کو ایسے علماء اور ایسے غداروں سے جلد سے جلد نجات دے۔ ہم نے تو "قتل مرتد" ہی کے مسئلے پر علماء سے اختلاف کرنے کی جرأت کی تھی اور آج تک اس کے قائل نہیں کہ "قتل نفس" کے علاوہ بھی "قتل مرتد" اسلام میں جائز ہے لیکن اس وقت ہم پر "تفرنج" کا الزام تھوپا گیا تھا اور ہمیں "دنیا ابو حنیفہ" بتلایا گیا تھا۔ ایک نئے "محمود غزنوی" نے سترہ حملے کئے تھے مگر ان سیمابی ہتھیوں کو قرار کہاں؟ آج ہمیں "ملاؤں" کا حامی بنایا جا رہا ہے اور خود "تفرنج" کی حمایت کی جا رہی ہے۔ جن علماء کے "قتل مرتد" کے فتوے کے خلاف ہم نے قرآن کریم اور حدیث نبوی سے استدلال کیا تھا اور جن کی تائید اس وقت آج کے تفرنج پرور کر رہے تھے۔ کیا یہ وہی علماء نہ تھے جن کے خلاف اعلیٰحضرت شاہ امان اللہ خاں نے اپنا تاریخی سفر شروع کرتے ہی کراچی اور بمبئی میں اپنی بے زاری کا اظہار کیا تھا اور جن کو ہر خلاف تہذیب خطاب سے پکارا جا رہا ہے؟ مگر اس تبدیلی پر تعجب ہی کس کو ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ ؎

لے زر تو خدا نہ ای ولیکن بخدا
ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس میں اتنا اور اضافہ کر دوں کہ تو مقلب القلوب بھی ہے اور جس طرح نیچریوں کو کبھی علی پور کے پیر کا معتقد کر دیتا ہے اور کبھی ایک حنفی سے ایک نجدی امام کے پیچھے حجاز میں نماز پڑھتے وقت آمین بالجہر اور شاید رفع یدین بھی کرا دیتا ہے اسی طرح ایک دن لے ملاؤں کا مقلد اعمیٰ بنا دیتا ہے اور دوسرے دن ان کا دشمن اور تفرنج کا دلدادہ۔ مجھے تو اس تک پر اب ایمان بالغیب ہے کہ اگر کہیں "بچہ سقہ" ہی افغانستان پر حکمرانی کرتا رہا یا کوئی اور

اعلیٰحضرت شاہ امان اللہ خاں کا حریف ان کے خلاف کامیاب رہا تو یہی وفا شعار ٹولی اس کی شان میں بھی اسی طرح قصیدے لکھے گی جس طرح اس نے سر ہائیکل اوڈوائر اور شاہ جارج کی شان میں لکھے تھے اور اس سے خلعت ہفت پارچہ حاصل کرے گی اور لائنین سے تین حرف کا خطاب!

مگر اب اس ذکر کو چھوڑ ہی دیا جائے تو بہتر ہے۔ افسوس ہے اس ٹولی کی حرکات نے مجھے سپہ سالار غازی کی ملاقات کے حالات بیان کرنے سے اتنی دیر تک روکے رکھا کہ آج بھی اس ملاقات کے سارے حالات بیان نہیں کر سکوں گا۔ پیشتر اس کے کہ میں آگے بڑھوں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اتنا اور ظاہر کر دوں کہ اس ملاقات سے میری اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کی غرض کیا تھی۔ حقیقتاً نہ ہم ان کو کوئی مشورہ دینے گئے تھے نہ ان سے کچھ پوچھنے گئے تھے۔ جو کچھ ہم کو کہنا تھا وہ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ خود ہم نے کیا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ چنانچہ جب میں نے "ہمدرد" میں اپنے مضمون کا ذکر کیا تو سپہ سالار غازی نے خود ہی فرما دیا کہ ہاں میں نے وہ مضمون پڑھا ہے اور میں اس سے بالکل متفق ہوں۔ جنبہ داری ہمارا سارا کام خراب کر دے گی۔ جو کچھ ہمیں پوچھنا تھا وہ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ ہم کس طرح اس فتنے کے فرو کرنے میں انھیں مدد پہنچا سکتے ہیں اور انھوں نے خود ہی فرما دیا کہ ہم اس کے لئے دعا کریں کہ خداوند کریم انھیں توفیق اور استطاعت عطا فرمائے کہ وہ افغانستان کے مختلف عناصر کو جمع کر کے ان کے اختلافات کو مٹانے میں کامیاب ہوں۔ پہلے باہمی کشت و خون کو بند کر کے اس آگ کو جو مشتعل ہے بجھائیں اور سب کو ایک ایسی حکومت کی اطاعت قبول کرنے پر متحد کریں جو افغانستان میں قیام امن کی ضامن ہو سکے، اس کی آزادی اور اس کے استقلال کو برقرار رکھ سکے اور شریعت اسلامیہ کا احترام کرتی اور کراتی

رہے۔ اس لئے نہ ہم نے انھیں کوئی مشورہ دیا نہ ان سے تجسسانہ سوالات کئے، نہ یہ پوچھا کہ آپ قندھار جائیں گے یا کابل، نہ یہ دریافت کیا کہ آپ اعلیٰحضرت شاہ امان اللہ خاں کے طرف دار ہیں یا حبیب اللہ المعروف بہ "بچہ سقہ" کے۔ انھوں نے خود ہی فرمادیا کہ لوگ مجھے تار دے رہے ہیں کہ قندھار جاؤ۔ میں آگ بجھانے آیا ہوں اور ان لوگوں سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہوں کہ میرے گھر کے کس حصے میں آگ لگی ہے۔ مجھے پہلے وہاں جانا ہے جہاں آگ لگ چکی ہے اور اس کے قرب و جوار میں، تاکہ لگی ہوئی آگ کو بجھاؤں اور جس حصے میں آگ لگ جانے کا اندیشہ ہے اسے محفوظ و مصئون رکھنے کی سعی کرسکوں نہ یہ کہ وہاں جاؤں جہاں آگ نہیں لگی ہے اور جہاں و بحمد اللہ لگنے والی نہیں معلوم ہوتی۔

میں نے ایک سوال البتہ کیا تھا اور پوچھا تھا کہ ہم ان علمائے افغانستان کے متعلق کیا خیال کریں جن کا نام ہندوستان میں آج ہر گالی دینے والے کی زبان پر ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے اور ان کے بھائیوں نے فرمایا کہ جن کا نام اس طرح لیا جا رہا ہے۔ جب تک ہم اپنے وطن میں تھے تب تک وہ اغیار کے آلہائے کار اور غدار نہ تھے بلکہ انھیں نے افغانستان کو استقلال دلانے میں نمایاں طریقے پر مدد دی تھی۔ اب ہم نہیں کہہ سکتے کہ حقیقت کیا ہے۔ اب تک سوائے اغیار و اجانب کے اخبارات کے ہم تک خبر رسانی کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ اب وطن جاکر ہم کو صحیح حالات معلوم ہوں گے۔ کاش ہندوستان والے بھی اُن معاملہ فہم اور باعمل حضرات کی تقلید کرنے لگیں اور بنا رفاسق پر بلا حکم تبینوا پر عمل کرتے ہوئے اعتماد نہ کرلیا کریں۔ ہم کچھ عرصے سے افغانستان کے حالات سے اس سے تو کسی قدر زیادہ ہی آگاہ ہوتے رہے ہیں جتنے کہ بہت سے اہل زبان اور اہل قلم اور ہمیں اس کا علم تھا کہ اعلیٰحضرت شاہ امان اللہ اپنی رعایا میں اب اس قدر

ہروں عزیز نہیں ہیں جس قدر کہ پہلے تھے لیکن یہ سراسر غلط ہے کہ ہمارے پاس علمار افغانستان میں سے کسی کا نمائندہ آیا اور نہیں ان کی طرف سے کوئی پیغام پہنچایا گیا۔ سب سے زیادہ جن افغانوں سے ہم ملتے اور دریافت کرتے رہے وہ دہلی کے افغان قنصل جنرل صاحب ہیں جو ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں یا بمبئی کے افغان قنصل صاحب لیکن ہمیں تو اس عرصے میں زیادہ تجسس کی فرصت بھی نہیں ملنے پائی اور بمبئی کے فسادات کے زمانے میں جب اپنے حب افغانستان کا ڈھنڈورا پیٹنے والے تقریروں اور تحریروں سے "خدمت افغانستان" کرتے رہے، ہم اعلیٰحضرت شاہ امان اللہ کی افغان رعایا مقیم بمبئی کو اپنے رفقار کی مدد اور خداوند کریم کی توفیق سے قتل وغارت کو بچانے یا ان کو خوراک پہنچانے یا ان کے زخموں کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی یا ان کی میتوں کی شناخت کرانے اور تجہیز وتکفین اور ان کے پسماندوں کو ان کے گھروں تک پہنچانے میں مشغول رہے۔ سپہ سالار غازی نے خود ہی نہایت گرم جوشی سے اس کا اعتراف فرمایا اور مولانا شوکت علی اور دیگر کارکنان خلافت کی ان تھک کوششوں اور ہمت اور حوصلے کی داد دیکر اظہار تشکر فرماتے رہے۔

افغانستان میں جو ہنگامہ آج برپا ہے اور "اصلاحات" کا جہاں تک اس سے تعلق ہے اس کے متعلق ہم نے سپہ سالار غازی سے خود کوئی سوال نہیں کیا تھا مگر انھوں نے ابتدا ہی میں خود فرمایا کہ آپ غور کریں کہ ہمارے ملک میں وہ کیا چیز تھی جو آج تک ہر جگہ اور روس جیسے شہنشاہوں کو ایک حد تک خائف اور مرعوب رکھے ہوئے تھی۔ ہماری آبادی کتنی کم ہے، جہالت کا ہم میں کس قدر دور دورہ رہا، زر و مال کی کس قدر قلت رہی اور آلاتِ حرب تک کا ہم میں کس قدر کال تھا، پھر بھی برطانیہ اور روس جیسی سلطنتیں ہمارا ملک

ہیں چھین سکیں۔ آخر کیا چیز اب تک مانع رہی۔ کیا یہی اسلام نہ تھا اور یہی علمائے اسلام کے فتوئ جہاد پر ملک کے بچے بچے کا اللہ اکبر کہہ کر گھر سے نکل پڑنا اور فی سبیل اللہ میدان کارزار کا رخ کرنا۔ جبریہ بھرتی اس وقت نہ تھی مگر انھیں علماء کے فتوئ جہاد پر ہر بوڑھا، ہر جوان اور ہر بچہ حکومت افغانستان کا وفادار سپاہی بن جاتا تھا اور تنخواہ کیسی ہتھیار تک نہ مانگتا تھا۔ جو کچھ اس کے پاس ہوتا تھا اپنے ہی گھر سے نکال کر لاتا تھا اور کمر سے بندھی ہوئی روٹیوں پر گذر کرتا تھا۔ اس اسلامی جذبے کی تضعیف کر کے افغانستان اغیار و اجانب کو خائف و مرعوب نہیں کر سکتا۔

اگر ہمارے نوجوانوں نے لندن کا لباس زیب تن کرنا سیکھ لیا یا ہماری عورتیں پیرس کے فراک پہننا اور بال ترشوانا اور ان کو گھونگروالے کروانا سیکھ گئیں تو کیا یورپ اس سے خائف و مرعوب ہو جائے گا۔ وہ تو یہی سمجھے گا کہ افغان ہم سے خائف و مرعوب ہو گئے۔ میں خود اس قسم کی اصلاحات کا دشمن نہیں، نہ یورپ کے لباس یا اس کی وضع قطع ہی سے بالکل بےزار ہوں۔ علمائے اسلام بھی بعض وقت تنگ نظری اور سختی سے کام لیا کرتے ہیں اور اس کا اور بھی بُرا اثر پڑتا ہے اور نوجوان اور بھی حد سے باہر جانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر سپہ سالار غازی نے ایک پُرانی نوٹ بک نکالی اور اس میں سے تلاش کر کے حضرت اکبر رحمۃ اللہ علیہ کے یہ اشعار ہمیں سنائے ؎

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر — تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں — خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر — زیادہ حد سے دیے ہیں سبنے پاؤں ہیں پھیلا
اِدھر یہ ضد ہے کہ سوڈا بھی چھو نہیں سکتے — اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحیِ مے لا
اِدھر ہے دفترِ تدبیر و مصلحت ناپاک — اُدھر ہے وحیِ ولایت کی ڈاک کا تھیلا

غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را   بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

ان اشعاروں کے سننے کے بعد ممکن ہے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کچھ فرماتے مگر انھوں نے کچھ نہیں فرمایا۔ میں کیا کہتا جو عرصے سے دہلی کی جامع مسجد میں بعد نماز جمعہ اسی افراط و تفریط کا رونا روتا رہا ہوں' جو اسی کا ذکر اردونے قسطنطنیہ' انگورہ' اسکی شہر' قونیہ' حلب' دمشق' قدس شریف' بغداد شریف' اور قاہرہ گیا تھا' جس نے اسی پر ڈھائی گھنٹے توفیق رشدی بے وزیر خارجہ ترکی سے اور دو گھنٹے قونیہ کے والی سے اور تین گھنٹے ملک فیصل اور ان کے بھائی امیر علی اور وزراء و عمائدِ عراق سے گفتگو کی تھی اور جس نے اسی پر قاہرہ اور قدس شریف میں تقریریں کی تھی اور جو اُن گفتگوؤں اور تقریروں کو نہ صرف اپنا حق بلکہ اپنا دینی و دنیوی فرض سمجھتا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو کسی زر پرست جریدہ نگار اور بادشاہوں اور حکام کے قصیدہ خواں کی طرح مسلمانوں کے فرائض سے خارج نہیں سمجھتا۔ میں نے اسی وقت سپہ سالار غازی سے عرض کر دیا کہ جب آپ اس قدر ہمارے ہم خیال ہیں تو آپ کو ہم مشورہ دینا چاہتے بھی تو اس کی ضرورت اب باقی نہیں رہی اور آپ سے کچھ پوچھنے کی جرأت بھی کرتے بھی تو اس کی اب حاجت نہیں رہی۔ وہ والدہ ماجدہ مرحومہ اور میری اہلیہ کے حدودِ شریعت میں رہ کر ہماری قیدوں کے زمانے میں ہماری جگہ کام کرنے کا حال سنتے رہے اور اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر مجھ سے سن کر آپ نے اسے فوراً اپنی نوٹ بک میں چڑھا لیا ؎

ایں زناں ہمت مرداں بہ ہمیں محدود است
زنے از پردہ بروں آید و کارے بکند

اس کے علاوہ وہ اکبرؒ کا ایک اور شعر بھی عورتوں کے پردہ اٹھ جانے

اور مردوں کی عقل پر پڑ جانے کے مضمون کا جس سے سب قارئین "ہمدرد" واقف ہوں گے سردار شاہ ولی خاں صاحب یا سردار محمد ہاشم خاں نے سنایا اور اکبر ہی کا ایک اور شعر اسی سلسلے میں پردہ اٹھ جانے کے نتیجے کے متعلق مجھ سے سن کر سب پھڑک اٹھے اور سپہ سالار غازی نے اسے بھی نوٹ بک میں چڑھا لیا۔ اس سے کوئی صاحب یہ گمان نہ کرلیں کہ یہ محترم بھائی عورتوں کو مسلمان گھروں میں ہندوستان کی طرح گھونٹے رہنے کے طرف دار ہیں۔ حقیقت میں افغانستان میں کیا کسی اسلامی ملک میں عورتیں اس قید و بند میں مبتلا نہیں اور نہ اس طرح اپاہج ہیں سپہ سالار غازی اور ان کے بھائی بظاہر شریعت اسلامی کی حدود کے اندر رہ کر عورتوں کو باکار بنانا چاہتے ہیں مگر ان کو عریاں کرکے یا ان کی زینت کو ظاہر کرکے ان کی نمائش اور اس طرح فسق و فجور کی توسیع کے وہ ہرگز روادار نہیں اور ان کا خیال ہے کہ یورپ خود اسلام سے اس میں بھی سبق لے گا اور یہی کیا ہے ہر چیز میں اسلام سے سبق لے گا بشرطیکہ ہم خود حقیقی اسلام کو سمجھیں اور اسے یورپ کو سمجھانے کی صحیح طریقے پر کوشش کریں۔

چین

(۱) چین کے متعلق قلب ہندوستان کی آواز

ہمدرد ۳۰ جنوری ۱۹۲۷ء

ہندوستان کے لوگوں کی ذہنیت کچھ اس طرح بگڑ گئی ہے کہ جو محب وطن ان کی اصلاح کا خواہاں ہے اس کو خداوند کریم مافوق العادت استقامت اور صبر عطا فرمائے تبھی وہ کچھ کرنے کی امید کر سکتا ہے ورنہ سوائے تنگ کر بیٹھ رہنے کے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہمارے کمزور دل اگر کامیابی اور کامرانی سے جلد فیض یاب نہیں ہو سکتے تو بول اٹھتے ہیں کہ؎

تنگ تنگ کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

ہندو مسلم مناقشات، سعودی اور حنفی اختلافات، کانگریس اور جوابی تعاون والوں کے جھگڑے اور بے شمار اسی قسم کے تنازعات ہیں جو پبلک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہونے دیتے۔ یہی نہیں کہ ہم کل جہاں تھے آج بھی وہیں ہیں بلکہ روز بروز پیچھے ہٹتے جاتے ہیں اور بادی النظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے ۱۹۲۱ء کی فضا پھر پیدا ہونے اور جس منزل پر ہم اس زمانے میں پہنچ چکے تھے، اس سے بھی آگے قدم بڑھانے کے، لارڈ کرزن سے بھی پہلے کی فضا دوبارہ پیدا ہو جائے گی اور حکومت کی غلامی کا وہ قلادہ جو ہم نے اپنی گردن سے نکال کر پھینک دیا تھا پھر نشانِ امتیاز کی طرح زیب گلو کیا جائے گا۔ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی؟" ایک خرابی ہو تو اس کی اصلاح کی جائے۔ جب ہر طرف خرابیاں ہی خرابیاں نظر آ رہی ہیں تو ہجوم یاس سے متاثر نہ ہونا نہایت مشکل

معلوم ہوتا ہے۔ کسی سلطنت میں ایک بار کچھ اس قسم کی بارش ہوئی کہ جس پر ایک بوند بھی پڑ گئی وہ فاتر العقل اور مخبوط الحواس ہو گیا۔ کوئی کپڑے پھاڑنے لگا، کوئی لوگوں کو مارنے لگا، کوئی گالیاں بکنے لگا، کوئی ننگا ہو کر ناچنے لگا، غرضیکہ عالم و اُمی، شریف و رذیل، اعلیٰ و ادنیٰ، کوئی بھی اس دیوانگی سے نہ بچ سکا۔ بادشاہ اور وزیر البتہ تخلیے میں کچھ گفتگو امور سلطنت پر کر رہے تھے، ان کو نہ اس عجیب غریب بارش کی خبر تھی، نہ ان پر ایک چھینٹ پڑنے پائی تھی۔ جب وہ خلوت سے باہر نکلے تو چوب داروں اور خدمت گاروں کو مست پایا۔ افسروں کو حکم دیا کہ اس گستاخی کی خدام بارگاہ کو سزا دیں تو وہ الٹے بادشاہ اور وزیر پر پلٹے۔ کوتوال کو حکم دیا کہ سب کی مشکیں کس لے تو اس نے خود بادشاہ کو گرفتار کرنا چاہا۔ اعلیٰحضرت پریشان ہو کر حرم سرا میں تشریف لے گئے کہ کچھ وہیں دل بہلائیں اور ان گستاخیوں سے محفوظ رہیں۔ مگر وہاں ملکہ اور شہزادیاں، خواجہ سرا اور باندیاں جس رنگ میں نظر آئیں اس کا ذکر کرنے سے بقول بعض ادویہ کے اشتہار دینے والوں کے تہذیب مانع ہے۔" بادشاہ الٹے پاؤں زنانے سے مردانے میں آئے اور وزیر با تدبیر سے پوچھا کہ اس کا کیا علاج کیا جائے۔ اس نے کچھ دیر تامل کیا پھر کہا جہاں پناہ مجھے بارش کا پانی پینے کا بہت شوق ہے۔ میرے گھر میں پرنالے کے نیچے دو گھڑے بھرے رکھے ہیں، ایک حضور سر پر ڈالیں اور ایک میں ڈالوں پھر ہم بھی انھیں سب کی طرح ہو جائیں گے، پھر ہمیں کوئی بھی دیوانہ نہ نظر آئے گا۔

"ایک حمام میں سبھی ننگے"

حقیقتاً بعض وقت یہی جی میں آتا ہے کہ چھوڑو سارے دھندے کو، قصر حکومت کی دہلیز پر جبہ سائی کرو اور گورنری نہ سہی تو ایگزیکیٹو کونسلری ہی سہی اور وہ بھی نہیں تو ایک منشری ہی لے مرو، ہندو مسلم اتحاد کیا تم بھی بے بھاگن

کے خوب ہولی کھیلو، گالیاں یونہی کھاتے ہو خود بھی دینے لگو، کیسی کانگریس اور کس کا سوراج، کیسا چرخہ اور کہاں کی کھدر سب پر لعنت بھیجو، خلافت جائے بھاڑ میں اس خیال خام کو چھوڑو، ابن سعود کی بادشاہت کو تسلیم کرو، علی حسن کی سیادت ونظامیت، خواجگی اور تحریر وتبلیغ کی راجگی پر ایمان لاؤ۔ مزے کرو اور خوب دندناؤ، چین سے جنگ چھڑے تو جلسہ کرکے "وفاداری" کا راگ گاؤ اور جب تک سرکار سے کوئی صلہ ملے اسی کی دعا کرو کہ جنگ چھڑے بن نہ رہے۔ بقول غالب ؎

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

تم احیائے خلافت راشدہ اور تیرہ سو برس پرانی اسلامی تنظیم کے دوبارہ اجرا، ہندو مسلم اتحاد اور حصول آزادیٔ ہند پر پُر زور مضمون لکھتے ہو مگر ڈھائی ہزار سے زیادہ "ہمدرد" کی بکری نہیں ہوتی، اور جس دن "ختم خواجگی" یا "سوامی شردھانند" کے قتل کے مقدمے کے حالات پرچے میں نہیں ہوتے، ان ڈھائی ہزار میں سے بھی بہت سے خریدار کہتے ہیں کہ آج اخبار میں کچھ نہیں، آج کا پرچہ پھیکا ہے۔ جنگ کو چھڑنے دو سرکار کی فوج ظفر موج کی ایک پسپائی کی خبر آنے دو، ایک ہی دن میں اشاعت پانچ ہزار ہو جائے گی۔ یاد نہیں کہ جب مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا عبدالماجد قادری بدایونی کا وفد جدہ سے بے نیل ومرام واپس آیا تھا اور مولانا سید سلیمان صاحب مجامع میں وفد کی کارروائی سنانے والے تھے تو قلب اسلام سے متعلق ایک اہم ترین مسئلہ بھی مسلمانوں کے لئے اتنا کم دلچسپ تھا کہ صوبۂ دہلی کی خلافت کمیٹی کے سکریٹری نے جو مسلمانوں کے جذبات اور ان کی دلچسپیوں کو خوب سمجھتے ہیں مجبور

ہو کر جلسے کے پوسٹر کی سرخی یہ دی تھی کہ "جدہ کی لڑائی کے تازہ ترین حالات"
تاکہ لڑائی کے حالات کی چاٹ مسلمانوں کو مسجد جامع تک لے آئے اور اس
چاٹ میں جو مسلمان آئے تھے وہ اسے بالکل بھول گئے تھے کہ اس پوسٹر کی سرخی
اس خون کی تھی جو ارض پاک حجاز میں خود مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کا بہا رہے
تھے۔ تم روما کے متعلق انگریز شاعر بائرن کا مشہور مصرع اکثر نقل کیا کرتے ہو کہ
کوئی یم کی تماشا گاہ میں سیکڑوں بے گناہوں کا خون اہل روما کی تفریح طبع کے
لیے اس طرح بہایا جاتا تھا جس طرح قصاب بھیڑ بکری کا خون مسلخ میں بہایا کرتے
ہیں۔ اور اسپین کے بارے میں بھی لکھا کرتے ہو کہ رقص بسمل کا تماشا
بہتر سے بہتر ہسپانوی رقاصہ سے کہیں زیادہ اچھا سمجھا جاتا ہے۔ تاکہ اہل ہند اپنی
آنکھ سے خون بہتے ہوئے نہیں دیکھتے لیکن ہر اخبار والا کہہ سکتا ہے کہ انھیں حالات
جنگ پڑھنے میں جتنا مزہ آتا ہے اتنا کسی شے میں نہیں آتا۔ جنگ طرابلس نے
کتنے اخباروں کی تخلیق میں مدد دی۔ جنگ بلقان میں انسانی خون سے کتنے صحافتی
پودے سینچے گئے اور جنگ عمومی نے کتنوں کو معراج اشاعت پر پہنچا دیا۔ یہ سب
تمھیں یاد ہے پھر بھی اپنے پیر میں کلہاڑی مارتے ہو اور چاہتے ہو کہ چین کے
خلاف تمھاری سرکار جنگ نہ کرے اور "ہمدرد" کی اشاعت جس قدر ہے
اس سے بڑھنے نہ پائے اور ڈیڑھ ہزار پونے دو ہزار کا خسارہ جوں کا توں رہے۔
اس تمام فرد قرار داد جرم بے وقوفی کو قبول کرتا ہوں اور سوائے اس عذر کے جو
غالب نے اپنی ایمان داری سے پیش کر دیا تھا کوئی اور عذر نہیں رکھتا کہ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

بہر حال مجھے اور میرے ہم نواؤں کو چین کی زمین کو نہ چینیوں کے خون

سے نہ ہندوستانیوں کے خون سے لالہ زار بنانے اور رقص بسمل دیکھنے کا شوق ہے میں
تسلیم کرتا ہوں کہ ہم غلام ہیں اور بظاہر قدرت نہیں رکھتے کہ اپنی غلامی کے بندھن
توڑ سکیں۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ چین بھی ہماری ہی طرح غلام ہو جائے اور ہمارے
اور ان کے درمیان مشرقیت کے علاوہ ایک ہی مالک کی غلامی میں شرکت ایک
مزید رابطۂ اتحاد پیدا کر دے اور ہم ان سے کہہ سکیں کہ ؎

من و تو ہر دو خواجہ تاشیم
بندۂ بارگاہِ سلطانیم

اس لئے دوسرے پہرے خلافت اور کانگریس والوں کی اس بارے
میں ایک تحریک میں نے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں پیش کی اور جب وہ منظور ہو گئی
اور اس کے تیسرے ہی دن جب کانگریس کے صدر سری جیت سری نواس آئنگر
نے تحریک التوائے بحث اسمبلی میں پیش کرنا چاہی اور صدر اسمبلی نے اس میں
کتر بیونت کرنے کے بعد اجازت بھی دے دی مگر اس پر بھی وائسرائے نے وہ بھی
اجازت مسترد کر دی تو میں نے دہلی کے چند سربر آوردہ اہل الرائے اور اسمبلی کے
رہنماؤں سے استصواب کر کے مقامی کانگریس کمیٹی کے ذریعے سے ایک جلسے کا اعلان
کرایا جو الحمد للہ ۲۰ جنوری کو دہلی میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کے داعیان میں شہر دہلی
کے عمائد بھی تھے اور اسمبلی کے سیاسی رہنما بھی لیکن مقدم الذکر کا کسی ایک جگہ
ٹھکانا نہیں اور اگر گھر گھر پھر کر انھیں کسی سے ڈھونڈ ہی نکالا تو مؤخر الذکر کا پھر کوسوں
پتہ نہیں اس لئے کہ وہ ہماری سرکار کے ہم رکاب ہیں اور رائے سینا میں قیام پذیر
ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ ع

کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

مگر باوجود اس کے کہ دلی میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اہل دہلی سے لوگ بآسانی

دو چار ہو سکیں اور جہاں ایک اجتماعی صورت پیدا ہو سکے۔ تاہم دہلی میں ایک پرانا اور شریف ترین خاندان شریفی ہے جو اس انتشار کی حالت میں بھی ایک اجتماعی کیفیت پیدا کر دیا کرتا ہے اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی ذات گرامی میں وہ کشش ہے جو ہندو، مسلمان، سکھ اور جین کوئی بھی اس کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں جا سکتا۔ آپ کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی آپ کے بھائی نواب احمد سعید خاں صاحب مرحوم اور غلام کبریا خاں صاحب عرف بھوّے میاں صاحب کے صاحبزادے سے ہوئی تھی۔ اس کی خوشی میں چند دن ہوئے کہ آپ کی طرف سے چائے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس میں دہلی کے تقریباً تمام عمائد شریک تھے اور یہی نہیں بلکہ وہ بعد المشرقین بھی دور ہو گیا تھا جو اہل دہلی اور رہنمایان ہند کو جو راہ سینا میں رہتے ہیں ایک دوسرے سے دور رکھ رہا تھا۔ یقیناً اس دعوت کے موقع پر حکیم صاحب کا خدمت کدہ ("دولت کدہ" لکھنے کو جی نہیں چاہتا اس لئے کہ اب وہاں دولت کہاں ہے، سب ملک و ملت کی نذر ہو چکی دوسرے اس کی شہرت دولت کے باعث کبھی بھی نہ تھی۔ خدمت ملک و ملت اس گھر کا ہمیشہ شعار تھا اور آج سے زیادہ کبھی بھی یہ شعار نہ تھا۔) ہندوستان کا قلب تھا۔ ایک ہی وقت پر ایک ہی جگہ، ہندوستان کے بہترین دماغ جمع تھے۔

افسوس ہے کہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر جناح باوجود ہندو مسلم مسئلے میں شدید اختلاف رکھنے کے اب بھی شدت کی مخالفت اور اعتدال کی شدت میں ایک دوسرے کے شریک و سہیم نکلے اور باوجود دو بار منت سماجت کرنے پر بھی داعیان میں شریک ہونے سے دونوں نے انکار کر دیا۔ جناح صاحب کی پارٹی کے اور حضرات نے بھی مثلاً محمد یعقوب صاحب جو اب تک ڈپٹی پریسیڈنسی کے امیدوار تھے اس میں شرکت سے انکار کیا۔ مگر مالوی جی کے شریک و سہیم

لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر مونجے صاحب اور مسٹر جیکر نے دستخط فرما دیے تھے مگر جلسے میں ایک شریک نہ ہوا۔ لطف یہ ہے کہ اسمبلی میں تو یہ دونوں شدت کے ساتھ اعتدال پسند پارٹیاں کانگریس کے صدر اور کانگریس پارٹی کے صدر کے ہم نوا معلوم ہوتے تھے اور صدر اسمبلی پر زور ڈال رہے تھے کہ چین کو افواج بھیجنے سے پہلے اسمبلی کی رائے نہ لینے پر بحث کی ضرور اجازت دی جائے۔ جب دی ہوئی اجازت وائسرائے نے رد کردی تو مالوی جی نے اتنی ہی جدوجہد کو اپنے ضعیف قویٰ کے لیے بہت سمجھا اور ارشاد ہوا کہ میں نے تو اسمبلی میں رائے دینے دی اپنی کافی ہے۔ مگر جناح صاحب کے نزدیک حکومت کا فیصلہ حق بجانب بھی تھا۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو مگر خود انھیں کے ارشاد کے مطابق یہ فیصلہ صرف اسی لیے حق بجانب تھا کہ اسمبلی کے اختیارات محدود ہیں اور وہ برطانیہ کے پارلیمنٹ کی طرح ایک حکمراں پارلیمنٹ نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی وہ مخلوق جو ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے اور یہیں بود و باش رکھتی ہے اس کے بھی اختیارات کسی غیر اللہ نے سلب کر لیے ہیں اور انھیں اسمبلی کی طرح اس طرح محدود کر دیا ہے کہ وائسرائے کے فرمان کے جاری ہو جانے کے بعد اسمبلی اب اس نازک مسئلے پر بحث نہ کرے اس کا اس پر بحث کرنا ملک کے مفاد کے خلاف ہوگا۔ وہ خدا کی کالی مخلوق بھی اپنے مفاد کے متعلق خود فیصلہ کر کے اس مسئلے پر بحث کرنے سے معذور و مجبور ہے؟

بہرحال ان دو حضرات کے دستخط جلسے کے دعوت نامے پر نہ ہونا تھے نہ ہوئے اور ان کے ہم نواؤں میں سے جنھوں نے اتنی جرأت کی تھی کہ دستخط تو ثبت فرما دیے تھے وہ بھی شریک جلسہ نہ ہوئے حالانکہ اسمبلی کا اجلاس اس وقت نہ ہو رہا تھا۔

لیکن کیا جلسہ نہ ہو سکا یا اگر ہوا تو اس کی اہمیت ان کے دستخط نہ کرنے یا اس میں تشریف نہ لانے سے کچھ کم ہو گئی؟ ہرگز نہیں! جلسے کی کارروائی کسی

دوسری جگہ دی جا رہی ہے اور انشاء اللہ کل میں اس پر اپنی رائے تفصیل کے
ساتھ لکھوں گا مگر یہ کہنے میں مجھے ذرا بھی باک نہیں کہ اہل دہلی نے اچھی طرح
ثابت کر دیا کہ اگر ان کی رہنمائی صحیح طریقے پر کی جائے تو ان کی آواز قلب
ہندوستان کی آواز ہے۔ اس جلسے میں وہی لوگ شریک تھے جو ہندو مسلم مناقشات
کے موقع پر بھی اپنی ملت کی حمایت کرنے میں پیش پیش رہا کرتے تھے لیکن مسٹر شاپورجی
سکلات والا ممبر پارلیمنٹ برطانیہ نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو مگر دل کی فصیح و بلیغ
زبان میں جو تقریر کی وہ چونکہ دل سے نکلی تھی سب کے دلوں پر اثر کر گئی۔ ایک
بمبئی کا پارسی یوں ہی کونسی اچھی اردو بولتا ہے اور کتنے ہیں جو اردو میں اور وہ
بھی دہلی جیسے شہر میں اردو میں تقریر کی جرأت کرتے ہیں۔ پھر جو پارسی تیرہ چودہ برس
سے ہندوستان سے باہر رہتا ملک کی خدمت کر رہا ہو اس کو اردو بولنے کی جتنی
مہارت ہوگی ہر ایک جانتا ہے مگر مسٹر سکلات والا انگریزی بولنے والے چند لاکھ
افراد کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے ہندوستان نہیں آئے ہیں اس لئے انھوں
نے انگریزی میں تقریر نہ کی اور اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو ہی میں اپنا مافی الضمیر ادا فرمایا۔
اس کے باوجود ان کی تقریر میں ایک نقطہ (یا نکتہ) بھی ایسا نہ تھا جسے عوام
نے نہ سمجھا ہو اس لئے کہ وہ ہر نکتے کی داد برابر دے رہے تھے اور ان کے خیالات
سے اس قدر متفق تھے کہ اسے بالکل بھول گئے کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان کانگریس
کو ہندوؤں کی سازشی جماعت سمجھتے ہیں یا چند خلافت والے مسلمانوں کی لونڈی
باندی۔ وہ اس وقت سچے معنوں میں ہندوستانی تھے اور ہندوستانی حقوق اور
انسانی جذبات سے پُر تھے۔ یہی حال مسٹر نواس آئنگر کی تقریر کے دوران میں
تھا جن کا میں ترجمہ کر رہا تھا۔ اس مجمع کا دونوں حضرات پر گہرا اثر ہوا اور دونوں
کا خیال صحیح ہے کہ ہندو مسلم مناقشات کام نہ کرنے کا ایک بہانہ ہے ورنہ

اہل دہلی اور اہل ہند عموماً ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد اور مشرق پر سے مغربی غلبے کو دور کرنے کا کام آج بھی مستعدی سے کرنے کو آمادہ ہیں بشرطیکہ ہندو اور مسلمان لیڈر خود ان کو نہ بہکائیں اور ایک دوسرے سے نہ لڑائیں۔ ۲۰ جنوری کا جلسہ ۱۹۲۱ء کی یاد کو تازہ کر رہا تھا اور خدا کرے کہ گذشتہ پانچ چھ برس کے مناقشات کو بھول کر ہم سب پھر اپنی اور ساری مشرق کی موجودہ غلامی ہی کی یاد کو تازہ رکھیں اور آزادی کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بھائی کی طرح مل کر جدوجہد کو پھر شروع کریں۔

(۱) میرا "استاد" اقبال

ہمدرد ۱۲ اگست ۱۹۲۶ء

جس زمانے میں میں نے کلکتے سے "کامریڈ" نکالنا شروع کیا تھا تو اس امید پر کہ ملک وملت کی طرف سے ایک ایسے جریدے کی جو یورپ کے ہفتے وار جرائد کے انداز پر نکلا کرے گا کماحقہ قدر کی جائے گی۔ برطانیہ کے بہترین روزانہ اور ہفتے وار جرائد اور ماہوار اور سہ ماہی رسائل کی ایک بڑی تعداد بصرفِ کثیر منگانا شروع کی تھی اور "کامریڈ" کی پرانی فائلوں کا کوئی آج بھی مطالعہ کرے (دفتر میں ایک بڑا ذخیرہ اب تک پڑا ہے جسے ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء تک کے حالات و واقعات سے دلچسپی رکھنے والے تھوڑی ہی سی قیمت پر اب بھی منگا سکتے ہیں) تو اسے اس زمانے کے ہندوستان اور اسلامی ممالک کی ایک نہایت مفصل اور مکمل اور دلچسپ تاریخ "کامریڈ" کے صفحات میں مل جائے گی جس میں تقریباً وہ تمام چیزیں شامل ہوں گی جو ہندوستان اور اسلامی ممالک کے متعلق برطانوی جرائد ورسائل میں شائع ہوا کرتی تھیں لیکن "کامریڈ" کی یوں تو ہر طرف سے مانگ تھی مگر جب پیشگی چندہ نہیں آتا تھا اور وی۔ پی بھیج کر بقایا وصول کرنے کی کوشش کی جاتی تھی تو وہی پرچے واپس کر دئے جاتے تھے جو قیمت طلب روانہ کئے جاتے تھے لیکن اور پرچے جو ہفتے وار جاتے رہتے تھے، خوشی خوشی قبول کرلئے جاتے تھے اور بڑی دلچسپی اور نہایت شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

اکتوبر ۱۹۱۲ء کے آخری ہفتے کے پرچے میں اس کی تفصیل وار شکایت

کرکے میں نے دکھایا تھا کہ صرف اس سال کے دس ماہ میں بائیس ہزار کے وی۔ پی واپس آئے تھے اور وصول یابی اور نادہندی کا تناسب روپیہ میں چھ آنے اور دس آنے تھا۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد اب ایک روزانہ انگریزی اخبار پھر نکالنا چاہتے ہیں مگر "آئی۔ ڈی۔ بی" کی طرح نہ صرف اپنے روپیہ سے بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے روپیہ سے خدا اسے "آئی۔ ڈی۔ بی" سے زیادہ کامیاب کرے مگر جو ذہنیت مسلمانوں کی آج ہے وہ ۱۹۱۱-۱۴ء کی ذہنیت سے بھی کہیں بدتر ہے اور مجھے خوف ہے کہ شاید مہاراجہ صاحب کو بھی روپیہ میں چھ آنے سے زیادہ وصول نہ ہوں۔ خیر مہاراجہ صاحب غالب کی طرح فرما سکتے ہیں کہ ؂

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

میری دعا ہے خیر ان کے ساتھ ہے۔ اگر ان کو کوہ طور سے "لن ترانی" کے سوا کوئی اور جواب ملا تو پھر موسیٰ کی بھی امید از سر نو بندھ چلے گی۔ مجھے جو عرض کرنا تھا وہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی اس مفت خوری سے مجبور ہو کر اور خود مہاراجہ صاحب کی فیاضی پر سے حد سے زیادہ بوجھ نہ ڈالنے کے خیال سے میں "کامریڈ" کو بند کرنے کا اعلان کر ہی چکا تھا کہ ۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو جس دن برطانیہ نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کیا "کامریڈ" کی ضمانت کی ضبطی کا حکم سرعلی امام نے ٹیلیفون پر سنایا اور اس کے بعد ایک پرچہ اور نکلنے کے بعد "کامریڈ" کی نشاۃ اولیٰ کا خاتمہ ہوا۔ پورے دس برس بعد ۱۹۲۴ء کے اواخر میں ہمت کرکے "کامریڈ" پھر نکالا اور اس بار پیشگی چندے کے بغیر اخبار کسی خریدار کے نام بھیجنے کا غلط اصول ابتدا ہی سے بند کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نشاۃ ثانیہ کی اشاعت نشاۃ اولیٰ کی اشاعت

کے نصف سے کبھی نہ بڑھی مگر جو خریدار درج رجسٹر کیا گیا وہ اس بار حقیقتاً خریدار تھا مفت خورنہ تھا۔ اس بار مصارف بھی بہت ہی کم رکھے گئے مگر جنگ کے بعد سے ہر چیز کی قیمت اور (اڈیٹروں کے سوا) ہر شخص کی اجرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس بار بھی برابر خسارہ اٹھانا پڑا اور دو دو اخبار ایک ہی شخص کے نکالنے کے باعث صحت الگ رخصت ہوئی اور "کمریڈ" کی نشاۃ ثانیہ کا بھی خاتمہ کر کے میں نے اپنی نشاۃ اولیٰ کے خاتمے کو بفضلہ بچا لیا۔ اس دور ثانی میں اتنی ہمت کس طرح کر سکتا تھا کہ برطانیہ کے اکثر بڑے جرائد اور رسائل منگاتا لیکن ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے واقعے کے سلسلے میں ولایت جانا پڑا تھا تو پریس کٹنگ ایجنسیوں سے واسطہ پڑا تھا اور ان کا خاصہ تجربہ حاصل ہوا تھا اور ۱۹۲۰ء میں بھی جب وفد خلافت کی سرکردگی کرنے کے لئے پھر ولایت جانا پڑا تو پھر ایک ایسی ہی ایجنسی سے واسطہ پڑا اور مقابلتاً تھوڑے ہی صرف سے برطانیہ کے جرائد و رسائل کے سینکڑوں اقتباسات وصول ہوتے رہے۔ جب ۱۹۲۴ء میں "کمریڈ" پھر نکالا تو زیادہ تر انھیں اقتباسات پر انحصار کیا اور جنھوں نے خاص دور کا "کمریڈ" پڑھا ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ مشکل ہی سے ایسا کوئی مسئلہ تھا جس کا تعلق ہندوستان یا اسلامی ممالک سے ہو اور "کمریڈ" نے برطانوی جرائد و رسائل کے اقتباسات کے ذریعے سے اس پر کافی روشنی نہ ڈالی ہو۔

یہ طول طویل تمہید صرف اس لئے لکھی گئی کہ قارئین کرام کو یقین دلایا جائے کہ ہندوستان میں بہت ہی کم ایسے جریدہ نگار ہوں گے جو مجھ سے زیادہ برطانوی پریس سے واقف ہوں۔ ان کے متعلق میرے کم سے کم پندرہ بیس برس کے تجربے نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ "نیوز پیپر" (News Paper) ہرگز نہیں ہوتے، روزانہ جرائد بھی ہفتہ وار جرائد کی طرح حقیقتاً "ویوز پیپر"

(News Paper) ہوتے ہیں اور جو "نیوز" یعنی خبریں بھی ان "اخباروں" میں شائع ہوتی رہتی ہیں وہ بھی دراصل مالکوں اور اڈیٹروں کی "ویوز" یا آراء ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہی خبریں ان اخبارات میں شائع کی جاتی ہیں جن کا اخبار میں چھپنے پر وہی اثر پڑے جو اخبارات کے مالک اور اڈیٹر اس پر ڈالنا چاہتے ہیں الا ماشاء اللہ اور جن واقعات کی اطلاع کا اخبار میں چھپنے پر ان کے نزدیک بُرا اثر پڑے گا ان کو درج اخبار ہی نہیں کیا جاتا اور کتمانِ حق ہی پر اکتفا نہیں ہوتا بلکہ تلبیس الحق بالباطل بھی برابر جاری رہتی ہے اور زیادہ تر اسی کے ذریعے سے اخبار میں چھپنے کی رہنمائی کی جاتی رہتی ہے بالفاظ دیگر اخبارات ایک خبر رساں ایجنسی ہرگز نہیں سب کے سب پروپیگنڈے کی ایجنسی ہیں۔

اس ہفتے کی ولایتی ڈاک مجھے ہفتے کی شب کو ملی۔ دن بھر کام کر کے تھک گیا تھا۔ سونے کو لیٹا تو سرہانے ڈاک رکھی ہوئی تھی۔ ایک روزانہ اخبار کے اڈیٹر کی زندگی باوجود ہزار ادعائے آزادی کے ایک غلام کی زندگی ہے اسی وقت آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا اور جو اقتباسات برطانوی اخبارات کے آئے تھے ان کو ترتیب دی۔ ایک ماہوار رسالے میں "سردار" اقبال علی شاہ صاحب برطانوی ..... کا ایک طویل مضمون سال گذشتہ کی موتمر پر پھر ملا اور وہی محمد علی کے متعلق گالی گفتاری پڑھنے میں آئی۔ بظاہر انڈیا آفس اور فارین آفس (دفتر خارجہ) کو سلطان ابن سعود کے متعلق ساری دنیا کے خیالات کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے کہ ایک سال ہو چکا اب تک وہی "سردار" اقبال علی شاہ "نمائندۂ مشرق" کی دروغ بافیاں جاری ہیں اس کے بعد ایک اقتباس پر نظر پڑی جس کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ بقول اخبار "سنڈے نیوز" پلڈ وکوٹہ کی

ریاست میں اگر آج کچھ ہو رہا ہے تو یہی کہ سینکڑوں احتجاجی جلسے منعقد کئے جا رہے ہیں جن میں موجودہ "ریجنسی" کو جاری رکھنے کے لئے بیتابانہ اظہار کیا جا رہا ہے اور اس اندیشے سے سب کا کلیجہ نکلا ہر نہ کو آ رہا ہے کہ کہیں "گوری رانی کا بیٹا" یعنی ان مہاراجہ پدوکوٹہ کا بیٹا جنھوں نے ایک نہایت حسین آسٹریلین عورت سے شادی کر لی تھی اور گوری قوم کی اس طرح "توہین" کرنے کی پاداش میں جلاوطن ہو کر ولایت میں سوکھ رہے ہیں کہیں ان کے بعد تخت نشین نہ ہو جائے اور ان کا بھائی جو بطور "ایجنٹ" کے ان کی جگہ حکومت کر رہا ہے ان کی وراثت سے محروم نہ ہو جائے۔

ان خبروں کے علاوہ ہندوستان کے چھوٹے سے چھوٹے فساد کی خبریں تھیں اور اخبارات کے "کٹنگز" کیا تھے ہندو مسلم اتحاد کی دھجیاں تھیں جو اڑائی گئی تھیں۔ انھیں میں اچھوت قوموں کے متعلق بھی ایک طول طویل "ٹائمز" کا مضمون تھا اور کون ہندوستانی ہے جو کہہ سکتا ہے کہ انگریزوں کو حق حاصل نہیں ہے کہ ہماری انوکھی "قومیت" کی اس طرح دھجیاں اڑائیں جب کہ ہر جگہ فسادات ہو رہے ہیں اور پانچ چھ کروڑ انسانوں کو اسی "قوم" کے اعلیٰ ترین افراد کے نزدیک چھونا بھی حرام ہے اور یہی نہیں بلکہ ان کا راستوں سے گذرنا بھی ممنوع ہے۔ دل دکھانے کے لئے یہی مواد کیا کم تھا کہ ۲۰ جولائی کے "ٹائمز" کا ایک طویل اقتباس یا درج بخیر "پنجاب کی بین الملل کشیدگی" "اصلاحات کا اثر" کی سرخیوں والا نظر پڑا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں روز کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے مگر ولایتی اخبارات میں مہینے بھر میں مشکل سے دو چار سطریں ہندوستان کے متعلق شائع ہوتی ہیں اور روائٹر تک اس سے زیادہ تار پر بھیجنے کو فضول خرچی سمجھتا ہے لیکن یہ طول طویل "خبر" جو باریک ٹائپ

میں بھی مشکل سے ایک کالم میں سمائی شملہ سے اسی دن تار پر بھیجی گئی جس دن کے "پرنٹنگ ہاؤس اسکوائر" میں طبع کی گئی اور یقیناً "ٹائمز" کے اپنے "نامہ نگار" نے انگلستان کے سب سے مہنگے اور سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ ضخیم اور سب سے زیادہ دروغ باف اخبار کا بہت سارا روپیہ اس تار کے ارسال کرنے میں صرف کرا دیا تھا کا تھکا ماندہ سے مخمور "ہمدرد" کا غریب ایڈیٹر مجبور ہو گیا کہ شملہ کی اس "خبر" کو پڑھے۔ پڑھا تو پنجاب کی کونسل کا وہ "مباحثہ" تھا جو مسٹر ادگلوی ڈپٹی کمشنر لاہور کے حکم امتناعی کے بعد ان کی قدردانی کے اظہار کا یعنی پولیس کے لئے ایک مزید منظوری پر اور اس کے بعد ایک سکھ رکن کی اس تحریک پر ہوا تھا کہ تمام عہدے کھلے ہوئے مقابلے کے ذریعے سے امیدواروں کو دئے جائیں یا ایسے انتخاب کے ذریعے سے جس میں جات پات مذہب اور رنگ کا کچھ لحاظ نہ رکھا جائے۔ میں نے "ہندوستان ٹائمز" میں اس "مباحثہ" کی رپورٹ پڑھی تھی اور یہ بھی پڑھا تھا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے تو غضب ہی کیا تھا کہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہندوستانیوں کی جگہ انگریزوں کو مقرر کیا جائے لیکن میں نے ان کی پوری تقریر کسی جگہ نہیں پڑھی تھی اور میرا گمان تھا کہ اس اخبار کے نامہ نگار نے غلط فہمی سے یہ قول ان سے منسوب کر دیا تھا۔ اس وقت بھی ان کی پوری تقریر میرے سامنے نہ تھی لیکن اس کے چند زہر آلود فقرے اس تار میں درج تھے۔ ان کے پڑھتے ہی میری نیند غائب ہو گئی اور میرے قلب کو اس قدر سخت دھکا لگا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اس وقت نظر بند نہیں ہوئے جب کہ جنگ عمومی میں ہم میں سے بہت سے نظر بند کر دئے گئے تھے وہ اس جنگ کے بعد بھی مارشل لا کے زمانے میں قید نہیں ہوئے حالانکہ خود پنجاب میں بعض بڑے سے بڑے ہندو اور مسلمان قید کر دئے

گئے اور عوام میں سے تو سینکڑوں ہی جیل خانوں میں بھر دیئے گئے۔ خلافت کے بارے مسلمانانِ ہندوستان نے یورپ کو ایک وفد بھیجا جس کا سرکردہ میں تھا تو ڈاکٹر صاحب کو اس قدر غیرت آئی (اور میں اس غیرت کو بجا سمجھتا تھا) کہ انھوں نے "دریوزۂ خلافت" نام کا قطعہ لکھا جس میں ارشاد فرمایا کہ ؎

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید — کہ از دیگراں خواستن مومیائی

لیکن جب "دریوزہ گرانِ خلافت" خالی کاسۂ گدائی لے کر یورپ سے لوٹے مگر اس کا تہیہ کرکے کہ یہ اتمامِ حجت تھا اس کے بعد یورپ کے سامنے ہرگز ہاتھ نہ پھیلائیں گے۔ اگر قوت نہ ہوگی تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا تک پسند کریں گے مگر یورپ کے آگے ہاتھ جوڑنا پسند نہ کریں گے اور اگر قوت ہوگی کھلا ہاتھ نہ بڑھے گا بلکہ بندھی ہوئی مٹھی سے کام لیا جائے گا تو مہاتما گاندھی نے ترکِ تعاون کی تحریک شروع کردی تھی اور خلافت اور پنجاب کے مظالم ہی اس تحریک کی بنا تھے۔ الحمد للہ کہ مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کے طلباء نے اس دعوت پر فوراً لبیک کہا اور اس امید پر کہ جس صوبے کے اسلامیہ کالج نے اسلام کے عشق میں ۴۰ طلباء سرحد پار بھیج دیئے تھے وہ اس میں مطلق تامل نہ کرے گا۔ ہم لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ کو دعوت الی الخیر دی تو ان کو علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ سے بھی زیادہ مستعد پایا اور اسی سے اندازہ کیا کہ طلباء کس قدر مستعد ہوں گے مگر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب سکریٹری تھے اور آپ نے جن سے ہم نے اسلام

سیکھا تھا نہ کسی مولوی سے ، ہماری دعوت کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پہلے علمائے کرام کا فتویٰ لے لیا جائے۔ خیر پانچ سو علماء نے بھی چند ماہ بعد فتویٰ صادر فرما دیا مگر ڈاکٹر صاحب نے اس پر بھی توجہ نہیں فرمائی البتہ اجتہاد فرمایا تو علم الاقتصاد کے ماہر کی حیثیت سے اس وقت جب کہ مہاتما گاندھی ایک کروڑ روپیہ جمع کرلائے اور وہ اجتہاد یہ تھا کہ اس سے ایک ٹیکنولاجیکل (صنعتی) انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا جائے جو ہندوستانیوں کو ٹھیک اس وقت صنعت وحرفت سکھانا شروع کرے جب کہ ہم لوگ چھ مہینے اور پوری جدوجہد کر کے انگریزوں سے سوراج لینے کے لئے بیتاب وبیقرار تھے۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ"، "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کا مصنف اور ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ کا نسخہ یقیناً یہ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز شغل کہ ڈاکٹر انصاری صاحب اپنے کسی مریض سے کہتے کہ "جاؤ تو ناچاری سے جھاڑ پھونک کرالو۔ اس طرح بچ سکتے ہو ورنہ بس اب تمہارا خاتمہ ہے"۔ اس کے بعد پھر پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور اگر اس سے پہلے حسرت کا قول صحیح نہ تھا تو اب ضرور صحیح ہو گیا کہ ع

آج وہ ننگ جوانی ہے جو زنداں میں نہیں

مگر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ کے نسخے والے طبیب حاذق انارکلی میں بیٹھے "پیام مشرق" لکھتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں بیجاپور کے جیل خانے میں "اسرار و رموز" پڑھا کرتا تھا اور رویا کرتا تھا اور "اقبال مرحوم" کے لئے اسی کے الفاظ میں دعا کیا کرتا تھا کہ جس کا ایمان اس قدر صحیح اور پختہ ہے، یا رسول اللہ خداوند کریم سے سفارش فرمائیے کہ اس کو عمل صالح کی بھی توفیق عطا فرمائے ؎

اے کہ احسانِ تو ناکس کس است | یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عز و جل | عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ | بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ
در عمل پایندہ تر گرداں مرا | آبِ نیسانم اگر گرداں مرا

ڈاکٹر اقبال صاحب کو میں "اقبال مرحوم" اسی زمانے سے کہنے لگا اور انھیں میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان کے سیکڑوں اشعار جو مجھے یاد تھے جب کہ کبھی بیجاپور کے جیل خانے میں زبان پر بھی آجاتے تھے تو قلب پر وہی اثر ہوتا ہے جو کسی ایسے خاندان والوں کے قلب پر ہوتا جن کی ایک چہیتی لڑکی کسی شرمناک فعل کے ارتکاب کے باعث گھر سے نکل گئی ہو اور انھوں نے خاندانی عزت و آبرو کی تباہی کے باعث اسے دل سے بھلانے کی کوشش کی ہو اور اتفاقیہ اس کے اوڑھنے یا پہننے کی کوئی چیز نکل آئے اور یکایک ان کی نظر اس پر پڑجائے، محبت اور شرم دونوں کی کشمکش اس سے زیادہ دل پر چوٹ لگانے والی کونسی جنگ ہوسکتی ہے۔ اس وقت بھی میں جو کچھ اپنے استاد (شاعری کے نہیں مذہب اسلام کے استاد) "اقبال مرحوم" کے متعلق لکھ رہا ہوں میرا دل ان کی محبت کے باعث تڑپ رہا ہے اور میرا دماغ میرے قلم کی مہمیز اور چابک دونوں سے تواضع کر رہا ہے کہ اگر قدم ذرا بھی سست پڑا تو کھال ادھیڑ دی جائے گی۔ حق پرستی کے میدان میں قدم کا ذرا بھی سست پڑنا الٹے پاؤں باطل کی طرف لے جانے سے کچھ ہی کم گناہ ہے۔ کاش اقبال ہمارا محبوب و معشوق اقبال ہم کو اس دورِ ارتداد میں اسلام کی صراطِ مستقیم دکھانے والا اقبال ہماری ہی طرح کسی جیل خانے میں ہوتا۔ کیا ہمارے بقول جیل سے نکل کر سیدھے امرت سر کی کانگریس میں

اگر شریک ہونے پر اقبال ہی نے یہ اشعار نہیں لکھے تھے :-

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

جیتوں کی قید کے زمانے میں تو پھر بھی صرف چند ہی مسلمان اور ہندوستانی اس سعادت سے مشرف کیے گئے تھے لیکن کراچی کے مقدمے کے بعد تو پچیس تیس ہزار اس سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے اور غالباً زاغ و زغن تک کا شہپر اس وقت قید و صید کے بند میں گرفتار تھا لیکن اقبال اس وقت بھی آزاد ہی رہے اور "الم تر انہم فی کل واد یہیمون" کے مصداق رہے۔ اس لیے جو ہم جیل خانے سے چھوٹے تو "اقبال مرحوم" ڈاکٹر سر محمد اقبال تھے۔ اس کے بعد کس نظم کی ان سے توقع کی جا سکتی تھی اور ان کے لیے سوائے دام اقبالہم کے کس چیز کی دعا کی جا سکتی تھی۔ بقول انھیں کے اب تو یہی کہا جا سکتا تھا کہ

واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست — اعتبارِ ملتِ بیضا شکست
واعظِ ما چشم بر بت خانہ دوخت — مفتیِ دینِ مبیں فتویٰ فروخت
چیست یاراں بعد ازیں تدبیرِ ما — رُخ سوئے مے خانہ دارد پیرِ ما

آج بھی سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور عبد الرحمٰن غازی جیل میں ہیں

ہیں مگر جو آزاد ہیں وہ آزاد ہیں اور اقبال کی دعا قبول ہو کر ان کو جو "ہمدم دیرینہ" اور ان کے "عشق عالم سوز" کا "آئینہ" ان کا "یار ہمدم" اور ان کے "رموز فطرت" کا محرم ہے

ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ از خیال این و آں بیگانۂ

ملا ہے۔ وہ محمد امین صاحب بیرسٹر (سابق ساگر چند) ہیں اور ان کی پرانی خواہش کہ ے

تا بجان او سپارم ہوئے خویش باز بینم در دل او روئے خویش
سازم از مشت گل خود پیکرش ہم صنم او را شوم ہم آذرش

پوری ہو گئی اور دونوں مل کر اس ہائے وہو میں مصروف ہیں کہ سب عہدے خالی کراؤ اور سب کے سب انگریزوں کو دو۔ انشاء اللہ کل ان کی تقریر کے وہ جملے نذر قارئین "ہمدرد" کروں گا جو قارئین "لندن ٹائمز" ہو چکے ہیں اور ان خیالات کا بھی ترجمہ کیا جائے گا جن کا ان جملوں کو سننے کے بعد "ٹائمز" کے شملوی نامہ نگار نے اظہار فرمایا ہے اور پھر کچھ "شمع و شاعر" کے منظوم مکالمے میں سے بھی نذر قارئین کرام کیا جائے گا جس کو اسی آج کے انگریز پرست نہ سہی انگریز پرور شاعر نے اپنے پچھلے جنم میں تصنیف کیا تھا اور ہم کو قید و بند کیا جان لینے اور دینے تک پر مستعد کر دیا تھا۔ قارئین کرام انتظار کی زحمت گوارا فرمائیں۔

(۲) طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ

ہمدرد ۱۹ اگست ۱۹۲۶ء

"ہمدرد" مورخہ ۱۴ اگست میں میں نے "لندن ٹائمز" کے شملوی نامہ نگار کے اس طول طویل تار کا ذکر کیا تھا جو اس نے پنجاب کونسل کے مباحثے سے متعلق ۹ جولائی کو روانہ کیا تھا جس میں سر محمد اقبال صاحب کے وہ زہریلے فقرے جو انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں قوم پر دروں پہ کسے تھے پہلی بار میری نظر سے گذرے۔ حسب وعدہ آج میں ان فقروں کو جو ۹ جولائی کو نذر قارئین "لندن ٹائمز" ہو چکے ہیں نذر قارئین "ہمدرد" بھی کرتا ہوں اور نیز ان خیالات کو جن کا ان فقروں پر "ٹائمز" کے شملوی نامہ نگار نے اظہار فرمایا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کل اور آج جو پنجاب کونسل کے اجلاس ہوئے ان میں جو موضوع سب سے زیادہ ممتاز تھا وہ پنجاب میں مختلف ملتوں میں پھیلے ہوئے بغض و عناد کا مسئلہ تھا۔ غیر سرکاری تقریروں کا عام مفہوم اس امر کا ایک کھلا ہوا اعتراف تھا کہ یہ مرض جمہوریت کے اس اصول کا نتیجہ ہے جو "اصلاحات" میں مد نظر رکھا گیا تھا اور نیز اس کی گہری اہمیت کا اور حال میں جو سخت شور مچایا گیا ہے کہ عہدے ہندوستانیوں کو دے جائیں اور اس کے خلاف دور دور تک جو رد عمل رونما ہو رہا ہے اس کا ایک ایسا اقبال تھا جسے ہمت والے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ جن بزرگ کے یہ الفاظ ہیں وہی آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں کہ خلافت پارٹی میں جو انتہا پسند حصہ ہے اس کے دو مسلمان ارکان نے اس پر احتجاج کے طور پر کہ بقول ان کے حال کے فسادات لاہور میں پولیس نے چند مسلمانوں کو مارا پیٹا تھا

پولیس کے محکمے کے لیے ایک چھوٹی سی مزید منظوری کی کل مخالفت کی تھی اس پر جو بحث
چھڑ گئی اس میں نہایت نازک صورت حالات کے ہوتے ہوئے پولیس کے عمدہ
طرز عمل پر اسے عام طور سے خراج تحسین دیا گیا۔ ان دونوں شخصوں نے جو انتظام
سرکار سے سخت بے زار تھے تقسیم آراء کا مطالبہ کیا مگر کسی نے ان کی تائید نہ کی اور
صاحب صدر نے جو سرکار کے نامزد کردہ نہیں ہیں بلکہ منتخب شدہ رکن کونسل ہیں
ان کے اس مطالبے کو لغو و بے معنی قرار دیا۔ اس کے بعد یہ بزرگ فرماتے ہیں کہ
ایک سکھ رکن نے آج ایک تحریک پیش کی جس میں اس کی سفارش کی گئی تھی کہ
گورنمنٹ کے تمام عہدے جہاں تک ممکن ہو ایک کھلے مقابلے کے ذریعے سے
پر کئے جائیں یا ایک ایسے انتخاب کے ذریعے سے جس میں "جات پات" اور
مذہب و رنگ کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ اس تحریک نے ایک عام بدگمانی کو مشتعل
کر دیا جو نہ صرف مسلمانوں کی طرف سے تیز دماغ ہندوؤں کے خلاف ظاہر ہونے
لگی بلکہ ہندو مزارعین کی طرف سے ان ہندوؤں کے خلاف جو شہروں میں
سکونت پذیر ہیں۔

خیر یہ تو سب کچھ تھا ہی لیکن اب سر محمد اقبال دام اقبالہم کا ذکر آتا ہے۔
تار کے اس حصے کی سرخی "چھوٹی قوم پروری" ہے اور نامہ نگار موصوف اس
کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ قابل ذکر بیان ڈاکٹر سر محمد اقبال
کا تھا جو ایک ممتاز آگے کی کرسیوں پر بیٹھنے والے اور معتدل خیالات کے مسلمان
ہیں اور ایک ایسے شاعر ہیں کہ سارے ہندوستان میں ان کا شہرہ ہے (ولے
کوئی ہم سے پوچھے کہ ہم انھیں کیسا شاعر سمجھتے ہیں اور کس قدر تعجب کرتے ہیں کہ
ان کا شہرہ ساری دنیا میں بھی اس قدر کیوں نہ ہوا جس قدر کہ ہندوستان میں اور
بالخصوص مسلمانوں میں گھر گھر ہے۔) نامہ نگار رقمطراز ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف

نے ارشاد فرمایا کہ لاہور کے حال ہی کے فسادات کے بعد مسلمانوں نے ایک وفد ڈپٹی کمشنر کے پاس جو ضلع کا مجسٹریٹ ہے اس غرض سے بھجوایا کہ پولیس جن ہندوؤں سے تفتیش کرا رہی تھی انکے خلاف مسلمانوں کی بے اعتمادی کا اظہار کیا جائے اور ہندوؤں نے بھی ایسا ہی وفد مسلمان تفتیش کنندگان کے خلاف بے اعتمادی کے اظہار کے لئے بھجوایا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں بھی مسلمانوں کے وفد کے ساتھ گیا تھا۔ مجسٹریٹ نے جواب میں فرمایا کہ "اصلاحات سے پہلے ۱۴۰ برطانوی افسر تھے جن کی خدمات سے ایسے کاموں میں فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا، اب صرف ۴۰ ہیں۔ تم دونوں یوروپین افسروں کو مانگتے ہو لیکن ہمارے پاس تمہاری درخواست پوری کرنے کے لئے کافی یوروپین افسر نہیں ہیں۔

نہیں معلوم کہ مسٹر اوگلوی کے اس جواب کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں کے وفود نے کیا کیا لیکن ہمیں یقیناً اس کی آرزو ہے کہ ہمیں ڈاکٹر صاحب بتا دیں کہ خود انہوں نے کیا فرمایا۔ "ٹائمز" کا نامہ نگار اس پر مطلق روشنی نہیں ڈالتا اور بظاہر اس کا بھی امکان ہے کہ مسٹر اوگلوی کا فقرہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس قدر لاجواب ہو کہ وہ خاموش اور لاجواب ہو کر واپس تشریف لے گئے ہوں۔ اس کے بعد نامہ نگار لکھتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بعض عہدے جو پہلے برطانوی جنٹلمینوں کو ملتے تھے وہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے حصے میں آگئے لیکن گورنمنٹ نے جس وقت یہ تبدیلی کی، اس نے ایک بڑی غلطی کی اور وہ مزید برطانوی افسروں کا خیر مقدم کریں گے۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ اس پر قہقہوں اور تحسین کی آوازیں آنے لگیں اور ان کے خلاف چند آوازیں "نہیں" "نہیں" کی بھی آئیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے چلا کر ارشاد فرمایا کہ میں اس رائے کا اظہار اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سمجھ بوجھ کر کرتا ہوں اور

میں ان "نہیں" "نہیں" کی آوازوں کی حقیقت کو بھی خوب سمجھتا ہوں۔ یہ ایک صحیح قومی
قوم پرور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ قوم پروری کا نام تو فیشن کے طور پر اس ملک کے
لوگوں کی زبان پر چند برسوں سے ہے لیکن وہ اس کوک مرغی کی گکڑوں کوں
ہے جس نے انڈا دینا بند کر دیا ہو۔ نامہ نگار موصوف بھلا کیوں نہ کہے گا کہ اس پر
خوب قہقہے پڑے اور عام طور پر تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اس کے بعد وہ رقمطراز
ہے کہ اس مباحثے میں متعدد نظیریں مختلف ملتوں کے درمیان اس بے اعتمادی
کی ملیں جو اندر ہی اندر عجیب لطیف اور باریک طریقے پر کام کر رہی ہے۔ یہ ظاہر
کیا گیا کہ لاہور یونیورسٹی کے طالب علموں کے امتحانات میں جوابوں کی کاپیوں پر
مصنوعی نام اس لئے لکھے جاتے ہیں کہ ممتحنوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ اگر
حقیقی نام لکھے جائیں تو وہ تعصب مذہبی کا ثبوت نہ دیں گے اور جب اس کا
مطالبہ کیا گیا کہ سرکاری نوکریاں دینے کا کام ایک ایسے پبلک سروس کمیشن
کے سپرد کر دیا جائے جو خاص اسی کام کے لئے بنایا جائے تو عام طور پر یہ آواز
بلند کی گئی کہ "پھر تو اس کے ارکان کو یورومپین ہی ہونا چاہیے بشرطیکہ اس سے
انصاف کرانا ہو۔" اس کے بعد نامہ نگار صاحب کیوں نہ رقمطراز ہوں کہ بالآخر
محرک نے التجا کی کہ تحریک کو واپس لینے کی اجازت دی جائے کیونکہ اس نے
کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ ساری فضا پر ملت پرستی کی روح چھائی ہوئی ہے۔

اس ساری داستان کا لب لباب جو جناب نامہ نگار صاحب نے نکالا ہے
یہ ہے کہ "اصلاحات" اور ہندوستانیوں کو عہدے دیے جانے کے مطالبے کے
خلاف جس ردعمل کا کونسل میں انکشاف ہوا ہے اُسے پنجاب کی Intelli-
gentsia (یعنی سمجھدار اور تعلیم یافتہ طبقے) کا عام جذبہ اور ان کے جی کی بات
خیال کرنا چاہیے۔ آج بعض اوقات جو شعلے بھڑک گئے وہ اس دبی ہوئی تحت

حرارت کی علامت تھے جو مباحثے کی تہ میں تھی اگرچہ تقریروں کے درمیان میں بار بار ہنسی مذاق ہوتا رہتا تھا اور قہقہے بھی اٹھتے رہتے تھے اور جو اثر ایک سننے والے کے دل پر اس سے پیدا ہوتا تھا وہ یہی تھا کہ عام طور پر اس سے ایک طرح کی خلاصی محسوس ہو رہی تھی کہ غلط اصولوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کا مردہ لاش میں سے گھسیٹ کر آخر کار باہر نکال کر ڈال دیا گیا ہے اور بحمد اللہ اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی کہ سرگرم سیاسیین اسے چھپائے رکھنے کی کوشش جاری رکھیں۔ تاہم گذشتہ تجربے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس ردعمل کے تقاضے پر اگر "اصلاحات" کی اصلاح کے لئے کوئی فوری کارروائی کی گئی تو قوم پہلوی میں پھر جان پڑ جائے گی اور جو لوگ حالات کا بغور مطالعہ کر رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس مرض کے جو اسباب ہیں انھیں اب سے بھی زیادہ خراب نتائج پیدا کرنے پڑیں گے تب کہیں جا کر مؤثر تدابیر علاج کے لئے کام میں لائی جائیں گی تب تک یہ ہو۔ موجودہ صورت حالات کا سب سے زیادہ خطرناک رخ یہ ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلم کشیدگی اب مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان تلخی کی شکل میں مبدل ہو رہی ہے اور بغض و عناد کے شعلے اب پھیلتے پھیلتے شہروں سے گاؤں تک میں پہنچ رہے ہیں۔

میرے مسلمان اور ہندو بھائی آج اس سارے تار کو پڑھیں اور بار بار پڑھیں اور غور سے پڑھیں اور اس کا اصلی مطلب سمجھنے کی کوشش کریں کل انشاء اللہ میں بھی اس کے متعلق اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں گا اور بتاؤں گا کہ "شمع و شاعر" کا مصنف کس طرح "لندن ٹائمز" اور اس کے موکلوں کا آلۂ کار بن رہا ہے۔ آج طبیب حاذق ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب سے صرف اسی قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بھی اس تار کو پڑھ کر غور فرمالیں کہ جھوٹی

قوم پروری کا الزام تو ہمارے سر آنکھوں پر مگر کیا خود ان کی دولت پروری اس سے بہت زیادہ بھی نکلی جس کی گلاوں کوں خود ان کے دوست آنریبل چودھری شہاب الدین صاحب جو پنجابی زبان میں اشعار آبدار بھی لکھا کرتے ہیں دگو ان کا مضمون ناک بنگلے اور ایسے ہی لطیف موضوعوں تک محدود رہتا ہے "شمع و شاعر" اور "شکوہ" و "جواب شکوہ" تک نہیں جاتا) اسی کونسل کی کرسی صدارت سے سنایا کرتے ہیں! ہم چودھری افضل حق صاحب اور ڈاکٹر محمد عالم صاحب ہی کی قوم پروری کا رونا رویا کرتے تھے مگر جب ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کی بھی لت پروری کی "تمت" اور "تمام شد" یہ ہے کہ چند اور مشیر ادگوہی پنجاب کو دے دیے جائیں تو آج ہی تمام خرابیاں دور ہوتی جاتی ہیں تو مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ بہتر ہو کہ سارے ہندوستان کو تو مطلوبہ سوراج دے دیا جائے مگر ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب دام اقبالہم کے پنجاب کے لیے سر مائیکل اوڈوائر اور کرنل فرینک جانسن اور کرنل او برائن اور مسٹر باسورتھ اسمتھ کو پھر اس پر حکومت کرنے کے لیے بلایا جائے اور اگر ممکن ہو تو جنرل ڈائر کو جلد جنت نصیب کرا دی جائے جو یقیناً ان کے نزدیک ان کے زیر سایہ پنجاب پر مارشل لا کا نفاذ ہو گا۔

(۳) "شاعرِ وطن" اقبال

ہمدرد ۱۰ اگست ۱۹۲۷ء

کل کے "ہمدرد" میں قارئین کرام نے وہ پورا تار پڑھ لیا ہوگا جو "لندن ٹائمز" کے شملوی نامہ نگار نے "پنجاب کونسل کے دو مباحثوں کے متعلق بصرفِ کثیر ارسال کیا تھا اور جس کا سب سے زیادہ "قابلِ ذکر" حصہ وہ تھا جس میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ہماری جمہوری قوم پروری کو کوک مرغی کی ککڑوں کوں کا لقب عطا فرمایا تھا۔ آج کون نہیں جانتا کہ ہندوستانیوں کو چند سال سے یہ امید دلا کر اُلو بنایا جا رہا ہے کہ اب ایک نیا کمیشن آئے گا اور "اصلاحات" کی توسیع کرے گا، اور دو ڈھائی برس سے تو یہی ہوتا رہا ہے کہ ہم تاریخ کے غلام نہیں ہیں ۱۹۲۹ء سے پہلے بھی کمیشن بھیجا جا سکتا ہے لیکن یہی کہتے کہتے اتنے برس اور گذار دیئے گئے اور اب کمیشن ۱۹۲۹ء سے پہلے مقرر بھی کیا جائے گا تو صرف اس لئے کہ اول تو "ٹوری" یا قدامت پسند پارٹی کو اپنی حیاتِ مستعار کا بھروسہ نہیں رہا۔ پچھلے پانچ ہنگامی انتخابات میں لبرل اور لیبر دونوں پارٹیوں کو ٹوری پارٹی سے زیادہ ووٹ لے ملے ہیں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۹ء کے عام انتخابات میں اس پارٹی کو شاید شکست ہو جائے گی اور عنانِ حکومت لیبر یا لبرل پارٹی یا ان دونوں کی مشترکہ حکومت کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور دس برس کے لئے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کوئی اور حکومت کرے گی؛ کہ یہ ہوا آزادی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ دوسرے کمیشن کے اس وقت مقرر کئے جانے کا؛ جبکہ ہندو، مسلمان (اور اب تو سکھ بھی) بظاہر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں؛ یہی نتیجہ ہوگا کہ ہندوستانی

توم کسی مطالبے پر بھی اتفاق نہ کر سکے گی، پنڈت مالوی اور ڈاکٹر مونجے ایک چیز مانگیں گے
تو سر محمد شفیع اور سر عبد الرحیم دوسری۔ اس لئے انگریز کسی کی بات بھی نہ مانیں گے
اور وہی کریں گے جو خود ان کو مطلوب ہے، تو ۱۹۱۹ء کی طرح کوئی بھی مخالفت
نہ کر سکے گا۔ ہندو اور مسلمان دونوں اسی میں مگن رہیں گے کہ خیر ہمیں کچھ نہ ملا تو کیا
ہوا، دوسروں کو بھی تو کچھ نہیں ملا ؎

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی
گو مشت خاک ما ہم برباد گشتہ باشد

ہندوستان کی موجودہ فضا سے فائدہ اٹھا کر اب "لندن ٹائمز" کا نامہ نگار، جسے حکومت ہند اور حکومت برطانیہ دونوں کا ترجمان بھی ظاہر کیا جا رہا ہے، اس مضمون کے تار شملہ سے ارسال کر رہا ہے کہ ۱۹۲۹ء میں جو "اصلاحات" منظور کی جائیں وہ ہرگز ۱۹۱۹ء کی "اصلاحات" کی توسیع نہ کریں بلکہ ۱۹۱۹ء کی "اصلاحات" کی بھی "اصلاح" ہی کر دیں یعنی ان "اصلاحات" کی بھی تخفیف ہی کر دی جائے اور جو کچھ برائے نام "اختیارات" ۱۹۱۹ء میں ہندوستانیوں کو عطا ہوئے تھے وہ بھی واپس لے لئے جائیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے باغی "بابوؤں" نے شور مچا کر "ملکی" مناصب کا ایک بڑا حصہ دھروا لیا تھا، ہر صوبے کی ایگزیکٹو کونسل میں ہندوستانی داخل ہو گئے، مرکزی حکومت کی ایگزیکٹو کونسل میں داخل ہو گئے، وزارتیں بھی انھوں نے حاصل کر لیں اور انگریز استادوں کا سب سے لائق شاگرد سنہا، جسے سب سے اول کلکتہ ہائی کورٹ کا ایڈووکیٹ جنرل بنایا گیا، پھر جسے سب سے اول حکومت ہند میں جگہ دی گئی، پھر جسے مہاراجہ بیکانیر اور لارڈ میسٹن کے ساتھ جنگ کے زمانے میں خود برطانیہ کی وزارت میں خاص جگہ دی گئی، پھر ایوان امرا کا رکن، لارڈ اور نائب وزیر ہند بنایا گیا اور جو بالآخر بہار کے صوبے

کی گورنری تک لے مرا۔ اس کے بعد تو فوج کے وفادار بھی، جو فرانس میں صاحب لوگوں
کو اپنی آنکھوں سے بھاگتا دیکھ چکے تھے اور خود سینہ سپر ہوئے تھے اور جن کی عادتیں یورپ
کی زمین پر قدم دھرتے ہی مارسلیز کی میموں نے بگاڑنا شروع کر دی تھیں، پیرس، لندن
اور برائٹین کا تو پوچھنا ہی کیا ہے، وہ بھی کچھ کلبلائے۔ اور یہ دیکھ کر "ملکی" بابوؤں
نے اور بھی شور مچایا اور انگلینڈ کمیٹی بنی اور جمعداری کے "کمیشن" کو ناکافی سمجھ کر
اب تو لفٹننٹی اور کپتانی، میجری اور "کرنیلی" بلکہ "جنرلی" تک کے کمیشنوں کا مطالبہ
کرنے لگے اور ہندوستان ہی میں سینڈہرسٹ کی طرح کا فوجی اسکول بنوانے پر اڑ گئے
اس کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی ہے اگر اس پر عمل بھی کیا گیا تو کئی نسلوں بعد ہندستان
کی حفاظت وہ ہندوستانی کرنے لگیں گے جو ہندوستان تو ہندوستان بجائے، اور
فرانس کی بھی حفاظت بارہ برس ہوئے کہ جا کر آئے، لیکن یہ بھی صاحب لوگوں
کو گوارا نہیں اور "ٹائمز" کے شملوی نامہ نگار صاحب اور وہ بڑی ہستیاں اور جماعتیں
جن کی طرف سے وہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں اس اصول پر کاربند ہوتے ہوئے کہ
"بہ مرگش بگیر تا بہ تپ راضی شود" یہ ارقام فرمانے میں مصروف و مشغول ہیں کہ ہندستانیوں
کو ہندوستانیوں پر اعتماد ہی کہاں ہے، وہ تو صاحب لوگوں ہی پر اعتماد کرتے ہیں،
انھیں تو انگریز حکام درکار ہیں، فوج کے کمیشن ہندو مسلمانوں کو دینا تو درکنار جو "ملکی"
مناصب بھی انھیں گذشتہ بیس سال میں دیے گئے وہ بھی ایک حماقت تھی، "اور اصلاحات"
کی یقیناً ضرورت ہے لیکن وہی "اصلاحات" "اصلاحات" ہیں جو گذشتہ "اصلاحات"
کی اصلاح کریں اور جمہوریت کا جو غیر موزوں عنصر گذشتہ "اصلاحات" کا جزو بنا دیا
گیا تھا وہ تو ہندوستان کے لیے سم قاتل ہے۔ یہ مغرب کا بیج ہے، لے وہاں سے
لا کر مشرق کی زمین میں بونا سخت حماقت تھی، نہ یہاں کی دھوپ اسے موافق،
نہ یہاں کی گرم ہوا، نہ یہاں کی سوکھی ہوئی زمین۔ یہاں تو انگریز کلکٹر کی مطلق العنانی

ہی موزوں ہے۔ یہ ضلع کا Grand Mogul (مغلِ اعظم) ہی
فسادات کو روک سکتا ہے اور امن و امان کو قائم رکھ سکتا ہے۔ بس ہندوستانیوں کو
تو کھیتی باڑی کر کے ہمیں اشیائے خام بھیجنے کی توفیق عطا کی گئی ہے۔ صنعت و حرفت
ہمارا شغل ہے۔ تجارت کا سلیقہ صرف ہم کو عطا ہوا ہے اور حکومت ہمارے ہی
حصے میں آئی ہے۔

اس بیسویں صدی میں بھی اگر ہندوستانی اتنے مبتلائے توہم ہیں کہ ایک
ان دیکھے خدا پر ایمان رکھتے ہیں تو اس کا وجود بھی ان کے ذہن میں ہمارے
حاکم ضلع کو دیکھ کر آیا ہے اور ہر ہندوستانی خدا کی حمد و ثنا میں اس سے زیادہ کچھ
نہیں کہہ سکتا کہ ؎

اس کی قدرت کا بیاں کوئی کس طرح کرے
میں تو اللہ تعالیٰ کو کلکٹر سمجھا

اس کے لیے مساوات وغیرہ کے خیالات سنکھیا کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر مساوات جیسے
الفاظ کا کچھ مفہوم وہ اپنے ذہن میں رکھنا چاہتا ہے تو اپنے ملک کے ایک شاعر اکبر
سے (جس نے ساری عمر سرکاری خدمت کر کے ایک اعلیٰ عہدہ حاصل کر لیا تھا اور اسی
کے ساتھ کچھ تجربہ اور سیاسی احساس) اس سبق کو سیکھ لے کہ ؎

"برٹش رول" کو سب سے وہی بہتر سمجھا
جو ہر ایک گورے کو نفٹنٹ گورنر سمجھا

شملہ اور لندن میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ پنجاب اور دوسرے ہندوستانی
صوبوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال
صاحب خوب شعر کہا کرتے تھے اور غالب کی طرح یہ کہہ کر کہ ؎

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں   میں کہاں اور یہ وبال کہاں!

عدالتوں میں جا کر خاصی وکالت بھی کر لیا کرتے تھے اور جو وقت بچتا تھا اس میں اسلامیہ کالج اور پنجاب یونیورسٹی کی بھی خدمت کر لیا کرتے تھے۔ اب نہ معلوم کیوں انھیں سوجھی کہ کونسل کو چلئے اور وہ پنجاب کی جمہور سے رائیں حاصل کرنے کے لئے در بدر پھرے اور اپنے مقابل کو بالآخر ہرا کر ملک معظم اور ان کے وزرا کی وفاداری کا حلف اٹھا کر پنجاب کونسل میں شریک ہوئے۔ ہمیں اسی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ خدا نے جس شخص کو "شمع و شاعر" اور "اسرار و رموز" کے لکھنے کی عجیب و غریب قدرت عطا فرمائی تھی وہ کہاں چودھری شہاب الدین کی زیر صدارت پنجاب کونسل میں.... کرنے جا رہا ہے۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ وہاں جا کر وہ محمد امین صاحب بیرسٹر (سابق سالگرچند) کی طرح یہ مطالبہ کرے گا کہ جو چند بڑے عہدے اس وقت تک ہندوستانیوں کو دئے گئے ہیں وہ بھی ان سے چھین لئے جائیں اور انگریزوں کو دے جائیں، اور بالخصوص جب کہ کم از کم پنجاب کے مسلم اخبارات اسے ان عہدوں میں سے ایک کے لئے امیدوار بنا رہے تھے۔

میں کل ہی کہہ چکا ہوں کہ ہماری قوم پروری پر جھوٹے ہونے کا جو الزام انھوں نے لگایا ہے وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ یقیناً سیاسیئین کی ایک بہت بڑی جماعت کی قوم پروری آج جھوٹی ثابت ہو رہی ہے۔ اگر ہماری قوم پروری سچی ہوتی تو ملابار کے دردناک واقعات کے بعد نہ سنگھٹن اور شدھی کی تحریکوں کو ہندو لیڈر اس طرح جذبۂ انتقام سے مخمور ہو کر شروع کرتے، نہ مسلمانوں میں لیڈری کے دعویدار اس اثر سے فائدہ اٹھا کر اس جذبۂ انتقام نے عام مسلمانوں میں پیدا کیا تھا تنظیم اور تبلیغ کا نام لیتے پھرتے۔ سب سے زیادہ مضبوط دلیل ہماری قوم پروری کے جھوٹے ہونے کی وہ کانگرسی ہندو ہیں جو آج مسلمانوں سے کھلم کھلا دشمنی رکھتے ہیں۔ الحمد للہ کہ ایک دو کے علاوہ اور وہ بھی پنجاب ہی میں، خلافت اور کانگرس

والے مسلمان بہت سے کانگرسی ہندوؤں کے اس جذبۂ بغض و عناد سے اس طرح متاثر نہیں ہوئے کہ انھوں نے بھی اس جذبے کو اپنے دلوں میں جگہ دی ہو بلکہ وہ صراط مستقیم ہی پر قائم رہے۔ مگر ہندو کہہ سکتے ہیں کہ وہ ویسا ہی کتنے : باقی مسلمانوں سے صبر نہ ہوسکا اور لیڈری کے دعویداروں نے انھیں اس طرح گمراہ کر دیا کہ اگر ابتدا ان کی طرف سے نہ ہوتی تو بعض اوقات جذبۂ انتقام سے مخمور ہو کر انتہا وہی کر دیا کرتے ہیں۔ یہ خود ڈاکٹر محمد اقبال صاحب لاہور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ ٹھیک اسی شب کو جبکہ شواجی کی سہ صد سالہ برسی منائی جا رہی تھی نہتے مسلمانوں پر حملہ کیا گیا اور ان کو شہید کیا گیا۔ جو سکھ اور ہندو اس ہولناک جرم میں شریک تھے وہ کسی سچی قوم پروری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ لیکن باوجود خود ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی پوری اور آن تھک کوشش کے ۳ مئی کی شب کے جرم کا جو انتقام ۴ مئی کی شب کو مسلمانوں نے لیا وہ بھی سچی قوم پروری کا مظاہرہ نہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ افسوس ہے کہ پنجاب کے ہندو، سکھ اور مسلمان اخبارات نے بھی جو تبصرہ ان ہولناک واقعات پر کیا وہ بھی سچی قوم پروری کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ یہی حال اب بھی ملتان کے واقعات کے بعد رونما ہو رہا ہے اور ہماری جھوٹی قوم پرستی کی نمائش کر رہا ہے۔

لیکن کیا ڈاکٹر صاحب سچی قوم پروری کو بھی پسند نہیں فرماتے؟ اگر وہ اپنے ابتدائی کلام پر غور فرمائیں گے تو انھیں خود اقبال کرنا پڑے گا کہ ان کے ابتدائی خیالات انھیں کے بعد کے اس سچے اصول سے کہ ع

"ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"

کس قدر خلاف تھے۔ کیا انھیں نے یہ "ترانۂ ہندی" موزوں نہیں فرمایا تھا جس کا مطلع ہے کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

میرے نزدیک تو باوجود میری اس قوم پروری کے بھی جب اقبال صاحب جیسی قوم پروری کہیں گے ہندوستان سارے جہاں سے اچھا نہیں اور جو محبت میرے دل میں ہندوستان کی ہے وہ اسی جذبے کی بنا پر ہے کہ ؎

حب وطن از ملک سلیماں خوش تر
خار وطن از سنبل و ریحاں خوش تر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد
می گفت گدا بودن کنعاں خوش تر

خیر اس بحث کو جانے دیجیے مگر اقبال صاحب یقیناً ایک زمانے میں تو قوم پروری کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انھوں نے "ترانۂ ہندی" تصنیف فرمایا اور اس کے ذریعے سے ہمیں یہ نہایت ہی صحیح تعلیم دی کہ ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اسی ترانے میں انھوں نے ہندوؤں کی بھی ترجمانی کر کے فرمایا ہے کہ ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

کم سے کم ایک مسلمان کی حیثیت سے تو مجھے افسوس ہے کہ یونان و مصر و روما کی طرح ہندوستان میں بھی بت پرستی اور اسی قسم کے توہمات کا خاتمہ نہیں ہوا اور نہیں

اور جو پیٹر، اپالو اور وینس آئسس اور اساریس کی طرح ہندوستان کے بھی دیوتا اور دیویاں اپنے پوجنے والوں کے دل و دماغ سے محو نہیں ہو گئیں۔

"ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" باوجود اس مشتبہ شعر کے کہ ؎

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

"ترانۂ ہندی" سے میرے نزدیک صحیح تر خیالات کی تعلیم دیتا ہے لیکن جب "نیا شوالہ" لکھنے کا وقت آتا ہے تو اقبال بھی قوم پروری کے ترجمان اور نمائندے بن کر گیا خوب فرماتے ہیں ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اب میں اس بے مثل نظم کے لکھنے والے سے پوچھتا ہوں کہ اگر میری طرح آج ان کا دل بھی ہندوستان کی جھوٹی قوم پروری پر رات دن روتا رہتا ہے تو

کیا اس کا علاج یہ ہے کہ انگریزوں سے کہا جائے کہ جو عہدے اور جو مناصب ہماری بے نظیر فیاضی سے "ہندوستانیوں کے قبضے میں" آگئے ہیں مگر جو پہلے صرف "برطانوی جنٹلمینوں" کو ملا کرتے تھے وہ پھر تم ہندوستانیوں سے لے لو، ہم "مزید برطانوی افسروں کا خیر مقدم کریں گے"؟ لاہور کے فسادات کے بعد ہندوستانی افسرانِ پولیس نے تحقیقات و تفتیش شروع کردی اور مجھے اس پر ذرا بھی تعجب نہیں کہ یہ افسرانِ پولیس لاہور کے ان تعلیم یافتہ شہریوں سے زیادہ سچی قوم پرستی کے نمائندے ثابت نہیں ہوئے جن کی صحافت اور خوش بیانی نے یہ فسادات کرائے تھے اور جو خود اخباروں اور کمپنیوں کے دفاتر اور سرکاری دفتروں اور کالجوں اور اسکولوں میں اطمینان سے بیٹھے ہوئے اپنی ہی لگائی ہوئی آگ پر بجائے پانی کے تیل چھڑک رہے تھے اور خود ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کو کہ امن و امان کسی طرح قائم ہو جائے ناکام کرا رہے تھے۔ لیکن کیا اس کا علاج یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استدعا کرتے کہ ان چھوٹے قوم پروروں کی جگہ سچے دشمنانِ قوم بھیجے ہو کسی کے ساتھ رعایت نہ کریں اور "بر ہر دو لعنت" کہتے ہوئے ہندو مسلمانوں دونوں کا چالان کر کے انھیں عدالتوں سے سزائیں دلوائیں؟

میں نہیں جانتا کہ مسٹر او گلوی کیسے آدمی ہیں۔ ان کو عشق ہندوستان سے ہے یا اپنی بیش قرار تنخواہ سے اور اس مطلق العنانی کے ساتھ بادشاہت سے جو صرف ہندوستان ہی میں انھیں نصیب ہو سکتی ہے، نہ کہ اپنے وطنِ مالوف میں لیکن جن افسروں کے متعلق انھوں نے فرمایا کہ پہلے ہمارے پاس اس کام کے لئے ۱۲۰ افسر تھے مگر اب "اصلاحات" نے گھٹا کر انھیں فقط ۹۰ کر دیا ہے۔ ان کے متعلق میں ڈاکٹر صاحب سے اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خواہ ۱۲۰ ہوں یا ۹۰ حقیقی طاقت آج بھی انھیں کے ہاتھ میں ہے اور اگر وہ چاہتے کہ انصاف ہو، کوئی

لت کسی پر زیادتی نہ کر سکے، سب پہلے آدمیوں کی طرح، پڑوسیوں کی طرح مل جل کر
رہیں، ان میں روز دنگا فساد نہ ہوا کرے، روز جوتیوں میں دال نہ بٹا کرے، روز
سر پھٹول نہ ہو، تو پنجاب کب کا ان فسادات سے نجات پا چکا ہوتا اور جو بچے کھچے
"انگریزی افسر آج بھی اس کام پر مامور ہیں وہ اگر آج بھی یہ چاہیں تو لاہور اور
ملتان جیسے فسادات آج بند ہو سکتے ہیں۔ لیکن حضرت، وہ کمیشن جو آرہا ہے
اور "اصلاحات" کی "اصلاح" کی جو ضرورت ہے ان کا کیا حشر ہوگا اور ہندوستانیوں
کو ملکی اور فوجی عہدے دیے جانے کا جو مطالبہ ہو رہا ہے اس کا کیا علاج کیا
جائے؟ اگر فرعون ذی الاوتاد کی یہ "کھونٹیاں بھی زمین سے اکھاڑ کر پھینک
دی گئیں تو پھر ہامان سے کہہ کر شملہ پر وہ اونچا محل کون بنوائے گا جہاں سے
موسیٰ کا خدا نظر آسکے؟ تب تو ساحر تک بلا اجازت فرعون رب ہارون و
موسیٰ پر ایمان لے آئیں گے اور فرعون کے اس فرمان کو کون واجب الاذعان
سمجھے گا کہ "انا ربکم الاعلیٰ" اور "انا قاہر فوق عبادی"؟

میں نہیں کہتا کہ آپ جھوٹی قوم پروری کے دام فریب میں پھنس جائیے،
گر مالوی جی اور لالہ جی، مونجے اور کیلکر کے جال کی اس جال کے مقابلے میں حقیقت
ہی کیا ہے جو لندن سے شملہ اور شملہ سے لاہور تک پھیلا ہوا ہے۔ میں تو ہندو مہاسبھا
کے جال میں نہیں پھنسا مگر ڈاکٹر صاحب ضرور "ٹائمز" کی امت کے جال میں پھنس گئے۔
میں اس کو قبول کرنے کے لیے تیار رہوں کہ شاید آج بھی ڈاکٹر اقبال کو اس کا سخت
قلق ہے کہ مدت سے دل کی بستی سونی پڑی ہوئی ہے، لیکن میں اس کا ہرگز
قائل نہیں کہ اس کا علاج اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس دیس میں ایک نیا شوالہ
بنایا جائے جس میں بجائے لالہ لاجپت رائے کے سٹراڈ گلوی کی مورتی بٹھا دی
جائے، چاہے برہمن برا مانے یا بھلا، میں نہ اس کے صنم کدے کے پرانے بتوں کو

سجدہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب دام اقبالہم کے ان نئے
بتوں کو جن کا وہ خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میرا تو دونوں بتوں کو دور ہی سے
سلام ہے اور دونوں کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض ہے کہ ؎

فرشتوں نے کیا ہے ان کو سجدہ
نہیں لے بت یہ نیچے تیرے بس کے (وجوہر)

میں بھی ایک اونچے تیر تُکے کی تلاش میں احرامِ سفر باندھ چکا ہوں اور یقیناً دنیا کے
تیر تُکوں سے میرا تیر تُکا بھی اونچا ہے۔ اس کا کلس دامانِ آسماں سے ملا ہوا نہیں ہے
بلکہ اونچے سے اونچے آسمان سے بھی زیادہ بلندی پر وہ عرش و کرسی بچھی ہوئی ہے
جس پر میرے دیوتا کی وہ مورتی ہے جسے نہ کوئی دیکھ سکے، نہ چھو سکے اور پھر بھی وہ
میری شہ رگ سے وہ قریب تر ہے۔ لیکن اس کا تو مجھے کبھی بھی شبہ تک نہ ہوا تھا
کہ اقبال کا اونچا تیر تُکا فقط شملے کی بلندی تک اونچا ہے۔

آج کا مضمون بہت طویل ہو گیا ہے۔ کل انشاء اللہ میں اس "مذہبی"
بت پرستی کے متعلق بھی کچھ عرض کروں گا جس نے بظاہر ڈاکٹر سر محمد اقبال دام اقبالہم
کو اجانب پرستی کی طرف مائل کر دیا ہے اور پھر "شمع و شاعر" کے مصنف سے پوچھوں گا
کہ کیا وہ "شمع" کے پیغام کو خود بھی بھول گیا اور خود ہی "شاعر" بن گیا جس نے "شمع"
سے ایک سوال کر کے وہ لاجواب جواب پایا تھا جو "بانگ درا" کا سب سے
اونچا شعر ہے۔ قارئین کرام انتظار فرمائیں۔

(۲) شاعرِ اسلام اقبال

ہمدرد ۱۹ اگست ۱۹۲۶ء

میں ابتدا ہی میں عرض کرچکا ہوں کہ مجھے آج کل کی سیاسی قوم پروری کے ایک بڑے حصے کے چھوٹے ہونے کا اعتراف ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہندستان میں آج کیا چیز ہے کیا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا کچھ ابتدائی کلام کل نذرِ قارئین کرام کیا گیا تھا جس میں انھوں نے اپنے حب وطن کو نظم میں ظاہر فرمایا تھا اور جس کی ابتدا "ترانۂ ہندی" سے ہوئی تھی۔ کل کا مضمون ختم کرنے کے بعد تھک تھکا کر میں پلنگ پر لیٹ گیا اور جی چاہا کہ گراموفون پر کچھ گانا سنوں۔ ۱۹۱۱ء کا ایک "ریکارڈ" لگایا گیا اور میرے برادر عزیز منظور محمود صاحب نے اپنی دلکش آواز پھر سولہ برس بعد مجھے سنائی۔ پہلا شعر ہی ایک تیر کی طرح جگر کے پار ہوگیا

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

میں نے منظور صاحب کو (مرحوم) "علی گڑھ کالج" سے اسی کو سننے کے لئے بلایا تھا اور سن کر قلب پر اتنا اثر ہوا تھا کہ اٹھ کر سیدھا گراموفون کمپنی کے منیجر صاحب کے پاس چلا گیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ اس کا "ریکارڈ" تیار کردیں۔ منظور صاحب طالب علم تھے گویے نہ تھے انھیں کوئی معاوضہ لینا مقصود نہ تھا مگر مسلم یونیورسٹی کے لئے ایک رقم کا انتظام کرلیا گیا جو ہر ریکارڈ کے فروخت ہونے پر اسے ملتی رہے۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں "کامریڈ" میں اس کے پورے صفحے کے اشتہار نکلنا شروع ہوئے اور اگر اسی مہینے میں جنگ طرابلس کے چھڑ جانے سے کفر و اسلام کی جنگ کا وہ سلسلہ نہ چھڑ جاتا جو کہیں بارہ برس بعد

جا کر صلح لوزان پر ختم ہوا اور "کریڈو" کے صفحات کو جس نے جدال و قتال کے حالات سے لبریز کر دیا تھا اور اسی پیمانے پر یہ اشتہار نکلتا رہا پھر بھی مدتوں تک نکلتا رہا۔

جب پہلی بار یہ اشتہار "دلآویز نظم، دلکش آواز، قومی امداد، ہم خرما و ہم ثواب" کی سرخی سے نکلا میں نے اس میں عرض کیا تھا کہ "ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا نے اپنے ہم وطنوں کے حب وطن کا اظہار ایک بے مثل نظم میں کیا تھا جو ہندوستان میں مقبول خاص و عام ہو چکی ہے۔ اب اپنی تازہ ترین نظم میں انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کے حب اسلام کا اظہار کیا ہے اور یقیناً اس کی مقبولیت عالم گیر ہو گی۔ وطن اور مذہب کے تعلق کی بابت شاعر ایک شعر میں وہ مطلب ادا کر گیا ہے جو فلسفی کئی صفحوں میں ادا کرتے اور شاید پھر بھی ادا نہ کر سکتے۔ اسلاف کے کارنامے اور شعرا بھی بیان کر چکے ہیں، قوم کے اقبال کا ماتم بہت کچھ ہوا اور ہو گا مگر اقبال نے صاف بتایا ہے کہ جب قوم کو مسبب الاسباب کی طرف سے ایک ضروری پیغام بطور ودیعت کے سونپا گیا ہو جب تک سارے عالم کو وہ پیغام نہ پہنچایا جا سکے اس وقت تک اس کو تباہ و برباد کرنا آسان نہیں۔ اسلامی دنیا کے دیرینہ تنزل کے بعد اب پھر ہر طرف سے ترقی کی صدائیں پیام امید بن کر آ رہی ہیں۔ کاروان سالار اب بھی وہی ہادی قوم ہے جس کی آواز نے بجلی کے کڑکتے کی طرح اب سے تیرہ سو برس پہلے ایک عالم کو سوتے سے جگا دیا تھا اور اقبال کا ترانہ دراصل بانگ درا ہے جس سے آواز آ رہی ہے کہ چلو بڑھو جلدی کرو۔ عجب نہیں کہ یہ دلکش نظم اقبال کی نجات کے لئے کافی ہو اور ہندوستان کے مسلمان بھی پکار اٹھیں، لبیک، لبیک یا رسول اللہ۔ کون ہے جس کے کان میں یہ بانگ درا نہیں پڑی۔"

اقبال کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء تک محدود تھا اور "ترانۂ ہندی" "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اور "نیا شوالہ" سب اسی دور کی نظمیں ہیں۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک دوسرا دور چلا اور ۱۹۰۸ء سے وہ آخری دور چلنا شروع ہوا جو بظاہر اب تک چل رہا ہے۔ اس آخری دور کا آغاز "بلاد اسلامیہ" کی نظم سے ہوتا ہے جس میں دہلی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ کے بعد یثرب کا نمبر آتا ہے مگر اس طرح آتا ہے کہ؎

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفےٰ　　دید ہے کعبہ کو تیری حج اکبر سے سوا
خاتم ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں　　اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی　　جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے　　جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام　　ہند ہی بنیاد ہے اسکی نہ فارس ہے نہ شام
آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو　　نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں　　صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

اقبال جب حقیقت کی طرف جلد جلد ترقی کر رہے تھے اُس کے بعد "گورستانِ شاہی" پر جو نظم لکھی گئی اس میں البتہ چند شعر ایسے ہیں کہ ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر اب بھی بعض اوقات چیزوں پر ایک سطحی نظر ڈال رہا ہے؎

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے　　آہ یک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

اس سے تو خیال ہوتا ہے کہ اقبال بھی ان تاریخوں کے مؤلفوں کی طرح جو اسکولوں کی خواندگی میں داخل کی جاتی ہیں اقوام کو بادشاہوں سے ممیز نہ کر سکے۔ وہ خود پوچھتے ہیں کہ؎

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل ‏ جن کی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

اور خوب کہتے ہیں کہ ؎

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور ‏ جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

اور یہ بھی صحیح فرماتے ہیں کہ ؎

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار ‏ رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار

لیکن اگر مسلمان بھی ایک "قوم" ہیں اور کوئی امر مانع نہیں کہ وہ اسلام پر قائم رہیں تو پھر یہ ہرگز صحیح نہیں کہ ؎

اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار ‏ رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار ‏ ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو ‏ مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہگذر ‏ چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور

مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں ‏ دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں

آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے ‏ عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا ‏ آسماں سے ابرِ آذاری اٹھا، برسا، گیا

اگر یہ صحیح ہے تو صرف اس معنی میں کہ خدا اپنی نئی قوموں کو مسلمان کرتا رہے گا اور انھیں کے ذریعے سے ابد تک اسلام کو قائم رکھے گا۔

افسوس ہے کہ اقبال بھی نفس پرست مسلمان بادشاہوں ہی کے زمانے کو "عہدِ رفتہ" سمجھے اور انھوں نے فرمایا کہ ؎

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں ‏ اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

ہاں اس امت کو اپنے شاہوں کو بھولنا تو نہیں چاہیے انھیں نے حضرت معاویہؓ کے زمانے سے لے کر سلطان محمد وحید الدین کے زمانے تک اپنی ذات اور

اپنے خاندان کے مفاد کو امت محمدیہ اور ملت اسلامیہ کے مفاد پر ترجیح دی اور ہم کو تباہ و برباد کرایا۔ اقبال اس وقت بالکل صحیح راستے پر نہ تھے مگر بحمداللہ جنگ عمومی تک اس پر آپڑے اور خدا ضرور ان کو ان حقیقتوں کو آشکارا کرنے کی جزائے خیر دے گا کہ ؎

ہر کہ پیماں با ہوالموجود بست — گردنش از بندِ ہر معبود رست

مومن از عشق است و عشق از مومن است — عشق را ناممکنِ ما ممکن است

عقل سفاک است و او سفاک تر — پاک تر، چالاک تر، بیباک تر

آں کند تعمیر تا ویراں کند — ایں کند ویراں کہ آباداں کند

عقل می گوید کہ خود را پیش کن — عشق گوید امتحانِ خویش کن

عقل گوید شاد شو آباد شو — عشق گوید بندہ شو آزاد شو

عشق را آرام جاں حریت است — ناقہ اش را ساربان حریت است

آں شنیدستی کہ ہنگامِ نبرد — عشق با عقلِ ہوس پرور چہ کرد

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؓ — سروِ آزادِ ز بستانِ رسولؐ

بہرِ آں شہزادۂ خیر الملل — دوشِ ختم المرسلینؐ نعم الجمل

سرخ رو عشقِ غیور از خونِ او — شوخیٔ ایں مصرع از مضمونِ او

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید — ایں دو قوت از حیات آید پدید

زندہ حق از قوتِ شبیری است — باطل آخر داغِ حسرت میری است

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم — چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم

بر زمینِ کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

تا قیامت قطع استبداد کرد — موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است | پس بنائے لا الہ گردیدہ است
تیغ بہر عزت دین است و بس | مقصد او حفظ آئین است و بس
ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست | پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خون او تفسیر ایں اسرار کرد | ملت خوابیدہ را بیدار کرد
تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید | از رگ ارباب باطل خوں کشید
نقش الا اللہ بر صحرا نوشت | سطر عنوان نجات ما نوشت
رمز قرآں از حسین آموختیم | ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم
شوکت شام و فر بغداد رفت | سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز | تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیک دور افتادگاں | اشک ما بر خاک پاک او رساں

اس سے زیادہ بادشاہت کی کیا مذمت ہو سکتی تھی۔ کاش آج بھی اقبال کو کربلا کی فتح نمایاں اسی طرح یاد ہوتی اور ارض پاک حجاز میں "یزیدیت" کے مقابلے کے لئے وہ بھی "شبیریت" کا علم لے کر نکلتے اور بجائے کونسل کے داخلے کے موتمر عالم اسلام میں شرکت فرماتے۔ "گورستان شاہی" میں انھوں نے مسلم کو بھی یزید کی طرح رخصت کر دیا لیکن "رموز بیخودی" میں وہ صحیح راستے پر آ پڑے اور انھوں نے خوب فرمایا کہ ؎

در بہاراں جوش بلبل دیدۂ | رستخیز غنچہ و گل دیدۂ
چوں عروساں غنچہ ہا آراستہ | از زمیں یک شہر انجم خاستہ
غنچۂ بر می دمد از شاخسار | گیرد ش باد نسیم اندر کنار
غنچۂ از دست گلچیں خوں شود | از چمن مانند بو بیروں رود
بست قمری آشیاں بلبل پرید | قطرۂ شبنم رسید و بو رمید

رخصتِ صد لالۂ ناپائدار
کم نسازد رونقِ فصلِ بہار

از زیاں گنجِ فراوانش ہماں
محفلِ گلہاے خندانش ہماں

فصلِ گل از نسترن باقی تر است
از گل و سرو و سمن باقی تر است

ہمچناں از فردہائے پے سپر
ہست تقویمِ امم پائندہ تر

در سفر یار است و صحبت قائم است
فرد رہ گیر است و ملت قائم است

فرد پرشصت و ہفتاد است و بس
قوم را صد سال مثلِ یک نفس

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن
زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن

مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات
مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

گرچہ ملت ہم بمیرد مثلِ فرد
از اجل فرماں پذیرد مثلِ فرد

امتِ مسلم ز آیاتِ خداست
اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است

از اجل ایں قوم بے پروا استے
استوار از نحن نزلنا استے

ذکر قائم از قیامِ ذاکر است
از دوامِ او دوامِ ذاکر است

تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است
از فسردن ایں چراغ آسودہ است

ما کہ توحیدِ خدا را حجتیم
حافظِ رمزِ کتاب و حکمتیم

آسماں با ما سرِ پیکار داشت
در بغل یک فتنۂ تاتار داشت

بندہا از پا کشود آں فتنہ را
بر سرِ ما آزمود آں فتنہ را

خفتہ صد آشوب در آغوشِ او
صبحِ امروزے نزاید دوشِ او

سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید
دید بغداد انچہ روما ہم ندید

تو مگر از چرخِ کج رفتار پرس
زاں نو آئینِ کہن پندار پرس

آتشِ تاتاریاں گلزار کیست
شعلہ ہاے او گلِ دستارِ کیست

زانکہ ما را فطرتِ ابراہیمی است
ہم بمولیٰ نسبتِ ابراہیمی است

از تبِ آتش بر اندازیم گل | تا بہر فردوس را سازیم گل
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار | چوں بباغِ ما رسد گردد بہار
رومیاں را گرم بازاری نماند | آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست | رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند | استخوانِ او تہِ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست | ملّتِ اسلامیاں بود است و ہست
عشق آئینِ حیاتِ عالم است | امتزاجِ سالماتِ عالم است
عشق از سوزِ دلِ ما زندہ است | از شرارِ لا الہ تابندہ است
گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما | گلستاں میرد اگر میریم ما

تعجب ہے کہ جو شخص جانتا تھا کہ شوکتِ شام و فرِ بغداد و سطوتِ غرناطہ اس میں اسلام کی حقیقت نہ تھی بلکہ اس کی حقیقت تھی تو مدینۂ منورہ میں اور کربلائے معلیٰ میں تھی۔ جو شخص جانتا تھا کہ بغداد پر وہ کچھ گذرا جو روما پر نہ گذرا پھر بھی تاتاریوں کے اٹھائے ہوئے محشر کا یہی نتیجہ نکلا کہ ہلاکو ہی کی قوم نہ صرف مسلمان ہوئی بلکہ اس نے از سرِ نو یورپ میں داخل ہو کر اس کی زمین میں پھر اسلام کا جھنڈا گاڑا اور ہلاکو کی تباہ کی ہوئی خلافت کو پھر زندہ کیا اور چار سو برس تک زندہ رکھا۔ جو شخص جانتا تھا کہ رومیوں کی گرم بازاری اور ان کی جہانگیری اور جہاں داری آج باقی نہیں، ساسانیوں کا شیشہ چکنا چور ہو گیا، خمخانۂ یونان کی رونق نہ رہی اور مصر بھی فراعنہ کی ہڈیوں کی طرح اہرام کے تلے دب گیا مگر بانگِ اذاں جیسے تیرہ سو برس پہلے تھی آج بھی ہے اور ملتِ اسلامیاں اگر نہ رہے گی تو دنیا بھی نہ رہے گی کیونکہ

ع گلستاں میرد اگر میریم ما

وہ بادشاہوں کے اجڑے ہوئے گورستان کو دیکھ کر کیس طرح کہہ سکا کہ ؎

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا   آسماں سے ابرِ آزاری اٹھا، برسا، گیا

یقیناً اس وقت تک حقیقت کا پورا پورا انکشاف نہ ہوا تھا مگر یہ ظلم ہوگا کہ میں اس کو بھی ظاہر کروں کہ اس نظم کے آخر میں اقبال نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ؎

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں سے ہم   آخری بادل ہیں اک گذرے ہوئے طوفاں کے ہم

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کے آغوش میں   برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

وادیِ گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ   خواب سے امیدِ دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور   ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

تاہم میرے نزدیک جو کچھ اسلامی بادشاہوں نے دکھایا وہ اکثر اسلام کی شانِ جلالی کا بھی ظہور نہ تھا۔ وہ شانِ جلالی جو ہر زبردست زیردست کو دکھا سکتا ہے اسلام کی شانِ جلالی نہیں۔ اسلام کی شانِ جلالی کو تو صرف وہی دکھا سکتا ہے جو اسلام کی شانِ جمالی کو دکھا سکے اور جو ابھی اسلام کی شانِ جمالی دکھا سکتا ہے وہ یقیناً اس کی شانِ جلالی بھی دنیا کو ایک بار پھر دکھا دے گا۔ میں نے اقبال کی اردو اور فارسی نظموں سے اتنے طول طویل اقتباسات بلا وجہ نہیں دیے ہیں۔ قارئین کرام ذرا صبر فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس مضمون سے ان کا کتنا قریبی تعلق ہے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ اقبال کی شاعری کا جو تیسرا دور ۱۹۰۸ء میں شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ اس کی ابتدا ان دو نظموں سے ہوئی تھی لیکن حقیقتاً اس تمام دور کی شاعری کا لب لباب اور "مشتے نمونہ از خروارے" وہی "ترانۂ ملی" تھا جس کا ذکر آج کے مضمون کو شروع کرتے ہی میں نے کر دیا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ آج کون ہے جس نے یہ ترانہ نہیں سنا ہے لیکن پھر بھی دل مجبور کر رہا ہے کہ اس کے وہ شعر نقل کر دوں

جن میں ملت اسلامیہ کی تفسیر حیات اور ہمارے خواب کی صحیح ترین تعبیر کا اظہار کیا گیا ہے ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا   مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے   آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا   ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں   خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری   تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم   سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا   اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا   ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اسی "ترانۂ ملی" کے بعد "وطنیت" پر اقبال کی نظم ہے جس کا پہلا بند یہ ہے ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور   ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور   تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور اس نظم میں وہی خیالات ظاہر کیے گئے ہیں جن کا "رموز بیخودی" میں اسلام کو تہذیب مکانی سے آزاد ظاہر کرنے کے متعلق اظہار کیا گیا ہے چنانچہ اقبال نے "وطنیت" کی تقسیم کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے کہ ؎

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے   قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اسلام کی قومیت ساری نوع انسان پر حاوی ہے اور اقبال نے طارق کے منہ سے اس کا خیال بہترین طریقے پر اظہار کر دیا ہے۔ ع

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اپنی اردو نظموں کے مجموعے کا نام انھوں نے "بانگِ درا" رکھا ہے اور وہ اسی "ترانۂ ملّی" سے لیا گیا ہے جس کے ذکر سے اس مضمون کی ابتدا کی گئی تھی یہ یقیناً ع

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا

اور اس نے اقبال کے پہلے خیال کی کہ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

تردید کر دی اور اس کی اس طرح تصحیح کر دی کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لیکن جھوٹی قوم پروری پر ناک بھوں چڑھانے والے اقبال ان کی اجانب پرستی پر "نہیں" "نہیں" کہنے والوں کی آوازوں کو ایک کڑک مرغی کی کُڑکڑاہٹوں کا لقب دینے والے اقبال کیا دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ آج ان کی سچی خدا پرستی اور ملت پروری کی نمائندگی خود ان کی ملت کی کُڑکڑاہٹوں جو اس کے اخبارات اور اس کی تقریروں میں سنائی دیتی ہے کر رہی ہے۔ جس پنجاب کونسل میں جا کر اور اپنی ذمہ داری کو خوب سمجھ بوجھ کر انھوں نے اپنے تئیں مزید برطانوی افسروں کا خیر مقدم کرنے کے لئے اس قدر مستعد ظاہر فرمایا۔ اس میں کے تقریباً نصف منتخب شدہ نمائندے مسلمان ہیں۔ اگر انھیں کا "تربیت الدجاج" والا استعارہ استعمال کیا جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ ان کُڑکڑاہٹوں کرنے والی مرغیوں میں سے کتنی ہیں جو خدا پرستی اور ملت پروری کا انڈا اب تک دے رہی ہیں۔ اتفاق سے آجکل چین میں ایک عظیم الشان انقلابی تحریک رونما ہے اور عرب میں بھی مؤتمر عالم اسلام کی ابتدا ہوئی اور پھر "تریدیت"

نے اس "وطنیت" کو دبا دیا اور وہ عشق جو ہماری ناممکنات کو ممکن ثابت کرنا چاہتا تھا بظاہر پیر عقل کی چالاکی اور سفاکی سے دب رہا ہے۔ کیا ہندوستان کے مسلمان اپنی افسردگی اور اس مردنی سے جو آج ان پر چھائی ہوئی ہے ثابت کر رہے ہیں کہ چین بھی ان کا ہے اور عرب بھی ان کا؟ خود انھیں کے پنجاب سے جو، ہندوستان بھر میں "وطنیت" کی بدترین مثالیں پیش کر رہا ہے، بار بار یہ صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں کہ چین تو کہاں کا ترکی اور حجاز تک سے ہمیں قطع نظر کر کے اپنے ہی ملک کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اپنے ہی ملک کی طرف متوجہ ہونے کے صرف یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکومت کی کتنی ملازمتیں دلوائی جائیں اور مسلمانوں کی "قوم" کے معنی زیادہ تر اس سیاسی اور مذہبی قاموس میں یا تو اپنی ذات شریف ہیں یا بیٹا بھتیجا بھانجا داماد ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہمت ہوئی تو یہی کہ وکلا اور بیرسٹر صاحبان ان جلسوں سے خود تو علیحدہ رہے جن میں کنور دلیپ صاحب کی برطرفی کا مطالبہ کیا گیا اور سر شادی لال پر ہندو نوازی کے الزامات لگائے گئے لیکن دوسروں کو اس سے ہرگز نہ روکا گیا بلکہ کچھ ترغیب و تحریص ہی دی گئی، بالخصوص اخبار نویسوں کو جن سے جیلیں بھری جا رہی ہیں یا کسی سب جج صاحب نے ایک خط لکھ مارا کہ واقعی سر شادی لال صاحب ویسے ہی ہیں جیسا کہ ان کو ایلین صاحب نے لکھا تھا۔ جو تردید کی گئی ہے وہ صرف ان کے چند خدام کی طرف سے کی گئی ہے۔ آپ ایک کمیشن بٹھا کر سب سے حلفیہ بیانات لیں اور میرے اس خط کو آپ شائع فرما سکتے ہیں مگر مصلحتاً میرا نام درج نہ فرمائیں۔

یہ ہے سچی خدا پرستی اور سچی ملت پروری کی لگڑ دھکوں چھوٹی متحریری تبلیغ کے لئے "نوجیوں کے اخبار" کی فائل کو کتاب کی شکل میں چھاپ کر ا سے

"نمونہ جنگ صفین" کا نام دے کر اب بھی پیسہ بٹورا جا رہا ہے اور اب کتب فروشی کی توسیع "جھنڈا فروشی" سے کی جا رہی ہے اور "نشان عشق محمدؐ" کے نام سے زرد جھنڈے بیچے جا رہے ہیں ان کے رنگ کے متعلق ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ حضور آصف جاہ نظام الملک کا شاہی رنگ ہے ۱۲ ربیع الاول کو جشن میلاد منایا جائے. اس دن دبظاہر آریہ سماج کی تقلید میں) جلوس نکالے جائیں اور ان حضور نظام کے لئے دعائیں مانگی جائیں جن کے خلاف اسی .... نے اسی برطانوی حکومت سے جو ان کو پریشان کر رہی ہے جاسوسی کی تھی کہ انھیں وحدت اسلامیہ کا سبق پڑھایا جا رہا ہے. اس لئے جو جھنڈے جلوسوں میں نکلے جائیں ان کا رنگ زرد ہو. جب میں نے اس...... اور ...... کا راز فاش کرنا شروع کیا تھا تو میرے ایک فاضل نے فرمایا تھا کہ میاں جو کچھ تم کر رہے ہو بالکل درست ہے. مگر وہ مسلمانوں کو اس کے بعد بھی الو بنا کر اپنا الو سیدھا کرتا ہے گا ع

چو احمق در جہاں باقیست مفلس در نمی ماند

جتنی مسلمانوں کی حالت خراب ہے اتنی ہندوستان میں کسی ملت کی نہیں، تعلیم ندارد، تجارت خراب، صنعت و حرفت میں ابال اور مزدوری کی جگہیں بھی ہندو مل والے ان سے چھین رہے ہیں. ان میں سے ایک چیز کے لئے کبھی روپیہ نہیں ملتا مگر "زرد جھنڈوں" کے جلوس کے لئے "نشان عشق محمدؐ" کے جھنڈے اس ...... سے ضرور خریدے جائیں گے. یہی ملت پرستی کی یہ مرغی ہرگز کڑک نہیں ہوئی ہے. یہ برابر انڈے دے رہی ہے اور پیسہ بٹور رہی ہے. ہر مسلمان فوراً اپنے مقام کے لئے چندہ کر کے دس بیس جھنڈے منگالے "تاکہ ہر مسجد، ہر اسلامی اسکول، ہر اسلامی مکتب اور ہر مسلمان گھر پر یہ محمدی جھنڈا لگایا جائے اور جلوس کے دن یہ جھنڈے سب مسلمان ہاتھوں میں لے کر نکلیں

"بہت جلد منگاؤ ورنہ پھر ان کا ملنا مشکل ہوگا"۔ یہ ہے اس سچی ملت پروری کی گلکاریاں:
ڈاکٹر سر محمد اقبال دام اقبالہم کے دوست سر عبدالقادر نے حمایت اسلام کے اسی
جلسے میں جس میں اس .... نے ساڑھے چار سو برس سے ایک مسلمان خاندان
کے سردار ٹھاکر صاحب امود کو "نو مسلم" بنا کر لاہور کے بازاروں میں سے
جلوس کے ساتھ سر محمد شفیع کی معیت میں نکالا تھا۔ اس کا رونا رویا تھا کہ مسلمانوں کے
ہزاروں کام ایسے پڑے ہوئے ہیں جن کے لئے روپیہ اور پرجوش کام کرنے والوں کی
ضرورت ہے لیکن پرجوش مسلمانوں کا جوش اور روپیہ دونوں محض نمائشی کاموں
میں اور فضول اظہار جوش و خروش میں برباد کیا جاتا ہے۔ اس فریب کا اچھی طرح
بھانڈا پھوڑ دیا گیا مگر آج بھی یہ ......" ......" کے پوسٹروں میں ظاہر کر رہا
ہے کہ ٹھاکر صاحب امود نے معہ اپنی ساڑھے پانچ لاکھ کی راجپوت قوم کے
"قبول اسلام" کیا ہے گویا ساڑھے چار سو برس تک ان کے مسلمان آباؤ اجداد
سب کافر تھے اور بظاہر لکانہ کے مسلمانوں کو بھی شردھانند صحیح طور پر کافر ظاہر
کیا کرتے تھے (نعوذ باللہ من ذالک) اور اس قبول اسلام کی کتاب فروخت
کی جا رہی ہے۔ یہ ہے ۱۹۰۰ء سے آج تک ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ملت پروری
کا نتیجہ۔ یقیناً آج جب کہ ہندوستان کے تقریباً ہر گوشے میں ہندو مسلمانوں کے
فسادات نے اس کو سارے عالم میں بدنام کر دیا یہ کہنا قطعاً جھوٹ ہے کہ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اور یہ تو اس سے بھی زیادہ جھوٹ ہے کہ ؎

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا — میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

لیکن کیا یہ اس سے زیادہ سچ ہے کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

میں انگریزوں کا، امریکیوں کا ہے یا جاپانیوں کا ہے یا شاید روسیوں کا
ہو جائے یا (خدا کرے) پھر چینیوں کا ہو جائے جن میں مسلمانوں کا بھی اچھا خاصہ
عنصر ہے لیکن یقیناً ہمارا تو آج ہرگز نہیں ہے اور عرب انگریزوں کا ہے یا فرانسیسیوں
کا یا یہودیوں کا یا نجدیوں کا اور یمنیوں کا لیکن جہاں حضرت خدیجہ کا مکان شہید
کرا دیا جائے اور اس میں بول و براز کیا جائے اور اس کی شکایت کی جائے
تو اقبال صاحب کے پنجابی بھائی اسمٰعیل غزنوی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی
سے فرمائیں کہ کیا (نعوذ باللہ من ذالک) خود خدیجہؓ وہاں بول و براز نہیں
کیا کرتی تھیں۔ جہاں مولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیا جائے اور
عورتوں تک کے سامنے وہاں لوگ پاجامہ کھول کر پیشاب کرنے کے لئے
برہنہ بیٹھیں جیسے کہ خود میرے، میری بہن اور میری بیوی کے سامنے ایک
شخص بیٹھا تھا۔ جہاں امہات المومنینؓ اور اہل بیتؓ کی قبروں کے نشان
تک نہ چھوڑے جائیں، جہاں احد کی مساجد تک شہید کرا دی جائیں اور ہم کچھ
نہ کر سکیں وہ عرب بھی ہمارا نہیں ہے۔ رہا ہندوستان بظاہر وہ اب
لالا جپت رائے کا ہے اور ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب چاہتے ہیں کہ اب وہ
مسٹر اوگلوی کا ہو جائے۔ طبیب حاذق کا یہ نیا نسخہ ہے جس کا جی چاہے
اسے بند حوالائے اور گھول کر لادیں کر یا جوش دے کر اسے پیے، لیکن مجھ
جیسے علاج کو تو اس سے شفا کی ہرگز امید نہیں۔

(۵) "شمع و شاعر" کے مصنف سے ایک سوال

ہمدرد ۱۰ اگست ۱۹۲۶ء

مجھے چند نہایت ضروری مضامین لکھنا تھے مگر انسداد توہین انبیاء و بزرگان دین کے راستے میں جو دشواریاں خود ہمارے بھائیوں نے صراط مستقیم گم کر کے پیدا کر دیں ان کے باعث ۲۶ جون سے آج تک کوئی دوسرا مضمون نہیں لکھ سکا تھا البتہ سر محمد اقبال کی شملہ والی تقریر نے اس سلسلے کو بند کرا دیا اور ساری نہیں (کیونکہ اس سلسلے میں کام اب تک جاری ہے) تو کم سے کم آدھی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ جو کچھ مجھے اس سلسلے میں لکھنا تھا وہ بھی تقریباً لکھ چکا۔ البتہ آج ان کی نظم "شمع و شاعر" سے کچھ اقتباسات دے کر ان سے ایک سوال انھیں کی زبان سے کرنا ہے۔

وہ آج ہمارے مرض کا علاج اسے نہیں سمجھتے کہ ہندوؤں کو غیرت دلانے کی کوشش کی جائے کہ اقلیت کے ساتھ ناانصافی نہ کرو۔ جب تک اس کو رام نہ کرو گے ہندوستان کو آزاد نہ کرا سکو گے، سوراج نہ لے سکو گے، اس کے استیصال کا خیال حماقت نہیں جنوں ہے۔ جب محمد بن قاسم مٹھی بھر مسلمانوں کو لے کر سندھ میں داخل ہوا تھا تب اس کے استیصال کا اچھا موقع تھا۔ تم نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا۔ جب محمود غزنوی سترہ بار ہندوستان آیا اور سارے ملک میں گھوما گھوما پھرا اگرچہ وہی چند ہزار فوج کے ساتھ تب بھی موقع تھا کہ اس اقلیت کا استیصال کر دیا جائے اس وقت بھی تم نے اس کا استیصال نہ کیا اور موقع کو ہاتھ سے جانے دیا۔ اس کے بعد شہاب الدین غوری آیا اس وقت

بھی اس کے استیصال کا موقع تھا لیکن تم نے اس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے دیا۔ غلاموں کے خاندان تک نے یہاں بادشاہی کی اور بہ ظاہر تم نے اسے بھی قبول کر لیا۔ خلجی، تغلق اور لودھی سب باری باری حکومت کرتے رہے اور تم نے کسی کا بھی استیصال نہ کیا۔ وہ خود ہی ایک دوسرے کا استیصال کرتے رہے۔ پھر ایک زرغنہ سے بھاگا ہوا مغل تیمور لنگ کے خاندان کا ایک چغتائی بابر یہاں آیا اور تم نے اس غریب الوطن کی اس طرح مہمان نوازی کی کہ سارا گھر بار اسے دے ڈالا۔ اس کے بیٹے کو یہاں سے نکالا بھی تو اس کے بھائیوں نے یا مسلمان پٹھانوں نے اور ان پٹھانوں کے ہاتھوں سے بھی عنانِ حکومت نکلی تو پھر اسی کے ہاتھوں میں آگئی اور اس کے بعد بھی بجیے نقال اس ملک کی حکومت کو مغلوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکے جو رانا سانگا جیسے راجپوت پر غالب آئے تھے اور ایک مغل بچہ اکبر نامی پھر اس پر حکمراں ہو کر رہا۔ تم نے سکھوں کو بھی جو اسلام سے بہت ہی قریب آگئے تھے مغلیہ حکومت سے بھڑا دیا۔ تب بھی سوائے اس کے کچھ نتیجہ نہ نکلا کہ بجائے دو مذہبی جماعتوں کے تین بن گئیں۔ جب اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد چند ہی سال تک کئی بار بھائیوں بھائیوں میں پھر تخت کے لیے جنگ چھڑی اور جو جیا وہ بھی عیاشی میں پڑ گیا اور وہ مرہٹوں کی قوت جس کو اپنا مطیع و منقاد بنانے کا عزم بالجزم کر کے اورنگ زیب دہلی کو چھوڑ کر دکن گئے تھے اور ۲۶ برس تک جب تک کہ وہ اور زندہ رہے اس میں مصروف رہے اور بالآخر اس قوت کو دبا کر ہی انھوں نے دم لیا اور دم دیا تو وہ قوت پھر بڑھنے لگی اور ایک سیواجی کی جگہ چار چار مرہٹے راجہ برہمن پیشوا کے درباری بنے اور جب نادر شاہ نے مغلیہ سلطنت کو بالکل ضعیف کر کے چھوڑ دیا تو سب نے مل کر اتنی ہمت کی کہ دہلی پر دھاوا بول دیا۔ اس وقت بھی ایک غریب الوطن

پٹھان احمد شاہ ابدالی نے بھاؤ کو اس طرح شکست دی کہ پھر کبھی اس قوم نے شمال
کا رخ نہیں کیا۔ بھاؤجی سندھیا جیسا بہادر، پانی پت سے اس طرح بھاگا تھا کہ
ساری عمر وہ اس تعاقب کرنے والے پٹھان کو نہ بھولا جس کا چھوٹے قد کا
گھوڑا اس کے پیچھے برابر چلا آرہا تھا اور اس کے نتھنوں سے نکلتی ہوئی بھاپ
جسے وہ بار بار مڑ مڑ کر دیکھتا تھا تو لرز جاتا تھا ساری عمر اسے خواب میں ستاتی
رہی۔ وہ آخری موقع تھا کہ تم اس اقلیت کا استیصال کر سکتے مگر تم نے اس کو
بھی ہاتھ سے کھو دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے غضب کیا کہ تم کو تباہ بھی کر دیا اور
خود یہاں قیام نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی سلطنت نکل گئی
اور تمہیں بھی نہ مل سکی۔ اگر سات ہزار میل کے فاصلے سے سات سمندر پار کر کے
کچھ سوداگر جہانگیر کے دربار میں تجارت کرنے کی اجازت لینے آئے تھے انھوں نے
جہانگیر کے وارث اندھے شاہ عالم کو دو سو برس بعد اپنی "حفاظت" میں لے لیا
اور اس کی اور تمہاری دونوں کی رہی سہی طاقت کو مٹا کر اپنی سلطنت قائم کر لی۔

اب اگر اس غلامی سے نکلنا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ ہم تم
ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں، ایک دوسرے
پر اعتماد کریں اور ایک دوسرے کی طرف سے جو اذیت زبان سے یا ہاتھ سے
پہنچتی ہے اس پر صبر کریں مگر اس غلامی کو ہرگز برداشت نہ کریں گے جس میں تم بھی
سوا ڈیڑھ سو برس سے مبتلا ہو اور ہم بھی اور جو یقیناً ہندو راج سے بھی زیادہ
تکلیف دہ ہے اور مسلم راج سے بھی۔

نہ ڈاکٹر صاحب اسے ہمارے مرض کا علاج سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو
صبر کی تلقین کریں اور ان سے کہیں کہ گو یہ یقینی امر ہے کہ تمہیں ایک خدا کی خاطر
ساری خدائی سے لڑنا پڑے گا لیکن تم ایک ہی وقت میں ساری دنیا سے نہیں

لڑ سکتے۔ سب دشمنوں میں سے ایک کو چھانٹ لو جسے تم " الدالخصام " سمجھتے ہو
جو ان اصولوں سے جن پر اسلام مبنی ہے کبھی تمھارے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے
اور ان اصولوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں جو تمھارے دشمنوں میں سب سے
زیادہ قوی ہیں جو تمھیں سب سے زیادہ مخالفت کیے ہوئے ہیں اور اگر ہو سکے تو ان
کے خلاف اوروں کو اپنا اسی طرح حلیف بناؤ جس طرح کہ رسول اکرمؐ نے یثرب
کے یہودیوں تک کو مشرکین مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنایا تھا گو بعد کو انھوں نے
دغا کی اور اس کی خوب ہی سزا پائی اور بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ سب کے
سب کو یا تو دیس نکالا ملا یا قتل کر دیے گئے، اگر کوئی جماعت بھی تمھارے سیاسی
تدبر سے رام ہو کر تمھاری حلیف نہ بن سکے تب بھی ہر محاذِ جنگ پر یکساں زور
نہ لگاؤ اور محاذوں پر صرف مدافعت کرتے رہو اور اس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ
ہونے والا ہے پورا زور لگا دو اور جگہ صبر و ضبط سے کام لو۔ جب سب سے بڑے
محاذِ جنگ پر فتح حاصل ہو جائے تو دوسرے محاذوں پر آپ ہی فتح حاصل ہو جائیگی
اور اس وقت ایک ایک کے ہر دشمن سے دل کھول کر انتقام لے لینا ۔ یہ
نامردی نہیں ہے بلکہ اس کو عزم امور کہتے ہیں ' وان تصبروا وتتقوا فان ذالک
من عزم الامور ' (اگر تم صبر کروگے اور خدا ہی سے ڈروگے تو یہ ہمت کے
کام ہیں۔) اگر چین و عرب بھی تمھارا ہے اور ہندوستان بھی تمھارا ہے اور تم مسلم
ہو سارا جہاں تمھارا وطن ہے تو اسی دشمن کو ' الدالخصام ' سمجھو جو سارے جہان
پر حاوی ہونا چاہتا تھا یقیناً وہ دشمن ہندو نہیں ہے۔ اس غریب کی تگ و دو
تو سمندر کے کنارے تک ' جو دنیا ' کالے پانی ' کے اس پار ہے اس سے اسے
کیا واسطہ، یہ تو گورا کا بھنگا ہے جس کی ساری دنیا اسی گور میں محدود ہے ۔
ایمان سے کہو کیا تم اس سے قائل ہو ۔

ریل کے کسی ڈبے میں چھ سات ہندو ہوں اور ان میں تم بھی جا کر بیٹھ جاؤ
تو کیا تمھیں ان سے ڈر لگے گا؟ بعض اوقات تو انھیں کو تم سے ڈر لگتا ہے۔ البتہ
اگر اس ڈبے میں دو چار گورے ہوں تب بھی تم کو اور ان کو دونوں کو ڈر لگتا ہے
اور اسی کا فکر رہتا ہے کہ یہ ماریں گے یا سامان پھینک دیں گے یا گالی دیں گے
یا پاؤں دبوائیں گے۔ آج اگر ہندو تم پر ظلم کرتے ہیں، تمھارے مذہب کی توہین
کرتے ہیں، تمھارے سیاسی اور مذہبی حقوق کو پامال کرتے ہیں، تمھارے تہواروں
میں تم سے جنگ آزما ہوتے ہیں اور تمھاری عبادتوں میں خلل ڈالتے ہیں تو یہ
بھی اس لیے کہ حکومت تمھاری اور تمھارے حقوق کی حفاظت میں کوتاہی کرتی
ہے ورنہ جس حکومت نے ترک تعاون کی تحریک کو شکست دے دی وہ کیا
ہندو جاتی کو نہیں دبا سکتی۔ وہ ان کے مقابلے میں آج بھی تمھیں سے زیادہ
ڈرتی ہے۔ خیر اگر تم کو ان سے لڑنا ہی ہے تو کس ہتھیار سے لڑو گے؟ لٹھ پٹے
میں تم اب بھی دور رہتے ہو پھر پہلوانوں کے دنگل کرا کے تنظیم کرانے سے کیا
حاصل۔ اگر آج انگریز بیچ میں کود پڑیں تو تم اب بھی ان سے بھگت لے سکتے ہو
مگر بھلا انگریز تمھیں بھگت لینے دیں گے۔ ایک جگہ بھی تو آج تک دن بھر لڑائی
نہ ہونے پائی۔ پولیس آجاتی ہے، فوج آجاتی ہے اور تم بالآخر ان سے نہیں
اس سے ڈر کر اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر پکڑ دھکڑ شروع
ہوتی ہے اور کوتوالیوں اور کچہریوں میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جن مسلمانوں
کے لیے تم گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخا کرتے تھے کہ سرکاری نوکریاں انھیں دی جائیں
وہ تو اس خوف کے مارے کہ کہیں سرکار ان کو متعصب اور طرف دار سمجھ کر
برخاست نہ کر دے بعض اوقات خود ہی ناکردہ گناہ مسلمانوں تک کو پھنسا دیتے
ہیں۔ سہارن پور میں کیا ہوا، علی گڑھ میں کیا ہوا۔ وہ تو ہندو ہی ہیں جو خود

تمہارے قول کے مطابق اپنے مجرموں تک کو چھڑا دیتے ہیں اور جو ہندو سبھا کے صدر سے بقرعید کی صبح کو ٹیلیفون پر احکام لیا کرتے ہیں کہ کس محلے میں اور کس بازار میں اور کس گلی میں زیادہ پولیس لگائی جائے اور کس میں کم۔ جب مقدمات کچہری میں پہنچ جاتے ہیں تو تمہارے یہاں وکیلوں کا کال پڑ جاتا ہے۔ خود تمہارا بیان ہے کہ عبد الرشید کے مقدمے میں ایک بیرسٹر صاحب نے چار سو روپے روز کے رکھوا لئے اور اگر شب ما قبل میں آٹھ بجے سے پہلے یہ رقم وصول نہ ہوگئی تو بوریا بندھنا باندھ اسی وقت اسٹیشن کا رخ کرنے کی دھمکی دی۔ نہ سشن میں اور نہ ہائیکورٹ کی اپیل میں کسی نامور مسلمان بیرسٹر نے پوری فیس لے کر پیروی کرنا قبول کیا۔

. . . .

. . . .

اس کی شکایت وکیلوں سے کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ روز مرہ تو مسلمان اپنے مقدمات کی پیروی کے لئے ہندو وکلا کو بیش قرار فیس دیا کرتے ہیں لیکن جب فسادات واقع ہوتے ہیں اور یہ پکڑے جاتے ہیں تو مفت مقدمہ چلانے کے لئے ہم سے امید رکھی جاتی ہے۔ جب حالت یہ ہو تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ فسادات سے جہاں تک ہو بچا جائے اور لٹھ پونگے کے اس قدر مستعدی کے اظہار سے اپنے تئیں اس جنگ میں مارے جانے سے بچایا جائے جس میں چھریاں اور تلواریں خون نہیں بہایا کرتیں اور جس میں بندوقیں اور ریوالور آگ نہیں برساتے بلکہ جن میں بہی کھاتوں پر قلم چلا کرتا ہے اور سود در سود کے ذریعے سے خون چوسا جایا کرتا ہے اور خرچے سمیت ڈگریاں اور قرقیاں لائل چلایا کرتی ہیں۔ اگر سرکاری ملازمتیں ہی تمہیں تمہارا رزق پہنچا سکتی ہیں تو پھر مدارس کیوں نہیں قائم کرتے، امتحان کیوں نہیں پاس کرتے اور ڈگریاں حاصل کر کے

یا مقابلے کے امتحانات میں بیٹھ کر اور سب سے آگے رہ کر نوکریاں کیوں نہیں مانگتے۔ نہ ڈاکٹر صاحب کو وہ پرانا نسخہ ہی آج یاد آتا ہے جو اس نبی کریمؐ نے لکھا تھا جو حکمت کو مسلمانوں کی کھوئی ہوئی پونجی بتلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اسے جس کے پاس دیکھو اس سے چھین لو۔ جس کی وہ کھوئی ہوئی پونجی ہے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے بہ نسبت اس کے جسے وہ کہیں پڑی ہوئی مل گئی ہو۔

صحیح تنظیم سنگٹھن کی نقل نہیں ہے نہ جذبۂ انتقام سے اسے کوئی واسطہ، اگر ہندو بجائے تمہارے دشمن ہونے کے تمہارے سب سے زیادہ چہیتے دوست بھی ہوں اور سنگٹھن کا نام تک نہ لیں تب بھی تمہیں اپنی تنظیم کرنا ہی ہے اور اس کے لئے سنت مالویہ پر چلنے کی مطلق ضرورت نہیں، سنت محمدیہ موجود ہے۔ اسی پر عمل کر مسلمان منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ جب تم میں اور کسی دشمن میں لڑائی ہو تو کیا ضرورت ہے کہ وہی ہتھیار استعمال کیا جائے جو اس کے پاس ہے۔ 'جادل بالتی ہی احسن' ہی کے ہتھیار سے بھی جو ہتھیار بہتر ہو وہ کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ آج اگر مسلمان 'اقامت الصلوٰۃ' ہی کے رکن دین پر عامل ہونے لگیں تو فتح انھیں کی ہے۔ مگر یہاں تو ساری دینداری مسجدوں کے سامنے باجا نہ بجنے دینے میں ختم ہوگئی ہے۔ مسجدوں میں جا کر نماز سو میں سے بمشکل پانچ پڑھتے ہیں اور جو پڑھتے ہیں ان میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جن کو اس کا زیادہ خیال ہے کہ ٹخنے سے ٹخنہ اور گھٹنے سے گھٹنا مل جائے، چاہے دل سے دل ملے یا نہ ملے اور فکر ہے تو اس کی کہ میاں تم ہاتھ کہاں باندھتے ہو، آمین بالجہر کہتے ہو یا نہیں، رفع یدین کرتے ہو یا نہیں کرتے، تمہارا پاجامہ گھٹنوں تک آتا ہے یا ٹخنوں سے نیچا ہے۔ اس کی کسی کو فکر ہے کہ میرے پاس نماز پڑھنے والے کے کپڑے تو اس قدر بوسیدہ ہیں کہ ستر عورت

مشکل ہے اور میں اس قدر بکن پٹ ہوں کہ چاوڑی بازار اور ٹبی کی "زیادہ خرچ بالانشین" عورتوں کو مات ہے۔ اگر "اقامت الصلوٰۃ" صحیح طریقے پر کی جائے تو مسلمانوں سے زیادہ منظم تو جرمن کی فوج بھی نہ ہو اور جرمن کی فوج پر تو لارڈ نارتھ کلف کے پروپیگنڈے کا جادو چل گیا تھا۔ اس فوج پر جو خدائی فوج داروں کی فوج ہے بھلا کس کا جادو چل سکتا ہے۔ پوری حریت اور پوری آزادی اور پوری جمہوریت سے اس کا امام چنا جائے اور ووٹ یورپ اور امریکہ کی طرح اپنی ذاتی خواہشوں کی پیروی میں نہ دیے جائیں بلکہ اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق۔ لیکن جب اس طرح امام چن لیا جائے اور نسلاً بعد نسلٍ و بطناً بعد بطنٍ نہ رہے تو پھر تو اس وقت تک جب تک کہ وہ حکم الٰہی اور سنت نبوی کی پیروی کرتا رہے اس کا اتباع اس طرح کیا جائے کہ کسی فوج کے جنرل کا بھی کبھی نہ ہوا ہو اور سمعنا و اطعنا کا منظر ایک عالم کو پھر دکھلا دیا جائے۔ اسی طرح روزہ ہے بشرطیکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سا اور آپ کے صحابۂ کرامؓ کا روزہ ہو نہ کہ ہمارا جس کی شان میں غالب نے کیا خوب لکھا ہے کہ ؎

تن پروری خلق فزوں شد ز ریاضت
جز گرمیٔ افطار ندارد رمضاں ہیچ

زکوٰۃ کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ اس کے بعد نہ "چندہ ماموں" کو چندہ مانگنے کی ضرورت پڑے نہ "خواہرزادہ" کو، نہ "رونے والا لیڈر" رو رو کر مفتی محبوب علی شہید کی بیوہ کے لئے دو دو آنے چار چار آنے جمع کرے، نہ جھینپنے والا پیر جھینپ جھینپ کر مسلمانوں کی جیب سے ایک کروڑ ادھنے نکلوا کر اور اپنی سرکار کو پوسٹ کارڈ لکھوا کر اس کے خزانۂ عامرہ میں تین لاکھ ساڑھے بارہ

ہزار و داخل کرائے۔

حج اس سارے نظام کی چوٹی ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ، حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ کی قربانیوں کی یاد کو تازہ کرنا اور جاننا کہ یہ سب ہی سے کی گئی تھیں کہ اسے وادیٔ غیر ذی زرع' میں افضل البشرؐ، افضل الانبیاؐ، سرورِ کونینؐ، باعثِ تکوینِ دو عالم کو پیدا اور مبعوث ہونا تھا اور خیر الامم کے ذریعے سے خدا کا آخری پیغام چار دانگ عالم میں ہر بسنے والے کو سنوانا تھا اور پھر جو اس پیغام کو قبول کر چکے ہیں ان کا آپس میں مشورہ کرنا کہ جنھوں نے اب تک اسے قبول نہیں کیا ہے انھیں کس طرح اس پر آمادہ کیا جائے۔ جو رکاوٹیں وہ اس کام میں ڈال رہے ہیں ان کو کس طرح دور کیا جائے اور خود اپنی اصلاح کس طرح کی جائے یعنی دوسرے اور مختصر الفاظ میں موتمر عالم اسلام کا منعقد کرنا۔ آج اگر یہ ہوا کرے تو پھر کون مسلمانوں کو شکست دے سکتا ہے۔

لیکن یہ توحید کے چار ارکان ہیں۔ پہلا رکنِ دین تو وہ ایمان ہے کہ "ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین ○ فان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ وتلک الایام نداولھا بین الناس ○ ولیعلم اللہ الذین آمنوا ویتخذ منکم شھداء واللہ لا یحب الظلمین ○ ولیمحص اللہ الذین آمنوا ویمحق الکفرین ○"

(اگر مصیبت آپڑی ہے تو سست نہ ہو نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم اللہ پر اعتماد رکھتے ہو۔ اگر تم کو زخم پہنچا ہے تو تمھارے دشمنوں کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے اور یہ دن باری باری ہم لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں اور اس کی غرض یہ ہے کہ اللہ امتحان کرے کہ کون اس پر اعتماد رکھتے ہیں اور یہ کہ تم میں سے شہیدوں کو چن لے کہیں یہ نہ سمجھنا کہ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ ظلم کرنے والے سے کچھ محبت کرتا ہے ہرگز نہیں اس کو ظلم کرنے والوں

ے بالکل محبت نہیں اور ایک غرض یہ بھی ہے کہ اللہ ایمان والوں کو نکھار کے
صاف کر دے اور کافروں کو مٹا دے ۔)

یہ سبق ہم نے قرآن کریم سے حاصل کیا ہے لیکن اس کی تفسیر ہمارے
لے کسی مولوی نے نہیں کی تھی بلکہ زیادہ تر خود اقبال نے کی تھی میں ان
ے پوچھتا ہوں کہ کیا انھیں نے ہمیں نہیں سکھایا تھا کہ ؎

ن بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا — آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

لیکن آج وہ ایمان براہیمی کا نسخہ ہمارے لیے تجویز نہیں کرتے بلکہ خود
نمرود کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہم کو بھی حکم دیتے ہیں کہ اس کو بھی سجدہ کرو گو وہ
سورج کو مشرق کی بجائے مغرب سے نہیں نکال سکتا مگر بھی ربیت اس
ی شان بھی ہے ۔ آج وہ ہماری نجات کو اجانب کے دست کرم میں بتاتے
یں اور ہمیں ان کا دست نگر بناتے ہیں لیکن کیا انھیں نے ہمیں یہ سبق
سکھایا تھا کہ ؎

شنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
ہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے — راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو
انپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا — ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
یکھ آکر کوچۂ چاک گریباں میں کبھی — قیس تو لیلیٰ بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
ے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

پنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
یوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
ینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا — جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

کیا انھیں نے نہیں یہ امید نہ دلائی تھی کہ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز — اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور — خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اگر یہ امیدیں بر نہ آئیں تو بے شک اس میں ہمارا بھی قصور ہوگا مگر کیا ہمارا شاعر ہر قصور سے بالکل بری اور مبرا ہے؟ جی نہیں چاہتا کہ اسے خود اس کا کلام یاد دلایا جائے جس سے اس نظم کی ابتدا ہوئی تھی، مگر جب اقبال جیسا مے گسار بھی "محتاجِ ساقی" ہو جائے تو پھر بظاہر اس کی ضرورت ہے کہ اسے بھی یاد دلایا جائے کہ "شاعر" اور "شمع" میں کیا مکالمہ ہوا تھا۔

شاعر

دوش می گفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانِ خویش — گیسوے تو از پرِ پروانہ دارد شانۂ
در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم — نے نصیبِ محفلے نے قسمتِ کاشانۂ
مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم — در طوافِ شعلہ ام بالے نہ زد پروانۂ
می تپد صد جلوہ در جانِ امل فرسودِ من — بر نمی خیزد ازیں محفل دلِ دیوانۂ

از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی
کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی

کیا آج بھی شاعر کی یہی حالت نہیں ہے تو پھر کیا ہم شمع کے اس جواب کو بھی سچ سمجھیں۔

شمع

مجھ کو جو موجِ نفس دیتی ہے پیغامِ اجل — لب اسی موجِ نفس سے ہے نوا پیرا ترا
میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز — تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا
گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک — شبنم افشاں تو کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا
گل بہ دامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح — ہے ترے امروز سے ناآشنا فردا ترا
یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں — شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا
سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے — انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا
کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بت خانہ ہے — کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا
قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں — تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا
اے دُرِ تابندہ اے پروردۂ آغوشِ موج — لذتِ طوفاں سے ہے ناآشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا برہم ہوا گلشن ترا
بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

شمعِ محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا — تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے
رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو — پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے
شوقِ بے پروا گیا فکرِ فلک پیما گیا — تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے
وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آشامی نہیں — فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے
خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے — اب نہ وہ مے کش رہے باقی نہ مے خانے رہے

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے | کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے
آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں | رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

میں نہیں کہتا کہ ؎

تھا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے | لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے | ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی | پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ | صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا | اب کوئی سودائیِ سوزِ تمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

میں تو آج بھی اقبال اپنے محبوب اقبال سے کہتا ہوں کہ ساقیا تو آتش بجام آکر تو دیکھ کچھ شعلہ آشام اب بھی باقی ہیں، تو بادِ بہاری کا پیام تو بھیج، یہ خزاں دیدہ چمن پھر ایک بار اپنی بہار دکھا دے گا۔ مانا کہ آخرِ شب بسمل کی تڑپ دید کے قابل تھی مگر تو پھر بالائے بام آکر تو دیکھ ابھی تیرے سامنے تڑپنے کے لئے بہت بسمل باقی ہیں، ابھی تک شعلہ نہیں بجھا ہے مگر وہ سودائی کہاں ہے جو سوزِ تمام کا سودائی ہو، پھول ہرگز بے پروا نہیں تو گرمِ نوا تو ہو، یقیناً کارواں گم کردہ راہ ہے اور کارواں والے اس قدر نیند کے ماتے ہیں کہ اس خارزار میں پڑے سو رہے ہیں لیکن آوازِ درا بھی تو آج کسی کو سنائی نہیں پڑتی۔ کیا تو نے ہی ہمیں حالی کا یہ شعر یاد نہیں دلایا تھا کہ ؎

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی — حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

کیا آج بھی رومی کی تربت سے یہی صدا نکل رہی ہے کہ
"شکوۂ اہل جہاں کم گو"

بس یا تو خاموش رہ یا پھر دہی راگ الاپ جس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ۱۹۳۷ء تک دیپک کا کام دیا تھا اور ہر قلب میں ایک آگ سی لگا دی تھی مگر شرط خونریزی اپنی مقرر کردہ ہے ؎

شعلہ ہی کے پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو — خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

تعجب ہے کہ آج تو بھی لالہ جی کے خوف سے اوگوی صاحب کی گود میں گھسا جاتا ہے کیا تو بھی وہ اقبال نہیں جس نے ہم کو بتایا تھا کہ ؎

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر — از نبیؐ تعلیم لاتحزن بگیر

قوتِ ایماں حیات افزایدت — وردِ لاخوف علیہم بایدت

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود — قلبِ او از لاتخف محکم بود

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است — کاروانِ زندگی را رہزن است

بیم چوں بجلاست اندر پائے ما — ورنہ صد سیل است در دریائے ما

ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

تو نڈر ہو کر مسلمانوں کو پھر بیدار کر اور مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ ہندوؤں کو بھی جو ہم سے بھی زیادہ خوف زدہ ہیں۔ فقط مسلم لیگ ہی کو نہ جگا بلکہ کانگریس کو بھی ہوشیار کر ؏
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

زعمائے مصر کا تعارف

(۱) تعارف

ہمدرد ۲۶ نومبر ۱۹۴۶ء

شیخ عبدالعزیز شاویش کسی تعارف کے محتاج نہیں. شاید آج عالم اسلام میں ان سے بہتر نظام اسلام کی حقیقت اور ضرورت کا جاننے والا کوئی نہیں ہوگا. اسی حقیقت کو جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے پہچانا تھا اور عین اس وقت جبکہ اسلامی سلطنتوں کی طرف یورپ کا دست حرص دراز بڑھ رہا تھا انھوں نے مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا مگر افسوس کہ مسلمان پوری طرح نہ چونکے اور اُدھر افریقہ میں مصر و تونس، طرابلس و مراقش یکے بعد دیگرے دشمنان اسلام کے قبضے میں آگئے اور ادھر ایشیا میں بھی ترکی اور ایران کی سلطنتوں میں کمزوری تیزی پکڑتی گئی، یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ایک بار پھر مسلمان چونکے مگر اب یورپ کی سیاسی سمیت اپنا پورا اثر کر چکی تھی اور معمولی دواؤں سے مریض عالم اسلام کی صحت یابی ممکن نہ تھی. پھر بھی اسلامی ممالک میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی جنھوں نے مریض کے علاج میں سعی و کوشش شروع کی. ترکی میں یہ جماعت "حزب اتحاد و ترقی" تھی اور گو اس کے بعد بھی بہت سے افراد اسلام کی اصل حقیقت سے پوری طرح آشنا نہ تھے لیکن اس کے بہترین افراد کو شیخ عبدالعزیز شاویش جیسا اصلاح کار اور مشیر مل گیا تھا جس کی حقیقت اسلام سے واقفیت اور مرض عالم اسلام کی تشخیص اور تجویز علاج سے مسلمانوں کو امید امید ہو چلی تھی کہ مریض انشاء اللہ جلد شفا پائے گا مگر افسوس کہ "مریض یورپ" یعنی ترکی کے وارثان غیر حقیقی اس کی موت کی گھڑیاں گن رہے تھے وہ کب

طبیبوں کو علاج کی فرصت دے سکتے تھے۔ گذشتہ جنگ نے مریض کا خاتمہ ہی کر دیا تھا مگر خداوند کریم کو یہ منظور نہ تھا۔ ترکی کی ابھی زندگی تھی۔ مریض نے سنبھالا لیا اور جیسا کہ میرا ایک شعر ہے ؎

بصد حرماں اٹھے بالیں سے سب خواہان روئے
جسے وہ نیم جاں سمجھے تھے اس کو سخت جاں پایا

ترکی میں روزمادی ترقی ہو رہی ہے اور ارباب حکومت اپنے ایثار و محنت، خلوص و حب الوطن کے لئے مستحق صد تحسین و ہزار امداد ہیں مگر ترکی کو آج عبدالعزیز شادیش جیسے مصلح کار اور مشیر کی سخت ضرورت ہے۔ آپ ہر کامیابی اور کامرانی کے مستحق تھے مگر مشکل ہی سے کوئی ناکامی و نامرادی ہوگی جو شومی طالع سے آپ کو نصیب نہ ہوئی۔ ترکی میں بظاہر آج کوئی انور پاشا نہیں جو دین و دنیا دونوں کی نگہداشت کرے۔ گو یہ سچ ہے کہ مصطفےٰ کمال پاشا اور حکومت کے خلاف جو پروپگنڈا آج رو ائٹر اور انگریزی جرائد کے ذریعے سے ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمانوں میں کیا جا رہا ہے اس پر کوئی ذی عقل اور صاحب فہم و ادراک مطلق اعتماد نہیں کر سکتا۔ آج ترکی میں نہ شیخ شادیش کی پہلی سی قدر ہے نہ خود مصر میں جہاں وہ پھر قیام فرما رہے ہیں، نہ مصطفےٰ کامل پاشا مرحوم کی قائم کردہ حزب الوطنی کی اگلی سی حالت ہے کہ وہی شیخ موصوف کی کما حقہٗ قدر کرے۔ ہر طرح کے مصائب برداشت کر کے، اپنی تمام امیدوں کا اپنی آنکھوں کے سامنے خون دیکھ کر آج وہ ایک گوشہ نشین زاہد و عابد کی طرح ہیں۔ مصر کے محکمہ تعلیمات میں آپ نے ایک عہدہ قبول فرمایا ہے اور مصر کے نوجوانوں کی تعلیم میں مشغول ہیں۔ مگر اس دورِ حکومت میں کون کہہ سکتا ہے کہ آپ مصر کی تعلیمی پالیسی پر کوئی اثر بھی ڈال سکیں گے یا نہیں۔ اگر آپ ایسا

کریگے تو یقیناً آپ کا موجودہ شغل گوشہ نشینی کے مترادف ہوگا لیکن جب تک اس کے
متعلق ہمیں اطمینان نہ ہو کہ انور پاشا اور طلعت پاشا، سعید حلیم پاشا اور
جمال پاشا رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے اس مشیر کے موجودہ شغل کو گوشہ نشینی ہی
کہیں گے تاہم ہمیں امید ہے کہ شیخ عبد العزیز شاویش کی زندگی کا یہ دور آخر
نہیں ہے بلکہ کامرانی و کامیابی آپ کی منتظر ہے اور انشاء اللہ العزیز آپ کی
امیدیں پوری ہوں گی اور آپ کی آرزوئیں برآئیں گی۔ میرا ایک شعر ہے ؎

تماوہ مبتلا ناکام سمجھا جس کو دنیا نے

اسی کو سرخرو دیکھا اسی کو کامراں پایا

ڈاکٹر عبد الحمید سعید بے

آپ مصر کے ایک متمول زمیندار سعید پاشا کے صاحبزادے ہیں اور مصر
کے مولانا شوکت علی ہیں۔ ماشاء اللہ آپ کا تن و توش ایسا ہے کہ دشمنان مصر و
اسلام آپ کو دیکھ کر اگر لرزہ براندام ہو جائیں تو محل استعجاب نہیں۔ آپ کا
دلی جوش و خروش آپ کی تقریر اور آپ کے تمام حرکات و سکنات سے صاف
پایا جاتا ہے۔ اگر آپ کی اس تصویر کو جو آپ نے عربی لباس میں کھنچوائی ہے اور
جو راقم الحروف کے پاس ہے کوئی دیکھے تو یقیناً یہی خیال ہوگا کہ یہ کوئی
بدوی ہے اور کسی قبیلے کا سردار ہے اور اگر اس سے کہا جائے کہ آپ پیرس
کی قدیم اور مشہور ترین یونیورسٹی ساربون کے ڈاکٹر آف لاز ہیں تو اس کی حیرت
و استعجاب کی انتہا نہ ہوگی۔ آپ گذشتہ جنگ عظیم میں جمال پاشا مرحوم کی فوج
کے پولیٹیکل افسر تھے اور ان عربوں میں سے ہیں جنھوں نے کبھی ترکوں کا ساتھ
نہیں چھوڑا۔ آج مصر میں حزب الوطنی میں بہت کم لوگ شریک ہیں اور
سعد پاشا زاغلول کی سحر کلامی نے جو گویا مصر کی "سوراج پارٹی" کے لیڈر

میں لوگوں کو ان "نو جینیز" سے توڑ کر اپنے بظاہر زیادہ دلچسپ مگر کم صبر آزما سیاسی کشمکش کی طرف کھینچ لیا ہے مگر پھر بھی ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے کا باوجود ان کی پارٹی کی قلت تعداد کے ملک میں بڑا اثر ہے اور ہمیں امید رکھنا چاہئے کہ بہت جلد وہ زمانہ آئے گا کہ پوری مصری قوم ان کے ساتھ ہوگی اور کامل آزادی حاصل کریگی۔

ڈاکٹر احمد فواد بے

حزب الوطنی کے ایک سرگرم رکن ہیں اور ان محبان وطن میں سے ہیں جن کی زندگی ملک اور اسلام کے لئے وقف ہے اور اکثر معرض خطر میں رہی ہے۔ جب سر ایلڈن گورسٹ نے جو لارڈ کرومر کے بعد مصر میں برطانیہ کے ایجنٹ مقرر ہوئے تھے، ایک طرف تو سابق خدیو مصر کے ساتھ اظہار دوستی کر کے ان کو حزب الوطنی کے خلاف آمادہ کیا اور دوسری طرف ۹۵ فی صدی مسلمانوں کے خلاف ۵ فی صدی قبطیوں کو ابھارا اور اسی سلسلے میں قبطی وزیر اعظم غالی پطرس پاشا کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا تو مصر کا خفیہ پولیس ناکردہ گناہ ڈاکٹر احمد فواد کی آزادی بلکہ زندگی کے درپے ہوگیا تھا اور آپ کو مہینوں تہ خانوں میں چھپ چھپ کر زندگی بسر کرنا پڑی تھی۔ جب ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد جنگ بلقان میں ترکی گیا تو ترکی ہلال احمر نے ڈاکٹر احمد فواد کو مددگار اور مترجم کی حیثیت سے وفد کے ساتھ کر دیا تھا۔ آپ کا خلوص اور جوش ہر مسلمان اور مشرقی کے لئے قابل تقلید ہیں۔ پہلے آپ پر بھی وطنیت کا جادو سوار تھا مگر بحمداللہ آج وطن اور اسلام دونوں کے لئے آپ کے دل میں جگہ موجود ہے اور آپ کی خداترسی اور وطن پروری نے اسلامی شریعت اور سیاسی طریقت کے ڈانڈے ملا دئے ہیں۔

سید عبدالکریم رفاعی

حیدر آباد کے متوطن ہیں اور مصر میں تعلیم پا رہے ہیں۔

ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری

ڈاکٹر انصاری ہیں جن کا تعارف کرانا سخت توہین ہوگی۔

لہ ڈاکٹر انصاری صاحب ایک دفعہ یورپ جاتے ہوئے مصر اترے تھے۔ مذکورہ ذکر زعمائے مصر کے ساتھ موصوف کی ایک تصویر ہمدرد میں شائع ہوئی تھی۔ یہ مضمون اسی تصویر کا "تعارف" ہے۔ (مرتب)